بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ
الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ

پڑھ کہ تیرا رب بڑا کریم ہے، جس
نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔

(سورہ اقرا)

کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی

مجلہ —— سرسید ین
ترتیب —— رشید امجد - سید فاروق علی
سرورق —— حمید ساغر
ناشر —— ایم ۔ ایچ ۔ ہمدانی
مطبع —— مارگلہ پرنٹرز ۔ چوک بنی ۔ راولپنڈی
تعداد —— بارہ سو پچاس
اشاعت —— اول ۔ مارچ ۱۹۸۰ء
قیمت —— تیس روپے - 45/-
مجلد پینتالیس روپے ،

آئینہ

و

ز

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ

عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ ؕ

ہر مسلمان مرد اور عورت

پر علم حاصل کرنا فرض ہے

(حدیث قدسی)

ابتدائیہ

علم کا پہلا دروازہ خدا نے آدم پر اس وقت وا کیا۔ جب اس نے آدم کو اشیا کے نام سکھائے، پھر شیطان آدم کو شجر ممنوعہ کے پاس لے گیا اور تجسس کی کونپل نے آدم کے دل میں آنکھ کھولی، آدم کے عروج و زوال کی داستان آگاہی اور شعور کے ساتھ ساتھ ہی پھیلی، رنگین ہوئی۔ زمین پر آدم نے پہلی بار دکھ اور مصیبت کا ذائقہ چکھا، لیکن اسی دکھ نے اسے نئے جہانوں، نئے ذائقوں اور نئے لمسوں سے آشنا بھی کیا، آدم کی ابتلاء کا یہ سفر اس کی آگاہی کے وہ زینے ہیں۔ جن سے گزر کر نسل آدم آج شعور کی بلندیوں پر پہنچی ہے۔

نت نئے تجربوں نے آدمی کے اندر زندہ رہنے کا احساس بیدار کیا اور اسے اپنی صلاحیتوں سے آگاہ ہونے کی راہ پر ڈالا۔ جنت سے نکل کر زمین پر رہنے کے چیلنج کو اس نے نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنے جہان کی بنیاد بھی ڈالی۔ اپنی دانش کے لئے اس نے آسمانوں سے رہنمائی اور اپنے تجربات اور فطرت کے مطالعہ کے نتیجے میں نئے نظریات

نئے علوم تک رسائی حاصل کی۔ قدیم دیوتا دانائی کے معاملہ میں ہمیشہ بخیل رہے ہیں۔ انہوں نے کبھی خوشی سے آدمی کو اپنی دانائی میں شریک نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس اسے حقیر جان کر مصیبتوں میں مبتلا کر دینا ان کے نزدیک ایک تفریح رہی ہے۔ سومیری دیوتا ان لل ہو یا مصری پتاح یا یونانی زیوس سبھی آدمی کے بارے میں ایک سا مخاصمتی رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔ پرومیتھس پہلا دیوتا ہے جو آسمانی آگ چرا کر آدمی کو شعور ودیعت کرتا ہے۔ پرومیتھس کو اس جرم کی خوفناک سزا بھگتنا پڑی۔ زیوس نے اسے چٹان سے باندھ کر ایک باز کو حکم دیا کہ وہ اس کا جگر چباتے اور یہ منظر ہر روز نئے سرے سے دہرایا جائے تاکہ کسی اور دیوتا کو آدمی پر مہربانی کا خیال نہ آئے۔ پرومیتھس کی اس آگ نے آدمی کو جاننے پہچاننے کی نئی راہوں سے آشنا کیا۔ سو پرومیتھس آدمی کا پہلا باقاعدہ استاد ہے۔ جس نے خود سزا کا دکھ اٹھا کر آدمی کو شعور اور علم کا گیان عطا کیا۔

اشاروں کنایوں سے تصویری زبان اور تصویر سے تحریر تک آنے میں انسانی شعور نے کتنی ہی کروٹیں لی ہیں اور بے شمار گونگے زمانے دائرہ در دائرہ اس ترقی کی بنیاد بنے ہیں۔ علم کی تاریخ میں سب سے اہم مرحلہ فن تحریر کی ایجاد اور کتاب کی اہمیت کا احساس ہے۔ تحریر کا فن ایرک سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ سومیر کے دوسرے شہروں میں پھیلتا چلا گیا۔ تحریر کے فن کے ساتھ ہی کتاب اور اہل قلم کی اہمیت کا احساس بھی پیدا ہوتا گیا بعد میں تحریر کا یہ فن دجلہ و فرات کی وادی سے نکل کر مصریوں اور فونیقیوں تک آ پہنچا۔ بارھویں صدی قبل مسیح کی ایک مصری تحریر سے کتاب اور اہل قلم کے بارے میں ان تاثرات کا اظہار ملتا ہے۔

"اگر تم میری ہدایتوں پر عمل کرو گے تو صاحب ہنر محمد رین جاؤ گے۔ وہ اہل قلم جو دیوتاؤں کے بعد پیدا ہوئے۔ آئندہ کی باتیں بتا دیتے تھے۔ گو وہ اب موجود نہیں، لیکن ان کے نام

[illegible] ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انہوں نے اپنے لئے [illegible] بنائے نہ اس قابل ہوئے کہ اپنی اولاد کے لئے دولت [illegible] جاتے، لیکن ان کی دولت ان کی تحریریں تھیں۔ "یاد رکھو کتاب عالی شان مقبرے سے زیادہ اثر رکھتی ہے"

کتاب اور اہل قلم کی اہمیت نے استاد کا تصور پیدا کیا۔ ابتداء میں یہ استاد خود دیوتا ہوتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ دیوتاؤں کی یہ خوبی بعض انسانوں میں بھی منتقل ہونے لگی اور سیکھنے سکھانے کا سلسلہ بالمشافہ مکمل ہونے لگا۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ انسان کی سب سے بڑی اور اولین استاد فطرت ہے اور انسان کا تمام علم اور شعور فطرت سے حاصل ہوئے تجربات و مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ اس حوالے سے پتھر کے دور کا آدمی بھی سیکھنے کے اس عمل سے گزرا ہوگا اور اس کی تعلیم کا سلسلہ بھی [illegible] ہوگا۔ لیکن شعور کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ تعلیم ایک علم کے طور پر اپنے مفاہیم اور مقاصد میں واضح ہوتی چلی گئی۔ تمدنی روایات کے ساتھ ہی استاد کے باقاعدہ تصور نے بھی جنم لیا اور استاد شاگرد کا رشتہ وجود میں آیا۔ لیکن یہ استاد پیشہ ور قسم کے نہ تھے، نہ تدریس کا کوئی باقاعدہ معیار مقرر تھا۔ بلکہ بزرگوں کے اقوال و افعال اور مقدس روایتیں ہی استاد اور تدریس کا درجہ رکھتی تھیں۔ تہذیبوں کے عروج کے بعد خصوصاً نینوا، بابل، مصر، ہندوستان، یونان اور چین میں تعلیم کے حصول کی تاریخ شروع ہوئی۔

مصر میں فراعین نے مملکت کو انتظامی لحاظ سے مضبوط بنانے کے لئے اعلیٰ طبقے کی تعلیم کا نظام قائم کیا۔ ریاضی، نجوم، جغرافیہ اور طب کی تدریس شروع ہوئی۔ لیکن عوام کی حیثیت چونکہ غلاموں سے زیادہ نہ تھی اس لئے یہ تدریس ثقافت تہذیب اور روحانی مسائل کے اظہار کی کوششوں سے زیادہ اور کچھ نہ تھی تاہم "کتاب عالی شان مقبرے سے زیادہ اثر رکھتی ہے" کا تصور مصر میں کتاب اور اہل قلم کی

اہمیت کا احساس دلاتا ہے -

یونان میں مصر کی نسبت تدریس کی حیثیت قدرے باضابطہ رہی۔ یونانی طریقہ کار میں سوال جواب کو بنیادی مقام حاصل تھا۔ استاد شاگرد مل کر بحث میں حصہ لیتے ہومر کو یونانی فلسفہ اور فکر کے اولین معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی رائے میں بنی نوع انسان کا اولین معلم شاعر ہے۔ وہ اخلاقی تعلیم کو فوقیت دیتا ہے - ہومر کا معلم ایک جہاندیدہ بزرگ ہے جو ہر میدان میں نوجوانوں کی عملی رہبری کرتا ہے۔ تعلیم کے علاوہ اس کے ذمہ نوجوانوں کو مثالی کردار کا مالک بنانا بھی شامل ہے۔ اس کے برعکس سپارٹا کی تعلیم میں عملی پہلو نمایاں ہے۔ سپارٹا کی تعلیم میں دو بنیادی نکتے ہیں - اول فوجی قوت کا دبدبہ، دوم مملکت کی حفاظت کا تصور۔ فوجی تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ سپارٹا میں سات سال سے اٹھارہ سال تک کے بچوں کو باقاعدہ فوجی تربیت دی جاتی تھی، جسمانی مشقت کشتی رانی، لڑائی اور کھیلوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ بچوں کو جنگی ترانوں کے ساتھ ساتھ جنگی قوانین بھی رٹائے جاتے تھے۔ اس جنونی رویے نے اس خیال کو جنم دیا کہ جینے کا حق صرف صحت مند اور طاقت ور لوگوں کو ہے۔ ایتھنز میں اس کے برعکس تعلیم نئے افق کی تلاش، انسان اور کائنات کے رشتوں کی دریافت کا ایک وسیلہ تھی۔ پانچویں صدی کے نصف تک ایتھنز کو یونانی سلطنت میں مرکزیت حاصل ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں فلسفیوں نے نئے عقائد اور نئے رویوں کی نشاندہی سے علم کے نئے دروازے کھول دیئے۔ سوفسطوں کے تعلیمی لیکچروں نے علم استدلال کو عام کیا۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو نے علم کے نئے نئے پہلو تلاش کئے اور مباحث کے نئے سلسلے شروع ہوئے۔ ان فلسفیوں کے افکار نے بعد میں طویل عرصہ تک مشرق و مغرب کے تمام فکری دبستانوں پہ گہرے اثرات مرتب کئے رکھے

سقراط علم کو کسی کی میراث نہیں مانتا۔ اس کی رائے میں ہر شخص کو عقل اس لئے عطا کی گئی ہے کہ وہ ہر معاملہ کی حقیقت تک پہنچے۔ حقیقت کی اس رسائی کے لئے وہ بحث کو لازمی خیال کرتا ہے۔ افلاطون سقراط کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے معاشرے میں تعلیم کو لازمی سمجھتا ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر مملکت کے استحکام کے لئے علم کو بنیادی شے قرار دیتا اور علم کو زندگی کا سرچشمہ مانتا ہے۔ ارسطو نے فکر کے اسی سلسلہ کو زیادہ بہتر طور پر مربوط کیا۔ اس نے تعلیمی مدارج مرتب کئے اور اسے پانچ بڑے حصوں میں تقسیم کیا۔

رومن عہد میں دو نام قابل ذکر ہیں۔ ایک سسرو دوسرا کوئنٹلین۔ سسرو بنیادی طور پر سیاست دان تھا۔ مگر تعلیمی امور میں اس کی دلچسپی نمایاں تھی۔ اس کی رائے میں اعلیٰ کردار کی بنیاد ہی تعلیم ہے۔ اس نے تعلیم کا اخلاقی پروگرام مرتب کیا اور اس کا ابتدائی زینہ گھر بتایا۔ وہ تعلیم یافتہ شخص کے لئے انسانی ہمدردی کو بنیادی شرط قرار دیتا ہے۔ کوئنٹلین خود معلم تھا۔ اس نے تصوراتی اور خیالی نظریات کی بجائے تعلیم کے عملی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔ وہ تعلیم میں انفرادیت کو اہمیت دیتا ہے اور استاد کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ الگ الگ قابلیت کو مدنظر رکھے۔ اس لئے وہ ایک متفقہ نصاب کی بجائے علیحدہ علیحدہ تدریسی معیار مقرر کرتا ہے۔

اسلام ان سب سے آگے جا کر تعلیم کو ہر شخص کے لئے فرض قرار دیتا ہے اور ان تمام علوم کے سیکھنے کی تلقین کرتا ہے جو معاشی اور روحانی سطحوں پر اصلاح احوال کرتے ہیں۔ رسول کریم کی ذاتِ اقدس نے نہ صرف عرب دنیا میں پھیلی جہالت کی تاریکی کو دور کیا بلکہ پوری انسانیت کو علم کی نئی اور توانا روشنی عطا کی۔

اسلامی عروج کے اس دور میں یورپ ابھی تاریک عہد میں سانس لے رہا تھا۔ رومی زوال کے بعد علم اور اساتذہ یورپ میں پھیلے تو علم کی روشنی سے نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ سائنٹیفک نظر کا آغاز علم میں ایک نئے افق کی بنیاد بنا۔

یورپ کے تاریک زمانے میں اسپین میں ابن عربی، ابن رشد اور ابن خلدون جیسے بڑے عالم اور فلسفی موجود تھے۔ سولہویں صدی یورپ میں علم کے پھیلاؤ کی صدی ہے۔ برصغیر میں اس وقت مغل دور تھا۔ اکبر کے عہد میں اس کے درباری نورتن اور دربار سے باہر حضرت مجدد الف ثانی اپنی اپنی سطح پر علم کی ترویج میں مصروف تھے۔

بیسویں صدی جہاں انکشافات اور علمی پھیلاؤ کی صدی ہے وہاں سامراجی ہزیمت اور نوآبادیاتی ٹوٹ پھوٹ کی صدی بھی ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں مارکس اور اینگلز جیسے عظیم مفکر نئے علمی اور سماجی معیار تلاش کر رہے تھے۔ ان مفکرین کے افکار نے نوآبادیاتی نظام اور طبقاتی غلامی کو کاری ضربیں لگائیں اور علم کے نئے افق کی نشاندہی کی۔ انہوں نے علم کو عام آدمی کی سطح تک پھیلایا اور عام آدمی کی قابلیت کا اعتراف کیا۔ بیسویں صدی میں لینن، ماؤزے تنگ، سارتر اور فرائڈ وغیرہ کے افکار نے علمی دنیا میں خیال انگیز اضافے کئے۔

برصغیر کی علمی تاریخ بھی وسیع پس منظر پر پھیلی ہوئی ہے۔ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیبی اور علمی روایت میں دراوڑی مزاج کی ساری پرتیں موجود ہیں۔ آریاؤں کی آمد نے اس مزاج کو نئے ذائقہ اور نظریات سے ہم آہنگ کیا۔ مقدس وید دو بڑی روایتوں اور دو مختلف مزاجوں کے سنگم پر جنم لیتے ہیں۔ ان کا تصور کائنات اخلاقی ضابطے، معاشرتی اصول اور طبقاتی عصبیت نے ہندوازم کو ایک سخت گیر طرز حیات کے طور پر مسلط کر دیا جس نے برصغیر کی عام زندگی پر ایک جمود کی کیفیت طاری کر دی۔ مہابھارت اور رامائن اپنے فلسفیانہ اور دیومالائی رشتوں کے باوجود اس طبقاتی تفاخر کی گواہی دیتی ہیں۔

مہابھارت کی جنگ کا ہیرو ارجن جب دوست دشمن کی پہچان میں ناکام ہو کر دھنش پھینک دیتا ہے تو کرشن اسے سچائی کا راستہ دکھاتا ہے، کرشن وشنو کا

اقتدار ہے۔ لیکن درحقیقت وہ اپنے عصر کی سچائی اور علم ہے۔ بربائی، جبر اور تشدد کے خلاف اس کا کردار جہاں ایک جنگی ہیرو کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ وہاں ایک عظیم استاد کے روپ میں بھی سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے اپدیشوں سے ارجن کو نئی شکتی دیتا ہے اور اسے تحلیل نفسی کے ایک عمل سے گزار کر اس کی شخصیت کی تعمیر نو کرتا ہے۔ بھگوت گیتا کے سارے اپدیش جہد للبقار اور بقائے اصلح کے

فلسفیانہ پہلوؤں کے ساتھ ساتھ عصری اخلاق سے بھی بحث کرتے ہیں اور ساتھ ہی کرشن کے جادوئی انداز بیان کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ گوپیوں کا مکھن چراتا اور رادھا کے ساتھ محبت کے گیت گاتا کرشن استاد کے روپ میں بالکل ہی مختلف ہو جاتا ہے۔ اس کی گفتگو میں ایک دم فلسفیانہ رنگ اور دانائی جھلکنے لگتی ہے۔ کرشن آریا دانش و تجربے کی علامت ہے۔ آریائی پدری نظام حیات یعنی آسمانی برتری کے قائل تھے۔ کرشن ارجن کے من میں آریائی روایتوں کے تقدس کا احساس پیدا کرتا ہے۔ رادھا زمینی اور علاقائی دانائی اور علم کا استعارہ ہے زمینی اور آسمانی دانائی وعلم کے سنگم پر بڑی تہذیب وجود میں آتی ہے۔ مہابھارت کی جنگ اس امتزاج کی عملی اور کرشن کے اپدیش علمی تصویر پیش کرتے ہیں۔ کرشن کا کالا رنگ اور رادھا کا گورا رنگ آسمان اور زمین، ان کا اختلاط، آسمان و زمین یعنی پدری نظام حیات اور مادری نظام حیات کا ملاپ ہے جو دراصل آریائی اور دراوڑی تہذیبوں کا سنگم ہے۔ رادھا اور کرشن کا یہی روپ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہیر اور رانجھا کی شکل میں نمودار ہوا۔

مہابھارت اور رامائن کے علاوہ بھگوت گیتا (جو مہابھارت ہی کا حصہ ہے) اپنشد اور پران بھی اپنی عصری آگاہی اور علمی بصیرت کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ دیومالائی علم کی یوں تو کئی توجیہات پیش کی جا سکتی ہیں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ دیومالائی داستانیں اپنے عہد کی لوک دانائی کا علامتی اظہار ہیں۔

برصغیر میں ہڑپہ، ٹیکسلا، اجودھیا، شاردا اور متھرا کے علاوہ بھی بہت
چھوٹے چھوٹے علاقے علم کی ترویج کے مرکز رہے ہیں۔ علم کی یہ روایت اجنتا الیورا
سے ہوتی ہوئی چھوٹی سمادھیوں اور مندروں تک پھیل گئی۔ گوتم بدھ نے ہندو ازم
پر کاری ضرب لگائی۔ بدھ عبادت گاہیں علم و دانش کے گہوارے ہیں۔ جہاں دور دراز
سے لوگ سفر کی صعوبتیں سہہ کر علم حاصل کرنے آتے تھے۔ بادشاہوں میں اشوک اعظم
نے بدھ دانش کو پھیلانے میں شاندار خدمات سرانجام دیں۔ گوتم کی شکل میں برصغیر کو ایک

عظیم معلم ملا جس نے اپنے فلسفہ سے دکھی انسانیت کو شانتی کی راہ دکھائی اور
طبقاتی عصبیت کو پاش پاش کر دیا۔ گوتم کے بعد ہندو برہمنوں نے پھر معاشرے پر
اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش شروع کر دی اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔
مسلمانوں کی آمد نے برصغیر میں ایک بار پھر تبدیلی کی راہ کھولی۔ مغلوں میں اکبر

جہانگیر، شاہ جہاں بھی علم دوست تھے۔ دارا شکوہ عربی
فارسی کے علاوہ سنسکرت کا بھی عالم تھا۔ مغلوں میں سے کوئی بھی اس کے پلے کے
کا صاحب علم اور روشن خیال نہ تھا۔
برصغیر میں اسلام کے پھیلاؤ نے ایک نیا علمی منظر پیدا کیا۔ اس علمی منظر کو پھیلانے
میں صوفیائے کرام نے بنیادی کردار ادا کیا۔ علم کی یہ روایت حضرت داتا گنج بخشؒ
سے ہوتی ہوئی صوفیاء کے ایک بڑے سلسلہ کے توسط سے عوامی سطح تک پہنچی۔
صوفیا نے اپنے رویے اور روحانی مکاشفات کو عوامی بہبود کے لئے اور دکھی انسانیت
کو سکون دینے کے لئے استعمال کیا۔ برصغیر میں صوفیاء کا سلسلہ ایک بہت بڑے
ادارے کے طور پر کام کرتا رہا ہے۔ اس سلسلہ کی دوسری پشت میں روایت کا یہ
تسلسل شاہ ولی اللہؒ سے ہوتا ہوا سرسید اور سرسید سے اقبال تک پہنچا۔
اور برصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سفر شروع ہوا۔

تعلیم کے یہ مختلف مراحل جہاں تعلیم کی تاریخ مدون کرتے ہیں وہاں علمی
تصورات کا ہی کی منازل کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ سر سید ین کی اس خصوصی
اشاعت میں ان مختلف منازل میں سے صرف مسلم فکر اور عمل کو اہمیت دی گئی ہے
اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس میدان میں دیگر قوموں کی حصہ داری کو دانستہ
نظر انداز کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ صرف محدود ضخامت اور محدود وسائل ہیں۔

فلسفہ اور تعلیم

فلسفہ کو علوم فنون کی ماں ہونے کا فخر حاصل ہے مگر اس کے باوجود فلسفہ نہ تو ایک منضبط قسم کا علم ہے اور نہ محض حقائق کو یک جا کرنے کا نام بلکہ اس کے برعکس بقول فینکس "فلسفہ حاصل کردہ علم اور تجربات کو دیکھنے اور جانچنے کے انداز کا نام" جس کے بنیادی لوازمات میں ایسی چیزوں اور تجربات کی تنظیم، وضاحت، تصریح اور تنقید شامل ہیں۔ جو پہلے ہی ہمارے علم میں آچکی ہوں۔ ایک فلسفی فلسفیانہ مسائل کے لئے مواد مذہب، ادب، سائنس اور فنون سے حاصل کرتا ہے اور ان کے حل کے لئے خاص قسم کے سوالات و جوابات سے مدد حاصل کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں فلسفہ کی وسعت انسانی تجربات اور کائنات کی تمام چیزوں کو احاطہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نظام کائنات کی کوئی چیز خواہ وہ جاندار ہے یا بے جان، حاضر ہے یا غائب، مادی ہے یا روحانی، فطری ہے یا مافوق الفطرت فلسفہ کے احاطہ کار سے خارج نہیں ہے۔ یہ فلسفے کا عمومی پہلو ہے۔ اس کا مخصوص پہلو اس کے مقاصد اور طریق کار میں مضمر ہے۔

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ انسان فطری طور پر چند بنیادی خواہشات کا حامل ہے۔

جن کی تکمیل و تسکین کے لئے وہ طبعی طور پر بے قرار رہتا ہے۔ فلسفہ انسان کی ان خواہشات کی تسکین کے لئے مواد مہیا کرتا ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فلسفہ کی انسانی زندگی میں اہمیت سے متعلق ان خواہشات کا ذکر کر دیا جائے۔ فلسفیانہ انداز فکر کی رو سے، اہم ترین خواہشات انسانی ذیل میں مذکور ہیں۔

۱۔ تجسس کا جذبہ ۲۔ علامات سے دلچسپی

۳۔ معانی کی تلاش ۴۔ کل کا جائزہ لینے کا شوق

۵۔ مسائل کا حل تلاش کرنے کا اشتیاق ۶۔ بلند ہمتی کا جذبہ

بیشتر اس کے کہ تعلیم میں فلسفہ کی ضرورت و اہمیت کے تحت خیالات کا اظہار کیا جائے۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے مفہوم سے متعلق مفکرین کے نظریات پیش کر دیئے جائیں۔

جان لاک کے نزدیک ایک صحت مند جسم کی پرورش اور نشو و نما تعلیم کا اہم مقصد ہے۔

مارٹن لوتھر تعلیم کا مقصد یہ لیتے ہیں کہ انسان کو حکومت اور خدا کی بے لاگ خدمت کے لئے تیار کیا جائے۔ اسے گھریلو فرائض اور اپنے پیشے کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی تلقین کی جائے۔

جان کرینیس کہتے ہیں کہ تعلیم انسان کی مجموعی نشو و نما کا نام ہے۔ انسانی زندگی کا اعلیٰ مقصد اللہ تعالیٰ سے مل کر مسرت و شادمانی سے ہمکنار ہونا ہے۔

افلاطون کا خیال ہے کہ جسم اور روح سے متعلق تمام مبہم نظریات کی توضیح و تفہیم کا نام تعلیم ہے۔

سقراط کے نزدیک تعلیم کا مقصد باطل کی نفی کرنا اور حق و صداقت کی تصدیق کرنا ہے۔

ارسطو کہتا ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد مکمل حق و صداقت اور نیکی کے ذریعے خوشی

حاصل کرنا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک علم تمام اشیاء پر عقلی اور ذہنی برتری حاصل کرنے کا نام ہے

تعلیم اور مقاصد تعلیم سے متعلق مندرجہ بالا نظریات قائم کرنے کے پس منظر میں فلسفہ سے تعلیم کا گہرا ربط ہے۔ بالفاظ دیگر تعلیم کو فلسفیانہ انداز فکر سے دیکھا گیا ہے۔ علماء کے ان خیالات سے یہ بات اور بھی زیادہ صراحت سے سامنے آتی ہے کہ اگر فلسفہ سے انسانی زندگی کی پریشانی کا حل اور نظریاتی انداز کے اپنانے کا کوئی ٹھوس پروگرام معرض وجود میں نہیں آتا تو سمجھ لیجئے کہ یہ اس کا صحیح استعمال نہیں بلکہ محض ذہنی عیاشی ہے۔

تاریخ فلسفہ شاہد ہے کہ جب کبھی لوگوں نے فلسفیانہ بحث کی تکنیکی اہمیت کے بعد کسی اور مسئلے کے عمیق مطالعہ کی خواہش کی تو انہوں نے ہمیشہ تعلیم ہی کے مسئلے کو اس غرض کے لئے منتخب کیا۔ درحقیقت تعلیم اس مقصد کے لئے نہایت موزوں مقام رکھتی ہے۔ بلکہ جان ڈیوی کے نزدیک تو فلسفہ کا تمام تر عمل تعلیم ہی کے نظریات سے تکمیل پا جاتا ہے۔ روس میں اشتراکی نظریات کو پھیلانے کے لئے بچوں اور جوانوں کو کارل مارکس کے اصولوں کی تعلیم دی گئی ہے۔

جب کبھی حکماء حصول مقاصد کے لئے کوئی تعلیمی پروگرام پیش کرنے میں ناکام رہے تو ان کے بعد آنے والوں نے دیکھ لیا اور سمجھ لیا کہ فلسفہ اور تعلیم میں ربط اور مطابقت کی کمی اس ناکامی کی اصل وجہ تھی۔ تعلیم اور فلسفہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چنانچہ یونانی مفکرین بھی نفس مضمون کی تدریس کے ساتھ ساتھ نصاب تعلیم میں فلسفیانہ اقدار مثلاً نیکی، سچائی اور حسن ایسے مسائل کو شامل کرنے کی مکمل حمایت کرتے تھے۔

خود ہمارے ہاں پاکستانی فلسفۂ حیات اور نظریۂ تعلیم میں ایک گہرا ربط موجود ہے

چنانچہ تیسرے ۵ سالہ منصوبے کے پیش لفظ میں یہ احساس جھلکتا ہے کہ پاکستان کی تمام تر سیاسی اور سماجی جدوجہد کا مقصد ایسے نظام کا قیام ہے جو ہماری ثقافتی اقدار سے متناقض نہ ہو اور اس مقصد کے حصول میں سب سے اہم کردار ہمارا نظام تعلیم ادا کرے گا۔

تعلیمی فلسفہ کی اہمیت و افادیت کی بنیادیں تو اساس دہی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ تاہم وہ اہم کردار جو فلسفۂ تعلیم کے عمل میں ادا کرتا ہے۔ درج ذیل سطور میں مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ ہر عملی پہلو کے پس پردہ کوئی نہ کوئی نظریاتی صورت ضرور ہوتی ہے۔ تعلیم ایک بامقصد عمل ہے اور تکمیل شخصیت، فرد کی ذات اور معاشرہ کی بہبود اس کا منتہائے مقصود ہے۔ اس لئے تعلیم کی بنیادیں ایسے نظریات پر استوار کرنا ضروری ہوتی ہیں جو فرد اور معاشرے کے ان وسیع تر مقاصد کے حصول میں معاون اور رہنمائی کا باعث ہیں۔ اسی سبب سے تعلیم کا نظریاتی پہلو فلسفہ کا محتاج ہے۔

۲۔ ایک عام نقطۂ نظر کے مطابق تعلیم بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ یہ بلند تر مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ چونکہ فلسفہ وہ سرچشمہ ہے جو انسان کو تعلیم اور زندگی کے مقاصد متعین کرنے ان میں ربط تلاش کرنے اور ان کے حصول کے طریقوں سے روشناس کرانے میں مدد ہوتا ہے۔ اس لئے تعلیم میں اس کی اہمیت سے کسی انکار کی گنجائش نہیں۔

۳۔ اخلاقی اقدار کی تعلیمی اہمیت مسلمہ ہے۔ فلسفہ جملہ اقدار سے ہمہ پہلو بحث بھی کرتا ہے اور تعلیمی عمل میں ان کی تربیت کے انداز و طریق بھی تجویز کرتا ہے۔

۴۔ تعلیم میں تفکر و تدبر کی تربیت کو ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے اور اب

بھی ماہرین تعلیم اسے تعلیم کا ایک مقصد گردانتے ہیں۔ فلسفہ بھی تفکر و تدبر کو زندگی کے بنیادی مقاصد میں شمار کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ذی عقل اور دانشمند وہ ہے جو تفکر و تدبر کو بروئے کار لا کر زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ہوتا ہے نہ کہ اندھی تقلید کرنے میں بہتری خیال کرتا ہے۔

۵۔ فلسفہ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح تعلیم کے میدان میں صرف سوالات اٹھانے اور ان کے جوابات دینے کا قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک سوالات کرنے کی بڑی اہمیت ہے۔ فلسفہ کے مطالعہ سے بہتر سوالات کرنے کا رجحان، صلاحیت اور ذوق پیدا ہو جاتا ہے

۶۔ اس رجحان سے دعویٰ اور ردِ دعویٰ پر قدرت پا لینے سے بے لاگ تنقید، تجزیہ چیزوں کے باہمی ربط تلاش کرنے کا ملکہ اور میلان نشو و نما پاتا ہے اور اس کی مدد سے ایک طالب علم تعلیمی اصولوں اور تجربات میں جزئیات کو کل کے رشتہ میں دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

۷۔ جدید تعلیم کے نظریات کی بنیادیں نفسیات کی سائنس پر استوار کی جا رہی ہیں۔ اور نفسیات دراصل فلسفہ کی ہی ایک شاخ ہے جو ایک الگ سائنس کی حیثیت پا لینے کے بعد بھی کلی طور پر فلسفہ سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ اس کی جڑیں فلسفہ کے اندر پیوست ہیں

۸۔ علم اور اس کے مختلف انواع و اقسام اور ذرائع ترسیل علم نے اصل فلسفہ ہی سے جنم لیا ہے۔ طریقہ ہائے تدریس معلم اور متعلم کی فطرت اور ان کا باہمی تعلق اور معلم کی ذمہ داریوں وغیرہ پر فلسفہ سیر حاصل بحث کرتا ہے اور نصاب کی تدوین اور مسائل تعلیم نیز زندگی کے اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ غرضیکہ مدرس کے لئے فلسفہ کا مطالعہ خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

بہ قول فینکس فلسفہ کی تعلیمی اہمیت کے چند اہم پہلو حسب ذیل ہیں:-

۱. سوچ بچار کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔
۲. تعلیمی سرگرمی اور زندگی کے دیگر پہلوؤں میں ربط کی نشاندہی کرتا ہے
۳. نظریات و عمل میں تضاد اور کش مکش کو دور کرنا اور تصور اور حقیقت
کے بعد کو کم کرتا ہے۔
۴. سوالات کرنے کا رجحان، صلاحیت اور ذوق پیدا کرتا ہے۔
۵. جدت پسندی اور تشکیل نو کے رجحان کی نشو و نما کرتا ہے۔
۶. انسان کی داخلی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے اور تخیل میں وسعت کے
مواقع فراہم کرتا ہے۔
۷. فلسفہ انسانی حسوں (SENSES) سے حاصل ہونے والے علم کو حتمی نہیں
سمجھتا اور ان سے حاصل کردہ علم کو ادراک کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور
اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

جدید سائنسی ترقی نے نظریاتِ تعلیم کو یکسر بدل ڈالا ہے اور ماہرین تعلیم نے ہر شعبہ میں نئے انداز سے سوچنا اور عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ مغربی ممالک میں گذشتہ دو صدیوں کی تعلیمی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے جدید نظریہ تعلیم کی اساس فلسفہ پر رکھی اور تعلیم اور فلسفہ کا گہرا ربط تسلیم کیا ہے۔ ان کے ہاں مفروضہ یہ ہے جامع تعلیم کا عملی پہلو تعلیمی فلسفہ کے بغیر نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے اس بنیادی مسئلہ کی مکمل ترویج کے لئے امریکہ، روس، فرانس، جرمنی اور برطانیہ وغیرہ نے پوری کوششیں کیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ ممالک اس وقت تعلیمی، سائنسی فنی اور سماجی شعبہ ہائے کار میں ترقی یافتہ ملکوں کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان ممالک کے سامنے فلسفہ تعلیم کے لئے صرف محدود متبادلات تھے۔ انہوں نے مذہبی فلسفہ کو تعلیم کے لئے رکاوٹ جان کر خارج از بحث کر دیا اور ترقی کے لئے صرف سائنسی فلسفہ کو بنیاد قرار دیتے ہوئے

اپنی تمام تر کوششیں اس کے حصول کے لئے صرف کر دیں۔ مگر ترقی پذیر ممالک کی حالت اس کے برعکس ہے جہاں فلسفہ اور تعلیم کا تعلق ہے۔ ان ممالک کے سامنے اپنا کوئی واضح فلسفہ تعلیم موجود نہیں ہے۔ اگر ہے تو وہ اس کو جدید سائنسی علوم کی یلغار کی بنا پر شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور یہ سمجھ کر کہ وہ ان کی بدلتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے میں مدد نہیں کر سکتا۔ اس سے لاتعلق ہو کر رہ جاتے ہیں اور کسی ایسے

فلسفہ تعلیم کی تلاش میں سرگرداں ہیں جہاں کے موجودہ تقاضوں کی روشنی میں ترقی کی راہ پر گامزن کر سکے۔ ایسے ممالک کو یہ مشکل اس لئے بھی درپیش ہے کہ ان کے سامنے متعدد متبادلات کی بنا پر ان کے لئے مناسب متبادل انتخاب کرنا آسان نہیں ہے۔ ان پر یہ واضح نہیں ہے کہ وہ کن کن چیزوں اور نظریات کو ترک کریں اور کون سے نئے نظریات کو اپنائیں۔ مذہبی فلسفہ کو مکمل طور پر وہ ترک نہیں کر سکتے۔ ان کی ثقافت ان کے پاؤں جکڑے ہوئے ہے۔ وہ جدید مغربی فلسفہ کو اس کی نئی نئی ایجادوں کی بنا پر اپنانے کی شدت سے ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر مغربی اور اشتراکی فلسفہ تعلیم سے ان ممالک کو یہ خدشات ہیں کہ کہیں ان کی وجہ سے وہ اپنی ثقافت اور مذہبی نظریات سے نیست و نابود نہ کر بیٹھیں اور ان کی قدیم اخلاقی اور روحانی قدریں منتشر ہو کر رہ جائیں۔ اب حالت نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کی سی ہے۔ وہ اس کشمکش میں ہیں کہ ان دو متضاد راستوں میں سے کس پر گامزن ہوں۔

پاکستان بھی ایسے ہی ترقی پذیر ممالک میں سے ایک ہے۔ تقسیم برصغیر کے فوراً بعد پاکستان کی حکومت اور عوام نے اس بات کا احساس کر لیا تھا کہ ملکی نظریات اور عملیات میں بہت ہی تضاد ہے اور دونوں کو قریب تر لانے کی اشد ضرورت ہے اس سوچ بچار کے سلسلے میں جو تعلیمی سرگرمیاں عمل میں آئیں۔ ان سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں

اول: یہ کہ مغربی علوم و فنون اور ان کے بنیادی فلسفہ کو بجا بہ قبول نہ کیا جائے۔

دوم: یہ کہ پاکستان کی مذہبی اور ملی ثقافت اور اقدار کا تحفظ کیا جائے۔

سوم: ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے تعلیمی تقاضے بڑی تیزی سے بدلتے ہوئے رجحانات کے ساتھ مادی ترقی کی دوڑ میں دیگر ممالک کے ساتھ چل سکیں۔

چہارم: یہ کہ جو فلسفہ تعلیم بن کر ادا پاک کے جمہوری معاشی اور سیاسی ضروریات کا آئینہ دار رہا اور اس کی وساطت سے طبقاتی استبداد کا قلع قمع کرکے عوام الناس کے لئے معاشی، سماجی مساوات کو فروغ دینے میں تقویت حاصل ہو۔ یہ ہے کہ پاکستان کے تیسرے پانچسالہ منصوبہ کا ابتدائیہ "اسلامی سوشلزم" کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا حالات کی روشنی میں یہ ایک اہم ضرورت ہے کہ ہم اپنے ہاں فلسفہ کے بنیادی افکار کو تعلیمی مسائل کی روشنی میں مربوط و یکجا کرنے کے لئے واضح قسم کا تحقیقی پروگرام مرتب کریں اور اسی کے تحت سنجیدگی سے نہ صرف ان نظریات کا جدید تقاضوں کی روشنی میں جائزہ لیں۔ بلکہ دیگر ترقی یافتہ ممالک کے تعلیمی فلسفوں سے موازنہ بھی کریں تاکہ یہ تحقیق کی جا سکے کہ فلسفہ سائنس اور مذہب کی انفرادی بنیادوں پر جو فلسفہ ہائے تعلیم مرتب ہوتے ہیں وہ ہمارے مجوزہ بالا مقاصد کی تکمیل میں کہاں تک مدد اور کہاں تک رکاوٹ کا باعث ہوں گے اور یہ کہ مذہب، فلسفہ اور سائنس کی مشترک بنیادوں پر استوار ہونے والا تعلیمی فلسفہ ہمارے مذہبی اور ملی تقاضوں اور ضرورتوں کو کہاں تک پورا کر سکے گا۔

یہاں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے ملک کے طلبار کی اکثریت میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ جملہ علوم و فنون کی کتب قومی زبان میں لکھی جائیں۔ یہ رجحان صرف بجا ہی نہیں بلکہ قومی ترقی کا بنیادی زینہ بھی ہے۔ چونکہ ہر قوم کی ترقی کا انحصار اس کی زبان کی جامعیت، وسعت اور عمق پر مبنی ہے، اس لئے ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم اس زینے کو جہاں تک ممکن ہو سکے مضبوط بنائیں۔ اس وقت تعلیم کے ماہرین حکام اور عوام سبھی قومی زبان کے افادی پہلوؤں سے باخبر ہیں اور ان کی خواہش یہ ہے کہ علوم و فنون کے جو خزائن غیر ملکی زبانوں میں مدفون ہیں ہمارے طلبا ان سے بطریق احسن مستفید ہو سکیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ معلمین اور متعلمین خود تحقیقی امور سے متعلق قومی زبان میں تصنیف و تالیف کا بیڑہ اٹھانے کی سعی کریں۔ یہ فرض اعلیٰ سطح پر زیر تربیت معلمین کے لئے اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔
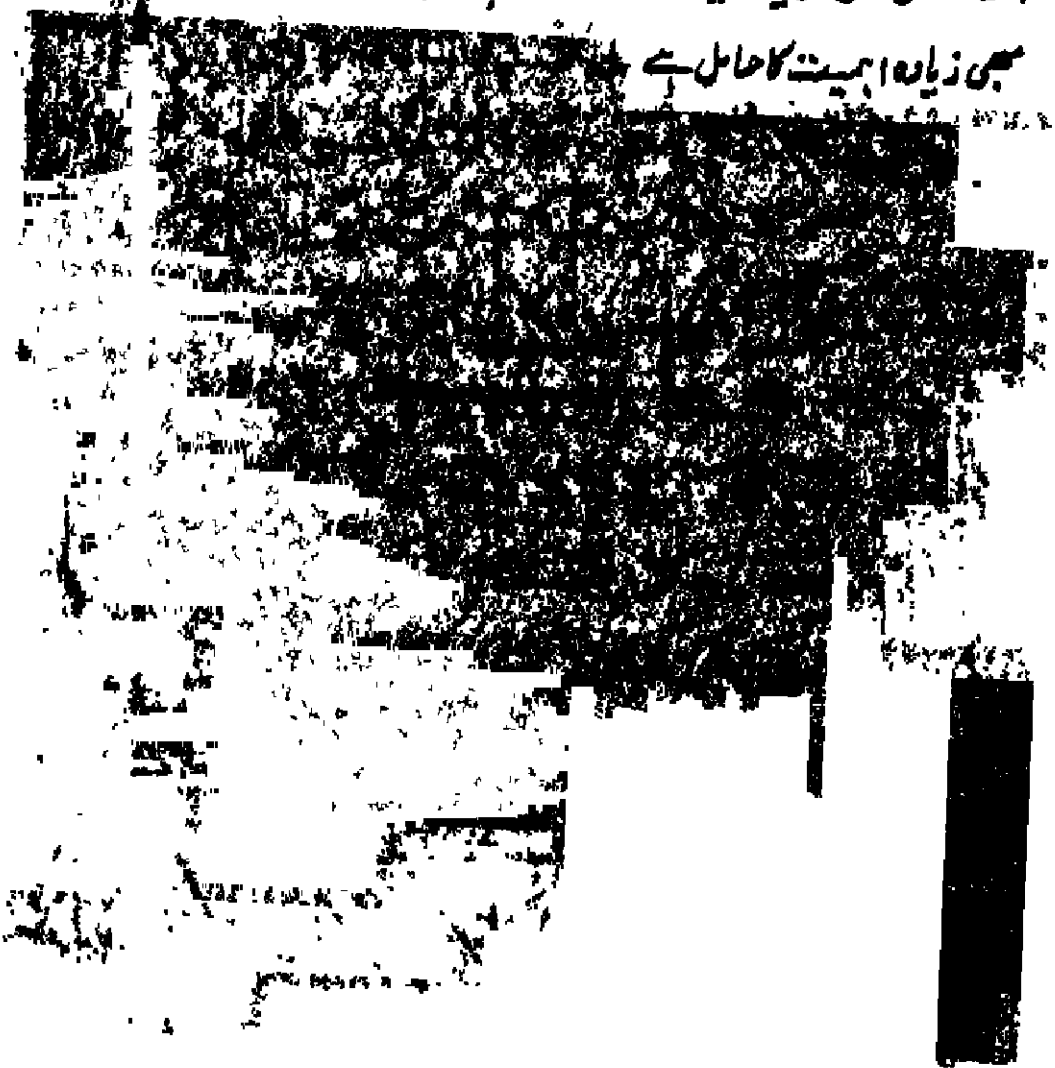
فلسفہ کے مختلف دبستان اور علمی نظریات

انسانی شعور کی تاریخ میں چھٹی صدی قبل مسیح کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس صدی میں ایسے نامور فلسفی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی فکر سے علم کی ایک نئی روشنی پیدا کی۔ چین میں لاؤ ٹی سی (۶۰۴ ق م) اور کنفیوشس (۵۵۱ ق م) برصغیر میں گوتم بدھ (۵۶۰ ق م) ایران میں زرتشت [illegible] یونان میں تھیلز (۵۶[illegible] ق م) فلسطین میں جرمیاہ (۶۲۹ ق م) اور ایزیکل (۶۲۲ ق م) ایسے نامور فلسفی ہیں جنھوں نے نہ صرف معاشرتی اصلاح میں اہم کردار ادا کیا۔ بلکہ علم کے نئے دروازے بھی وا کئے۔ یہ سارے وہ مفکرین ہیں جنھوں نے مختلف مکاتیب فکر کی بنیاد رکھی ہے بعد میں انسانی شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ مکاتیب فکر اپنی الگ الگ پہچان کراتے چلے گئے۔ تعلیم کو ایک علم اور فلسفہ کا درجہ دینے میں فلسفہ کے ان دبستانوں نے نمایاں حصہ لیا ہے تمام دبستانوں کا اپنا اپنا تصورِ تعلیم ہے۔ فلسفہ فطرت پسندی دنیا کے قدیم ترین مکاتیب فکر میں سے ہے۔ اس فکر کے فلسفی دنیا کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ تمام تغیر و تبدل اسی مادے کے عمل اور ردعمل سے رونما ہوتے ہیں۔

اس لئے ہر چیز کی اصل حقیقت اور بنیاد اسی کائنات میں پوشیدہ ہے۔ اس فلسفہ کے نمایاں مفکرین میں ڈیماکریٹس، اپیکیورس، تھامس ہابس، جان ایمس کومینس، جین جیکس روسو، جے ایچ پیسٹالوزی اور ہربرٹ سپنسر شامل ہیں۔ فطرت پسند تعلیم کے بارے میں اپنے نظریات رکھتے ہیں۔ ان کی رائے میں صحیح اور سچا علم وہ ہے۔ جس کی محرک فطرت ہو، فطرت کے تمام اجزا کے باہمی ربط کو شناخت کرنا صحیح علم ہے۔ علم صیغۂ انسان کی ذہنی کاوشوں کے ذریعے نیز ذہن اور مادے کے باہمی ربط کو جانچنے اور پرکھنے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ فطرت کا ہر ذرہ علم صادق کی عکاسی کرتا ہے۔ حقیقی علم حاصل کرنے کا راز اس نکتہ میں مضمر ہے کہ انسان جزئیات کا علم حاصل کر کے فطرت کے آفاقی اصول واضح کرے۔ حواس خمسہ علم حاصل کرنے کے بنیادی ذرائع ہیں فطرت کے بیرونی حقائق و مقاصد صرف سائنسی انداز فکر و عمل کے ذریعے سے ہی واضح ہو سکتے ہیں۔ فرانسس بیکن کے نزدیک حصول علم میں استقرائی طریقہ استخراجی طریقہ تعلیم کی نسبت زیادہ مفید اور کارآمد ہے۔

تصوریت کا آغاز یونان سے ہوا۔ یہ فلسفہ تعلیم و تدریس کے اصولوں پر بہت اثر انداز رہا ہے۔ اس دبستان کے نمایاں مفکروں میں افلاطون، ڈیکارٹ، سپینوزا، جان برکلے اور ہیگل شامل ہیں۔ اس فلسفہ کے فلسفی علم کی تمام شاخوں کو مانتے ہیں لیکن اس کی درجہ بندی بھی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی علم حاصل کرنے کے لئے ضروری نہیں کہ کوئی مادی ذریعہ موجود ہو۔ علم خود بخود بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ علم حاصل کرنے کے لئے استخراجی منطق کا سہارا لیا جاتا ہے اور اس سے نتائج نکالے جاتے ہیں۔ علم مباحثوں اور مکالموں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ انسانی تجربہ جو محض حواس پر مبنی ہو سچائی کے حصول میں ناکام بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ علم انسان کی داخلی کیفیات سے حاصل ہوتا ہے اور مادی چیزیں کوئی لازمی ذرائع علم نہیں ہیں۔ علم بلا واسطہ کی مختلف شاخوں مثلاً کشف، وحی اور الہام کو تصوریت پسند اہمیت دیتے ہیں۔ وہ انہیں ٹھوس ذرائع علم گردانتے ہیں، کیونکہ روحانی دنیا کا وجود ان کے وجود سے

[illegible] کے نزدیک پیچیدہ مسائل کا حل عقل و ادراک اور بصیرت پر مبنی ہے حقیقی علم کی حیثیت خود بخود عیاں ہے اور مخفی نہیں ہے کہ اسے ڈھونڈا جائے۔ تصوریت پسند، منطقیت کو بالکل نہیں مانتے اور نہ ہی اس بات کے قائل ہیں کہ استقرار سے اصول ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ اس قسم کے علم کو نکما خراب اور ناقص مانتے ہیں۔ علم میں نظریہ پیوستگی در رابطہ کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اجزا میں ربط ہو تو حقیقی علم بنتا ہے۔ اس ربط کو جانچنے کے لئے استخراجی منطق کا طریق استعمال کیا جاتا ہے۔ بقول بریڈلے "ہم صرف تصورات کا ادراک کرتے ہیں" اور یہ کہ کسی شے کا وجود [illegible] شے نے علم حاصل کرنے پر منحصر ہے۔

فلسفۂ حقیقت پسندی نے انیسویں اور بیسویں صدی میں مکتب فکر کی صورت اختیار کی۔ اس فلسفہ کی جڑیں ہمیں قدیم [illegible] کے خیالات میں بھی ملتی ہیں۔ فلسفۂ حقیقت پسندی میں ادراک حقیقت کا دار و مدار حواس انسانی پر ہے۔ انسانی دماغ اس وقت تک کام نہیں کرتا جب تک باہر سے کوئی محرک اسے حرکت نہ دے [illegible] فلسفہ بھی تدریس کے اصول پر بہت اثر ڈالتا رہا ہے۔ اس فلسفہ کے مفکرین میں ارسطو، جان لاک، ہربرٹ سپنسر، براڈڈی اور برٹرینڈ رسل قابل ذکر ہیں۔

حقیقت پسندوں کے نزدیک اس خاص رشتے کو جو ذہن اور کسی مادی طور پر موجود ذات کے درمیان قائم ہو جائے، علم کا نام دیا جاتا ہے۔ خارجی اشیاء کا ایک صحیح اور واضح مشاہدہ کرنے کا نام [illegible] کے فہم کا نام ہے۔ حقیقت پسندی ادراک کو اس اثر سے منسوب کرتی ہے جو معینہ شے دماغ پر ڈالتی ہے۔ یہ ایک ایسا اثر ہے جس کے ذریعے ہم شے کی خصوصیات کو اس کے معطیات کی صورت میں اپنے تخیل میں لاتے ہیں

برٹرینڈ رسل کے نزدیک کسی شے کے ادراک کے معنے اس شے کے ایک ایسے مقام پر ظاہر ہونے کے ہیں۔ جہاں ایک دماغ ہو، ساتھ ہی آلاتِ حس اور اعصاب بھی درمیانی وسیلے کے طور پر موجود ہوں۔ رسل ذہن کو بنیادی حیثیت دیتا ہے۔ اس کے

خیال میں ذہن ان اشیاء سے واقف ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے جن کی حقیقت اس کے ذاتی وجود سے بالکل مختلف ہو۔

فلسفۂ نتیجیت پسندی جدید دبستان ہے بعض مفکرا سے علیحدہ مکتب فکر تسلیم نہیں کرتے۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے چارلس سینڈرز پیئرس نے استعمال کی سوفسطائی معلمین کے علاوہ ہیریکلیٹس اور کوتیلیس نے اس نقطۂ نظر کی ترویج میں حصہ لیا ہے۔ سوفسطائی حکماء میں سے پروطاغورس، ہیپوکریٹس، گارجیس پولس اور پرمینیڈیز اور بعد کے مفکرین میں سے کونٹیلین، فرانسس بیکن، آگست کامتے، ولیم جیمز اور جان ڈیوی قابلِ ذکر ہیں۔ اس فلسفہ کے نزدیک صادق علم کے لئے حسی ادراک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ فلسفہ صرف حسیات پر اکتفا نہیں کرتا اور نہ ہی حواس کے ذریعے جمع کردہ مواد کو من وعن قبول کرتا ہے۔ علم کے حصول کے لئے وہ تعقل کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔ تجربہ کو حصولِ علم کی بنیادی شرط سمجھا جاتا ہے۔

فلسفۂ موجودیت پسندی عصرِ حاضر کا سب سے مقبول مکتبِ فکر ہے۔ اس فلسفہ میں فرد کی آزادی سوچ کو نمایاں حیثیت دی جاتی ہے۔ اس فلسفہ کے نامور مفکرین میں کرکیگارڈ، نطشے، کارل جیسپیرز، ہیڈیگر، جبرائیل مارسل اور جین پال سارتر نمایاں ہیں۔ ان مفکرین کے نزدیک حقیقت اور صداقت پر مبنی علم ہوتا ہے جو فرد اپنے لئے خود منتخب کرتا ہے۔ صادق علم انسان کے داخلی رجحانات کے تابع ہے۔ حقیقی علم کوئی خارجی شے نہیں بلکہ ذاتی علم تمام دیگر علوم وفنون کا منبع اور سرچشمہ ہوتا ہے۔

سقراط، افلاطون، ارسطو

دنیا کے بعض اہم ترین اشخاص جن کی زندگی نے تہذیب و تمدن کو چار چاند لگائے، استاد تھے۔ سیاستدانوں، موجدوں اور فن کاروں کو یہ شرف نصیب نہیں ہوا۔ دورِ حاضر میں فنِ تعلیم پر بحث کرتے وقت ہمیں ان تمام اساتذہ کی زندگی اور طریق کو زیرِ نظر کر لینا چاہیئے۔ جن کا شمار دنیا کے بڑے استادوں میں ہے اور جنہیں ہم اب تک جگت گرو کہہ کر پکارتے ہیں۔

مغربی تہذیب میں معلموں کے دو بڑے سلسلے ہیں۔ یونانی فلاسفر اور انبیائے بنی اسرائیل۔ اگر جناب عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے نظر پھیری جائے تو فلاسفۂ یونان کا اثر علم و فن کی ہر شاخ میں زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ثابت ہوگا۔ یہاں موضوعِ تعلیم سے بحث نہیں۔ طریقِ تعلیم میں بھی ہم یونانی فلسفیوں کے پیرو ہیں۔ ہماری درسگاہیں بنی اسرائیل کے طور طریقوں کی بجائے یونانی انداز رکھتی ہیں۔ انبیائے یہود وجدان و عرفان کو اپنی تعلیم کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔ فلاسفۂ یونان عقل و فہم کی پیروی کرتے تھے۔ دونوں طریقے قابلِ احترام ہیں۔ تاہم یہ حقیقت

ہے کہ گویا چند خدا رسیدہ بزرگ اپنے کمالات و معجزات سے دنیا کو بدل سکتے ہیں مگر ہمیں روزمرہ کی زندگی خوش اسلوبی سے گزارنے اور بچوں کو عمدہ تربیت دینے کے لئے عقل و فہم سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔

چھوٹے چھوٹے مدرسوں سے قطع نظر کر کے جب ہم بڑے معلموں کی طرف دیکھتے ہیں تو سب سے پہلے مقرروں کے اس طبقے پر نظر پڑتی ہے۔ جو پانچویں صدی قبل مسیح میں سوفسطائی (پیشہ ور دانش مند) کے لقب سے مشہور تھے بعد میں علم فروشی کی وجہ سے یہ نام بُری نظر سے دیکھا جانے لگا۔ چنانچہ سقراط کے بعد سے یہ لوگ اپنے آپ کو فلسفی کہنے لگے۔ جس کے معنے دانش پسند ہیں۔ تلاشِ حقیقت اور دقیق باتوں کا سراغ لگانا ان کا نصب العین تھا کیا اخلاق کے کچھ بنیادی اصول یا سوسائٹی کے طے کردہ ڈھکوسلوں کو اخلاق اور بدکرداری کا معیار مان لیا جائے۔ آیا قانون فی نفسہٖ کوئی چیز ہے یا محض کمزوروں کے لئے ایک جال ہے جو زبردستوں کے لئے مکڑی کے جالے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ دراصل یہ لوگ بلند پایہ مفکر تھے۔ جن کی تنقید میں تخریب کا پہلو ہوتا تھا۔ بحیثیت استاد ان کا مقام سطحی تھا۔

بات بھی یہی ہے۔ یہ سوفسطائی بس مقرر تھے جو ہزاروں کے ہجوم میں کامیاب تقریریں کیا کرتے تھے یہ ہمارے موجودہ مقرروں کے پیشرو ہیں جو اپنی فصاحت و بلاغت۔ بذلہ سنجی اور تلمیحات و استعارات کے بل پر اپنی باقاعدہ

ترتیب دی ہوئی تقریروں کو شہر بہ شہر تھوڑی تبدیلی کے ساتھ پیش کرتے پھرتے تھے۔ ان سوفسطائیوں کی بھی اسی طرح تعظیم ہوتی تھی انہیں بڑے بڑے معاوضے ملتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دنیا کے ہر موضوع پر بولنے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ بعض اوقات ان سے مشکل اور دقیق ترین موضوع پر بولنے کی فرمائش کی جاتی تھی لیکن وہ اپنی چرب زبانی، ذہانت اور دانائی سے ان تمام امتحانوں سے عہدہ برآ ہو

ہیتے تھے۔ انھیں ہمہ دانی کا دعویٰ نہیں تھا لیکن غور و فکر اور خطابت میں ان کا رتبہ مسلّم تھا۔

ہمارے ارباب صحافت میں ان سوفسطائیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ بنیادی معلومات کے بغیر ہر موضوع پہ ایک مقالہ لکھ ڈالنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن ان کا صحیح نمونہ برنارڈ شا مرحوم تھے اگر برنارڈ شا کے مقالات وخطبات کو کتابوں سے نکال کر کسی زبان سے ادا کروا دیا جائے تو ان یونانی سوفسطائیوں کا بالکل صحیح نمونہ ہوگا۔ جن کے بحث مباحثوں اور تقاریر میں تعمیری رجحانات کی بجائے صرف سطحی سرسری خیالات ہوتے تھے۔ تقریر کا جادو انہی خیالات کو حقیقت کا جامہ پہنا دیتا تھا ان کی سحر بیانی کا یہ عالم تھا کہ ابھی صبح کو کسی موضوع کے ایک پہلو پہ کامیابی سے تقریر کی ہے۔ شام کو اس کے مخالف پہلو پہ اس خوبی کے ساتھ بولنا شروع کر دیا کہ حاضرین محوِ حیرت رہ گئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ خطابت اور طلیق اللسانی کے زور سے ہم ہر بات ثابت کر سکتے ہیں۔

سوفسطائیوں کا یہ طریقہ اچھے اور برے دونوں پہلو رکھتا تھا۔ زیادہ تر ان کا انداز تخریبی تھا۔ شاگردوں کو اپنی ناپائدار لیکن پرشکوہ خطابت سے مسحور کر لینے اور غلط طرزِ فکر بخشنے کے علاوہ بعض صحت مند معاشرتی قدروں پہ بھی حملہ کرتے تھے۔ بایں ہمہ انھوں نے اہلِ یونان کو رفعتِ فکر سے آشنا کیا اور یہ دکھایا کہ دنیا میں فکر و خیال سب سے بڑی قوت ہے۔

جب سقراط نے اہلِ ایتھنز کو دعوتِ فکر دی تو اکثر اشخاص نے اسے بھی سوفسطائی سمجھا۔ مگر وہ ہر بات میں اس گروہ سے مختلف تھا۔ یہ لوگ اپنی تقریریں مرتب کر کے تمام یونان میں گشت کرتے اور دادِ خطابت دیتے پھرتے تھے وہ ایتھنز میں رہتا اور تقریر کرنے کی بجائے صرف سوال کیا کرتا۔ وہ اپنی تقریروں اور تعلیم کے عوض خطیر رقمیں لیتے تھے۔ ٹھاٹھ سے رہتے۔ بیش بہا لباس پہنتے اور جہاں جاتے ذاتی ملازموں اور معتمدوں کا ایک گروہ ان کے جلو میں چلتا۔ سقراط خود ایک غریب

مزدور خاندان کا فرد تھا۔ سادہ زندگی بسر کرتا۔ نہایت معمولی لباس پہنتا اور اپنی تعلیمات کے لئے کسی مقررہ معاوضہ کا طلب گار نہ ہوتا۔ سوفسطائی اپنی تقریروں کا اشتہار دیتے اور آراستہ و پیراستہ جلسوں میں تقریر کرتے۔

سقراط گلی کوچوں، ورزش گاہوں اور حماموں میں جہاں عوام کا ہجوم دیکھتا سوالات کے ذریعے دعوتِ فکر و خیال دیتا۔ وہ اس کے لئے موزوں بھی تھا۔ اس بوڑھے پہلوان کی طرح جو خود کشتی نہ لڑ سکتا ہو لیکن داؤ پیچ سکھانے میں ماہر ہو۔ وہ عوام کالانعام کو صحیح طرز فکر کی طرف لانے میں مشتاق تھا۔ علاوہ ازیں سوفسطائی ہمہ دانی کا دعویٰ کرتے تھے۔ سقراط اس "جہل و لاعلمی" کا معترف تھا جو کچھ سیکھنے کے لئے بے تاب ہو۔

المختصر جس طرح سوفسطائی تقریر و خطابت کے اولین قائد تھے۔ سقراط معلمی و اتالیقی کا اولین بانی تھا۔ اس کا طریق کار بالکل مختلف تھا سوفسطائیوں کی طرح تقریر کرنے والے ایتھنز میں سینکڑوں تھے۔ جو عدالتوں میں اپنے سحر بیانی سے ججوں اور منصفوں پر چھا جاتے۔ تھیٹروں میں بادشاہوں، دیوتاؤں اور سورماؤں کے بھیس میں ظاہر ہو کر دادِ فصاحت دیتے یا شہر کے چوک میں کھڑے ہو کر سیاسیات پر تقریر کرتے۔ سوفسطائیوں کی طرح شہر بہ شہر پھرنے والے فن کار مثلاً سفری نقاش، مجسمہ ساز، گویئے اور شاعر بھی ان گنت تھے۔ جن کا ہر جگہ استقبال و احترام کیا جاتا۔ مگر یہ تمام فن کار اور سوفسطائی یونان کے فکر و خیال پر کوئی مستقل یا پائیدار نقش چھوڑنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے سقراط صرف ایتھنز میں رہ کر اپنے مخصوص طریقے سے تعلیم دیتا تھا وہ اوسکر وائلڈ کا رج یا میڈم ڈیوڈفنڈ کی طرح خوش بیان نہ تھا۔ اسے لچھے دار تقریر، مرصع جملوں یا دلکش عبارتوں سے سروکار نہ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ خود کم بولتا۔ صرف سوالات کیا کرتا اور مخاطب کو قدم قدم چلا کر اس کی لاعلمی سے آگاہ کر کے تلاشِ حقیقت کا جنون اس کے دل و دماغ میں بھر دیتا۔

جرح و تنقید کا یہ طریقہ جو سقراط نے اختیار کیا تھا اپنی جگہ نہایت مشکل ہے۔ جنہیں عدالتوں میں جرح سننے کا اتفاق ہو ۔ وہ جانتے ہوں گے کہ یہ طریقہ باقاعدہ تقریر کی بہ نسبت مشکل لیکن زیادہ کامیاب ہے ۔ سقراط ہر شخص سے اس کی لیاقت کے موافق سوال کرتا ۔ اسکول کے طلباء عالم فاضل، عوام و خواص پیشہ ور فنکار، رؤسا، قائدانِ مذہب غرض ہر طبقہ کا آدمی اس سے ملتا۔ وہ ہر ایک سے اس کے حسب حال گفتگو کرنے میں ماہر تھا۔ اس کا نمونہ اگر کوئی شخص ہوا تو وہ فرقہ جیسوئٹ کا بانی سینٹ اگناٹیس لایولا ہے جو اپنے ہر مخاطب سے خواہ وہ رنگین مزاج ہو یا تند خو، سنجیدہ ہو یا ظریف اس کے حسب حال بات کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ سقراط بدصورت تھا۔ مگر اس نے اپنی خوش اطواری سے اس کمی کی تلافی کرلی تھی۔ تاہم اس کے انداز میں رئیسانہ آن یا تحکم نہ تھا۔ بایں ہمہ وہ ذہین ترین اور انتہائی قابل اشخاص کو ان کمزوریوں سے آگاہ بلکہ معترف کردیتا جیسا کہ بیان ہوا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ اول اپنی لاعلمی کا اقرار کرتا۔ جب مخاطب اس ترکیب سے فخر و غرور کی ہوا بھر کر اس کے سوالات کا جواب دیتا تو سقراط اس کی غلطیاں اور کمزور پہلو بے نقاب کرتا۔ اسے خوب اندازہ ہوتا تھا کہ کون شخص کس پہلو سے راہ راست پر لایا جا سکتا ہے۔ مخاطب بعض دفعہ زچ ہو کر طیش میں بھر جاتا۔ لیکن سقراط کی خوش مزاجی و بُردباری اسی طرح قائم رہتی۔ مخالف کی دھواں دھار تقریر کے باوجود سقراط کی شخصیت نمایاں رہتی۔ وہ اپنے ظاہری عجز و انکسار کے باوجود ان لفاظوں کا ناطقہ بند کردیتا اور تلاشِ حقیقت میں مصروف رہتا۔ وہ یگانۂ زمانہ مقرر جن کی فصاحت و بلاغت کی دھوم بھی رہتی تھی۔ سقراط کے سامنے آکر دم بخود ہو جاتے۔ انہیں اپنی لاعلمی کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہ ہوتا۔

سقراط کے مایۂ ناز شاگردوں کا تصور کرکے ہمیں یقین ہوجاتا ہے کہ وہ بہت بڑا استاد تھا۔ ان شاگردوں میں افلاطون سرِ فہرست ہے۔ اس نے ایتھنز میں

اکاڈمی یعنی ایک درس گاہ قائم کی جہاں وہ سقراط کی تعلیمات پر غور کرنے کے علاوہ مطالعے اور تعلیم دینے کا شغل جاری رکھتا تھا۔ اس نے فلسفہ پر متعدد کتابیں لکھیں۔ جن میں سقراط کا انداز فکر اور وہی مکالماتی طریقہ موجود ہے۔ شاید ہی کسی استاد کو ایسا سعادت مند شاگرد نصیب ہوا ہو۔ اگرا فلاطون کا طرز فکر سقراط سے کافی مختلف ہے لیکن اس کی اکثر کتابوں میں سقراط کی روح فکر کارفرما نظر آتی ہے۔ وہی خیالات، وہی سوچ۔ وہی مکالماتی لہجہ۔

ان مکالمات میں ہم افلاطون کی بجائے ہر جگہ سقراط کو ایک ذہین ترین شخص کی حیثیت سے خود پسند، جہاندیدہ سوفسطائیوں کے ساتھ نبرد آزما دیکھتے ہیں۔ یونان کے بہترین دماغ۔ فاضل سائنس دان، سیاست دان اور شاعر اس وحید عصر فلسفی کو گھیرے ہوتے ہیں اور یہ اپنی بے نظیر فصاحت اور سلجھے ہوئے طرز خیال سے سبھوں کو خود ان کے دلائل سے مات کر کے بالآخر ان پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایتھنز کے فاضل ہوں یا باہر کا کوئی ممتاز مہمان۔ سب اس یگانۂ روزگار کے سامنے دم بخود نظر آتے ہیں۔ مدرسے کے معمولی طالب علم سے لے کر فاضلانِ زمانہ تک سب اس کے منطقی اور اقلیدسی دلائل کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ ستر سال کی عمر میں جب ظالم حکومت اسے سزائے موت کا حکم سناتی ہے یہ حقیقت شناس اسے بے پرواہی کے انداز میں سنتا اور زندگی کے آخری لمحات میں بھی روح کے غیر فانی ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ افلاطون کی اکثر کتابیں سقراط کے حالات اور اٹل عزم وثبات کی داستان ہیں جس سے وہ تلاشِ حقیقت کی راہ میں گامزن رہتا تھا۔

ہمیں سقراط کا طریق تعلیم تو معلوم ہے لیکن افلاطون یا کسی اور شاگرد کی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا پڑھاتا تھا۔ زینوفون کی تحریر میں سقراط کی جو تصویر نظر آتی ہے۔ اس میں وہ ایک شوخ، دیدہ دلیر، دل فریب لیکن دلآزار شخص معلوم ہوتا تھا جو ہر راہ چلتے سے ہزار رنگ کے سوالات پوچھتا تھا اور شاگرد اسطیفس لکھتا ہے کہ وہ تنقید کی تیغ بےاماں سے تمام روحانی

[illegible] سے آزاد دیتا تھا اور انسان کو تمام سماجی اصولوں سے آزاد [illegible] کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ خود افلاطون کے حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ سقراط انسان کے جہلِ مطلق کا قائل تھا اور اس کی نظر میں علم و دانش سب سے بڑی نیکی تھی۔ نیز وہ پرانے روایتی نظریات کو توڑ کر نئے نظریات پیش کرتا تھا جن کی معقولیت کے سامنے ہر شخص آمنا و صدقنا کہنے پر مجبور ہو جاتا۔ بعض اہلِ قلم کہتے ہیں کہ یہ نظریات خود افلاطون کے ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نظریے استاد اور شاگرد دونوں کے مشترکہ خیالات کی پیداوار ہیں۔

حقیقت بھی یہی ہے۔ اگر تمام نظریئے سقراط کے ہوتے تو اس کے دوسرے شاگرد بھی حوالے دیتے۔ بہرحال افلاطون نے ان نظریوں کو بہت کچھ سنوار کر پیش کیا ہے۔ لیکن سقراط کے خیالات اس کے بغیر بھی آراستہ اور مرتب ہی ہوں گے۔ جو شخص بولنے میں اتنا کفایت شعار ہو اور جس کے سوالات جرح در جرح کا انداز رکھتے ہوں۔ یقیناً سوالوں کو ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہوگا۔ اس کے سوال خود معنی خیز ہوں گے۔ یہاں تعلیم کا یہ قیمتی نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ استاد کا ذاتی بیان چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ شاگرد اسے جلد بھول سکتے ہیں لیکن جس بات کو وہ خود بحث و تمحیص اور غور و فکر کے بعد سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔

افلاطون کا طرزِ تعلیم اپنے استاد سقراط سے کہیں زیادہ باقاعدہ اور محدود تھا۔ باقاعدہ بولی گلی کوچوں میں سوال و جواب کرنے کی بجائے اس نے اکاڈیمی یعنی اپنا دارالعلوم قائم کیا جس کا انداز خانقاہ یا تحقیقی ادارے کا سا تھا۔ اس میں داخلے کے لئے باقاعدہ امتحان دینا پڑتا اور بعد میں اس کے قواعد کی پابندی لازمی تھی۔ محدود اس معنے سے کہ ہر کس و ناکس کو سمجھانے کی بجائے [illegible] اور منتخب شاگردوں کو تعلیم دینا اس کا یہ طریقہ قدرتی تھا۔ وہ ایک رئیس خاندان کا چشم و چراغ تھا جس کی افتادِ مزاج اول میں شاعرانہ

اور آخر میں صوفیانہ ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی اپنی قوتیں ہر شخص پر ضائع کرنے کی بجائے صرف اپنے شاگردوں کے لئے وقف کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ افلاطون کا اثر ہمہ گیر نہیں ہے۔ امتحان کا موجودہ طریقہ بھی اسی کی ایجاد ہے۔

افلاطون کے دو شاگرد ایک دوسرے کی ضد نکلے۔ ان میں پہلا تو سیرا کیوز کا بادشاہ ڈائی نی شیس ہے۔ جسے افلاطون نے فلسفی بنانا چاہا۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ اعلیٰ درجے کا ظالم بن گیا۔ دوسرا شاگرد وہ فاضل زمانہ ہے جسے ہم ارسطو کے نام سے جانتے ہیں اور جس کی برابر ہمہ داں شخص دُنیا آج تک پیدا نہیں کر سکی۔ مگر ان دو کے علاوہ اس کی کتابوں نے اور سینکڑوں شاگرد پیدا کئے ہیں۔ یہ کتابیں بجائے خود فن تعلیم کا شاہکار ہیں۔

ان کتابوں میں سقراط کو جگہ جگہ اس طرح دکھایا گیا ہے کہ دوستوں یا شاگردوں کا ایک مجمع ہے۔ جس کے سامنے وہ ایک مسئلہ تجویز کر کے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ نرم مشفقانہ لہجے میں کچھ سوال پوچھتا ہے پھر ٹھہر جاتا ہے۔ پھر چند سوال کرتا ہے اور ان کا جواب سن کر جوابات کی بے ربطی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان پر سکون سوالات کے سامنے بیہودہ نظریات اور لغو مفروضات خود رفع ہو جاتے ہیں۔ اعتراض اور جرح و تنقید اس کے مخاطب کو رفتہ رفتہ معقولیت کی طرف لاتے اور محض فہم و فراست کی پیروی پر مائل کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسے قطعی فیصلہ پر پہنچ جاتا ہے۔ جو بحث کے آغاز کے وقت نظر سے بالکل پوشیدہ تھا اور جس کا ادراک عقل سلیم کے بغیر ممکن نہ تھا۔ افلاطون خود بھی یہی اثر پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ہاں مباحثات کا ایک ایک پہلو واضح ہوتا رہتا ہے۔ نہ کسی اعلیٰ شخصیت سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے نہ لفاظی یا توہم آمیز الفاظ و خیالات کی پناہ ڈھونڈھی جاتی ہے سقراط کا طریقہ یہی تھا۔ ان تمام مقامات کو آپ ایک اجنبی کی نظر سے دیکھتے اور خود شریک بحث ہونے کی بجائے بس تماشائی بنے رہیے۔ آپ کو سقراط کی برتری، اس کے طریقِ

تعلیم کی کامیابی اور مخالفوں کی بے چارگی جلد ہی محسوس ہونے لگے گی - افلاطون [illegible] کا بھی یہی انداز ہے -

ہمیں افلاطون کے نظریات سے بحث نہیں - اپنی کتاب میں وہ جمہوری طرز حکومت کا مخالف اور تنگ نظر دکھائی دیتا ہے - ہمیں تو صرف افلاطون کے طرزِ تعلیم سے تعلق ہے - اس کے سوال و جواب کا انداز بالکل اپنے استاد کا سا ہے - یہاں بھی وہی رنگ نظر آتا ہے - بحث کا منطقی سلسلہ مخاطب کو رفتہ رفتہ ان نظریات کا قائل کر دیتا ہے جن کا آغاز بحث کے وقت اسے تصور بھی نہ آسکتا تھا - سیاسیات کے لئے تو نہیں بلکہ مابعدالطبیعات منطق اور اخلاقیات میں یہی طریقۂ تعلیم سب سے کامیاب ثابت ہوا - مکالماتِ افلاطون میں آپ سقراط کو دیکھنا چاہیں تو یونانِ قدیم کے ماحول میں گم ہو جایئے - آپ کے سامنے اس فاضلِ زمانہ کی بظاہر عاجز لیکن زبردست شخصیت نمودار ہو گی - آہستہ آہستہ تبادلۂ خیالات ہو رہا ہے اور مخاطب خود بخود کسی ترغیب یا تحکم کے بغیر اس کے پیش کردہ نظریات کی طرف کھچا چلا آرہا ہے - یہ طریقہ اس مُبَت گرد کا تھا جو آج سے ۲۳ صدیاں پہلے دنیا کو درسِ حقیقت دیا کرتا تھا -

افلاطون کا طریق کار موضوعِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں امتیاز کی بہترین مثال پیش کرتا ہے - آپ کو افلاطون کے عقائد سے اختلاف کرنے کا حق ہے - لیکن اس کا طریقِ تعلیم یقیناً ہر اعتراض سے بالاتر ہے - یہ کامیاب طریقہ اس نے اپنے استاد سے سیکھا تھا جس کی تعلیم یہی تھی کہ انسان کو حقیقت سے آشنا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے تحمل کے ساتھ عقل و فہم کی مدد سے صحیح فیصلہ کرنے پر مائل کیا جائے - مخاطب سے سوال کرو - اس کے جوابات کا جائزہ لو - بحث کرتے رہو - یہاں تک کہ اس کا دل مطمئن ہو جائے - تنہائی میں خود اپنی عقل و فہم سے اس طرح خطاب کرو کہ گویا وہ ایک دوسری ہستی ہے - اس کے مطالبات کا احترام کرو

دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتے وقت اسے دشمن نہ سمجھو۔ بلکہ تصور کرو کہ
حق صداقت کی جستجو میں ہم دونوں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ مکالماتِ افلاطون
ہم اس نظریے نہیں پڑھتے کہ سقراط کے نظریات کی برتری ثابت ہو جائے۔
بحیثیت معلم ہمارے نزدیک سقراط کی عظمت محض اس بات میں پوشیدہ
ہے کہ وہ منطقی اور معقولاتی بحث کو انسان کی تعلیم وتفہیم کے لئے سب سے
کارگر حربے کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔

ارسطو..... اپنے استادوں کی طرح یہ نام بھی احترام کا مستحق ہے۔
سقراط..... افلاطون..... ارسطو..... استادوں اور شاگردوں کا یہ
پُرعظمت سلسلہ واقعی قابلِ رشک ہے! ارسطو ایک طبیب کا لڑکا تھا۔
جو سترہ سال کی عمر میں افلاطون کی اکاڈمی میں داخل ہوا اور ۴۰ سال کی
عمر یعنی اپنے استاد کی وفات تک پڑھتا رہا اس کے بعد وہ مزید تحقیق وجستجو
میں مصروف رہا۔ کچھ عرصہ بعد لیشیم نام کی درس گاہ کھولی جو اکاڈمی کی طرح
ایک قریبی خانقاہ کے نام سے منسوب تھی۔ افلاطون کی طرح ارسطو بھی اس بات
کا قائل تھا کہ تعلیم دینے کے علاوہ استاد کو تحقیق وتدقیق میں بھی مشغول رہنا
چاہیئے۔ لیشیم کا انداز وہی تھا جو آج کل ہمارے ان تحقیقی اداروں کا ہے۔
جہاں ریسرچ جاری رہتی ہے۔ حیاتیات (بایولوجی) کی تحقیق کے لئے دنیا
کے دور دراز ملکوں سے نمونے لائے جاتے تھے اور لیشیم میں طلباء ان کا معائنہ
کرکے نتائج اخذ کرتے تھے۔ سیاست مدن پر جو بے نظیر رسالے ارسطو کے قلم
سے نکلے ہیں وہ ان تمام حکومتوں کے دستور العمل کا نچوڑ ہیں جہان دنوں
قائم تھیں اور جن کے حالات کا تجزیہ ارسطو کے شاگردوں نے اس کی
نگرانی میں کیا۔

ارسطو کی تعلیم کا انداز مباحثاتی تھا۔ وہی انداز جو آج کل بھی بعض اعلیٰ
درس گاہوں میں رائج ہے۔ یہ طریقہ عام نہیں ہو سکتا۔ اخراجات زیادہ ہونے

کے علاوہ اس کے لئے اعلیٰ ذہنی فضا کی موجودگی اور مکمل سیاسی آزادی بھی ضروری ہے۔ (خود ارسطو جو اپنے استاد کی طرح شاہ پرست تھا۔ غیر جمہوری عقائد اور سکندر اعظم سے واسطہ رکھنے کی پاداش میں ایتھنز سے جلا وطن کیا گیا۔ انتہائی ذہین طلباء کے علاوہ ارسطو اوسط درجے کے شاگردوں کو بھی داخل کر لیتا تھا۔ لیکن ان کی لیاقت عام سطح سے کہیں بلند ہوتی تھی۔ ارسطو کے نام سے آج جو تصانیف ملتی ہیں وہ باقاعدہ کتابوں کی بجائے لیکچروں کے اقتباسات (نوٹ) ہیں جو اس کے شاگرد قلم بند کر لیتے تھے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ لیکچر میں بحث و تحیص

کی عام اجازت تھی لیکن ارسطو مسلسل تقریر کی طرف زیادہ مائل تھا وہ ہر مضمون کے مختلف موضوعات باقاعدہ تجزیہ کر کے فرداً فرداً ہر ایک کے مسائل کی تشریح کرتا اور اس طرح طلبا تمام مضمون کا دلچسپ و ہمہ گیر جائزہ لے لیتے۔

دوران تقریر میں ارسطو الجھے ہوئے مسائل کی تشریح کے لئے مختلف تجویزوں اور اشاروں کا تجزیہ کرتا اور ان کی غلطیوں سے بچتا بچاتا ایک صحیح حل، ایک واضح فیصلے تک پہنچ جاتا۔ اسے تشریح کے لئے مختلف اشخاص اور چیزوں کو بطور تشبیہ و تمثیل استعمال کرنے کی عادت تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دوران تقریر میں وہ چلتا پھرتا رہتا تھا۔ اس طرح وہ فرقہ مشائین کا بانی ہے جو پڑھاتے وقت بیٹھے رہنے کی بجائے چلتے رہتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ تعلیم میں کسی رسمی جمود کا قائل نہ تھا۔ اکثر مفکروں کا خیال ہے کہ اگر آدمی چلتا رہے تو مسلسل جسمانی حرکت کے باعث دماغی قوتیں بیدار رہتی ہیں۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن اگر دماغ پر زور نہ ڈالا جائے اور اس چلنے پھرنے کو محض بناوٹی یا روایتی طور پر اختیار کر لیا جائے تو ہم اسے محض ریاکاری اور نمائش سمجھیں گے۔ ارسطو کو کسی نے نمائش کا الزام نہیں دیا۔ وہ ہر لحظہ علم حاصل کرنے اور سابقہ غلط خیالات چھوڑ دینے کے لئے تیار رہتا تھا وہ

یہ دکھانا چاہتا تھا کہ فی الحقیقت نت نئے انکشافات کے سلسلے ہی کا نام علم ہے
سب سے زیادہ دشوار تعلیمی کام ان شہزادوں اور مفکروں کی تربیت
ہے جو آگے چل کر دنیا کی تقدیر کے مالک بننے والے ہوں۔ سقراط نے یہ کرنا
چاہا لیکن نہ کر سکا۔ بہ حیثیت مجموعی خود افلاطون بھی کامیاب نہ ہوا۔ حالانکہ
اس کے حریف اسقاریطس نے اپنا مدرسۂ شہریاران زیادہ کامیابی سے چلایا
ارسطو کو یہ بوجھ اٹھانا پڑا۔ اسے مقدونیہ کے شہزادے سکندر کی اتالیقی
کے لئے نامزد کیا گیا۔ جس کا باپ فیلقوس دھوکے بازی اور جبر و تعدی
کی بدولت متحدہ یونان کا بادشاہ بننا چاہتا تھا اور جو آگے چل کر کئی میدان مارنے
کے بعد ہندوستان کی سرزمین میں پہنچا اور یونان کا سب سے بڑا بادشاہ بنا
یہ نہایت مشکل ذمہ داری تھی آیئے دیکھیں کہ وہ اس ذمہ داری سے کیسے عہدہ برآ
ہوا۔

سکندر خالص یونانی نہ تھا۔ اس کا خاندان مقدونیہ (شمالی یونان)
سے تعلق رکھتا تھا۔۔۔ شمالی یونان کا کوہستانی علاقہ۔۔ جس کے باشندے
تند خوئی و بربریت، ظلم و شقاوت، عزم و حوصلہ اور بے انتہا ہمت و
جرأت کے لئے مشہور تھے۔ رات رات بھر شراب نوشی کرتے رہنا ان کا
مشغلہ تھا۔ سکندر کو بھی اپنے خاندانی رجحانات سے پورا حصہ ملا تھا۔ ایک مرتبہ
نشے کی حالت میں اس نے اپنے عزیز ترین دوست کلائی ٹس کو محض اس لئے
برچھی مار کر ہلاک کر دیا کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ سکندر کے یہ خصائل
سپاہ گری اور حکومت کے لئے چاہے کتنے ہی موزوں ہوں۔ تعلیم و تربیت
کے نقطۂ نظر سے ایسے نوجوان کی اتالیقی سخت دشوار کام ہے۔ ارسطو اپنے عہد
سے پانچ چھ صدی آگے تھا۔ سکندر جیسے تند مزاج خود سر لڑکے کی تعلیم
میں اسے وہی مشکلیں پیش آئی ہوں گی۔ جو سر فرانسس بیکن کو ایک بلڈی ایکس
یا نیوٹن کو پیٹر اعظم کی اتالیقی میں پیش آتیں۔ وہ اس مصیبت کو کبھی نہ مول لیتا۔

لیکن چونکہ وہ خود مقدونی تھا اسلئے کمال دانشمندی سے ان مواقع کا اندازہ لگا لیا جو مستقبل کے پردے میں پنہاں تھے۔

معلوم نہیں کہ سکندر کی تربیت میں اس نے کیا طریقہ اختیار کیا لیکن نتائج سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے مقدونیہ کی جبلی تند مزاجی و شقاوت کی اصلاح کرنے کا خیال محال چھوڑ کر سکندر کے صرف ان اوصاف کو چمکایا ہوگا جن کی تہذیب و اصلاح ممکن تھی۔ سکندر کی تند خوئی ایک جبلی جذبہ تھا۔ اسے فرو کرنا محال تھا۔ شہر تھیبس کو حصولِ آزادی کی جدوجہد کی پاداش میں سر بسر ویران کرنا اور اس کے باشندوں کو بطور غلام فروخت کر ڈالنا جبریت کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی سپہ سالاری اور شہسواری مسلّم ہے۔ ارسطو نے اس کے مزاجی و خاندانی رجحانات کو زائل کرنے کی بجائے یہ کوشش کی کہ اس کے عمدہ اوصاف کو چمکا دے اور برائیوں کو حتی الامکان دبا دے۔

اس نے سب سے پہلے سکندر کو ہومر کی تصانیف پڑھائیں اور یہ اقدام بہت مناسب تھا۔ ہومر کے تمام ہیرو اہل مقدونیہ کی صفات سے متصف تھے۔ لہٰذا سکندر کی وابستگی فطری بات تھی۔ خود سکندر کا مورثِ اعلیٰ ایکلیز تھا جو ہومر کا محبوب کردار تھا۔ شہر ٹرائے کے باہر جس ٹیلے کو ایکلیز کا مقبرہ مانا جاتا ہے سکندر اس کی زیارت کے لئے گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو "ایکلیز ثانی" سمجھ کر ایشیا کے قدیم متمول شہر فتح کرنے پر مائل تھا۔ اسے ہومر کے کلیات سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ سفر حضر، خلوت جلوت غرض ہر جگہ یہ کتاب اس کے ساتھ رہتی تھی۔

اس کے بعد ارسطو نے سکندر کے ذہن پر دوسرے یونانی شعراء اور یونانی تہذیب کا نقش اس طرح جمایا کہ اس تہذیب کا پھیلانا سکندر نے اپنا مقصد خیالات بنا لیا۔ سیاسی تجربہ بڑھتا رہا اور بالآخر اس نے بیڑا اٹھایا کہ مشرق وسطیٰ

فتوحات اور کشور کشائی صرف اسی صورت میں نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں کہ مفتوحہ ممالک میں یونانی تہذیب، روایات، زبان، ادبیات اور اوضاع و اطوار کو فروغ دیا جائے۔ اس نے یونانی انداز پر شہر آباد کئے۔ چنانچہ مصر کا شہرا سکندریہ اپنی ساخت میں قطعی یونانی تھا۔ یہ ثقافتی اثرات بہت پائیدار ثابت ہوئے۔ چار صدیوں بعد جب انجیل مقدس کا یونانی زبان میں ترجمہ ہوا تو مشرق وسطیٰ کے ممالک میں جہاں رومی سلطنت کا اقتدار ہنوز قائم تھا۔ لفرانی تعلیمات رائج رہیں۔ یہ سب ان تہذیبی و ثقافتی اثرات کا نتیجہ تھا۔ جن کی دھن ارسطو کی تعلیم سے سکندر کے دل میں بندھی تھی۔

سکندر کی خاندانی خصوصیات یا عقائد کو ارسطو نے بالکل نہ چھیڑا۔ ایک غاصب اور جابر و ظالم بادشاہ کے نونہال کو اس کی جبلّی عادتوں یا خاندانی روایات سے منحرف کرنا امر محال تھا۔ اگر ارسطو اسے جمہوریت کی تعلیم دیتا تو ناکام رہتا بلکہ اپنے عہدے سے برطرف کر دیا جاتا۔ مگر اس نے سکندر کے دل میں جمہوری اوصاف پیدا کر دیئے۔ وسیع القلبی اور فیاضی جسے ارسطو عظمتِ انسان کا خلاصہ سمجھتا تھا۔ اس کے شاگرد میں پیدا ہو گئی۔ وہ اپنے دوست کلائی ٹس کو قتل کرنے کے بعد مدت تک ضمیر کی ملامت کے عذاب سہتا رہا۔ اسی طرح جب اسے اطلاع ملی کہ اس کا طبیب اسے زہر دے کر مار ڈالنے کے لئے تیار کیا گیا ہے تو اس نے کمال بے پروائی سے طبیب کو بلایا اس سے لے کر دوا پی اور پھر وہ اطلاعی پرچہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس کا باپ فیلقوس جو تعلیم و تربیت سے محروم رہا۔ اگر اس موقع پر موجود ہوتا تو بلا تحقیق و تفتیش طبیب کو شکنجے میں کس دیتا۔ ایران کے شہنشاہ دارا کو زیر کرنے کے بعد اس کے حرم سے جو فیاضانہ سلوک سکندرِ اعظم نے کیا اور جس طرح اپنی خواہشات کو دبائے رکھا وہ بھی اس عالی ہمتی کی بدولت تھا جو ارسطو کی تعلیم سے پیدا ہوئی تھی۔ اس اولوالعزمی اور عالی ظرفی کی جھلک جو سکندر

نے ارسطو کی تعلیم و تربیت سے حاصل کی تھی۔ آج بھی اس کے مجسموں اور اس کے زمانہ کے سکوں سے عیاں ہے اور ان ہی اوصاف کی بدولت وہ یورپ کے عہدِ شجاعت میں ایک مثالی ہیرو مانا گیا ہے۔

گلبرٹ ہائیٹ

حضرت عیسیٰ، معلّم اخلاق

مغربی دنیا کے معلموں میں ناصریہ کے رہنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ توراۃ میں ہم انبیاء کی اولاد (مریدانِ خاص) کا تذکرہ پڑھتے ہیں۔ ایلیشا جیسے رسولوں کے ساتھ ان کے حواریوں کو جو وابستگی تھی اس کا ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ وہ دنیا کے تمام دھندے چھوڑ کر اپنے مرشد کے ساتھ ایک خانقاہ میں رہتے تھے۔ وہ اپنے مرشد کے ملفوظات جمع کرتے۔ اس کے اسوۂ زندگی کی تقلید کرتے اور اس کے الہامات سے مستفید ہوتے۔ مشرق کے بعض مفکروں کا بھی یہی انداز تھا جو اپنے شاگردوں سمیت خانقاہ یا آشرم میں رہتے تھے۔ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کا بھی طریقہ تھا۔ ان کے شاگرد (حواری) ہر حال میں ان کے ساتھ رہتے اور سفر حضر کسی حال میں اس رہبرِ اعظم کا دامن نہ چھوڑتے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ممتاز اور ذہین یہودی لڑکوں کی طرح توراۃ مقدس کے صحیفے عبرانی زبان میں پڑھے تھے۔ اس عہد میں عبرانی عام بول چال کی زبان نہ تھی صرف مذہبی تعلیم کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ انہیں ان مقدس صحیفوں کی تفسیر

اور عبارت کی حقیقی تاویل پر اتنا عبور حاصل ہو گیا تھا کہ وہ موسوی شریعت کے فقہ و تفسیر میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ ان کے متعلق سب سے پہلی اطلاع جو ہمیں ملتی ہے یہ ہے کہ وہ بارہ سال کی عمر میں بیت المقدس کے اندر عبرانی زبان کے جاندیدہ استادوں کے ساتھ تفسیر کے پیچیدہ مسائل پر بحث کیا کرتے تھے۔ یہودیوں کی تعلیمی روایات نے بہت سے وحید عصر پیدا کئے ہیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ ان سے کہیں بلند ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم دو پہلو رکھتی تھی جو باہم ایک دوسرے سے متعلق اور نہایت اہم تھے۔ وہ اپنے حواریوں کو تعلیم دیتے تھے اور اس کے علاوہ ان تمام یہودیوں کو وعظ و نصائح سے مستفید کرتے تھے۔ جو ان کی نصیحت سننے کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ حواریوں کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ آخر وقت تک ان کے ساتھ رہے۔ حکام نے حضرت عیسیٰ کو شہید کرتے وقت ان حواریوں سے تعرض نہیں کیا۔ انہیں یقین تھا کہ رہنما کے ختم ہوتے ہی ان کے عقائد و خیالات خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ بہرحال یہ حواری جو بیکس و نادار تھے اپنے مرشد کے حالات سنانے اور تبلیغ کرنے کے لئے زندہ رہے۔ انہوں نے یروشلم میں ہی کلیسا قائم کرکے تبلیغ کا کام جاری رکھا۔ حضرت عیسیٰ چاہتے تو اس عہد کے ذہین ترین اور مالدار آدمیوں کو اپنے اصحاب کے دائرے میں شامل کر لیتے۔ لیکن نہیں۔ ان کا پیغام امن و سکون، غریبوں کی تسلی کے لئے تھا اور اس مقصد کے لئے وہی بیکس، گمراہ اور نادار حواری موزوں تھے۔ جن کے کروڑوں بھائی بندِ دنیا کے آلام و مصائب میں مبتلا تھے۔

حضرت عیسیٰؑ عوام کو درس دیتے تھے۔ ان کی تعلیم سے عام یہودی بھی مستفید ہوتے تھے۔ وہ مقدس صحیفے ہاتھ میں لے کر عوام کو اس کی تفسیر سنایا کرتے تھے۔ دینِ مسیحی کے علماء (پادری) اب بھی ان کی تقلید میں کتاب مقدس کی تفسیر عوام کو سناتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی تقریر کا انداز نہایت سادہ لیکن ایک جلالی شان لئے ہوئے

ہوتا تھا۔ اس کے لئے وہ کوئی تیاری نہ کرتے۔ تقریر کے مختلف ٹکڑوں میں کوئی ربط نہ ہوتا لیکن عوام ان کے پیغام کی عظمت سے اتنا متاثر ہوتے کہ انہیں اکثر کھانے پینے کا ہوش بھی نہ رہتا۔ یہودیوں نے ان کی اس مقبولیت کو حسد اور شک کی نظر سے دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس عظیم رہنما کی تعلیمات دین موسوی کے لئے خطرہ بن جائیں گی۔ ایک مرتبہ وعظ ختم ہونے پر ناصریہ کے یہودیوں نے انہیں ہلاک کر دینا چاہا لیکن عوام کی بے پناہ عقیدت کا خیال کر کے اس ارادے سے باز رہے۔ جناب مسیح کا اثر بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ گرفتاری سے پہلے جب وہ عید منانے کے لئے یروشلم میں داخل ہوئے تو عوام شہر نے ان کی تعظیم و تکریم اس طرح کی کہ گویا وہ خدا کے مظہر ہیں۔

جو چیز ان کی روز افزوں مقبولیت کا باعث تھی اس کا تذکرہ کتاب مقدس میں موجود ہے۔ وہ پیشہ ور علماء کی طرح نہیں بلکہ ایک الہامی مفکر کی طرح تقریر کرتے تھے۔ وہ مقدس صحیفوں کے نکات کی لامتناہی اور الجھی ہوئی تفسیر بیان کرنے، اقتضع آمیز اور قصداً پیچیدہ سوالات میں الجھ کر رہ جانے سے بچتے تھے۔

صدوقیوں نے ان سے ایک دفعہ سوال کیا تھا کہ جنت میں اس عورت کا کیا انجام ہوگا جو دنیا میں یکے بعد دیگرے سات شوہروں کے عقد میں رہی ہو۔ مگر ایسے گمراہ کن سوالات کو سلجھانا جناب عیسیٰؑ کے لئے قطعی سہل تھا۔ ان کی مقبولیت کا سبب وہ سلجھے ہوئے خیالات تھے جو علماء ریاکار کے پیچ در پیچ بیانات کے برعکس حقیقت کی راہ دکھاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انہیں بذریعہ الہام اندازہ ہو چکا تھا کہ سابقہ شریعت میں اصلاح و ترمیم ناگزیر ہے۔

جیسا کہ مقدس صحیفوں سے پتہ چلتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ تعلیم میں چار طریقے استعمال کرتے تھے۔ ان میں پہلا طریقہ تقریر کا تھا۔ ان کی تقریر میں باقاعدہ ترتیب منطقی ساخت یا تسلسل خیالات ہرگز نہ ہوتا تھا۔ بعض تقریروں کا انداز یہ ہے کہ زبان سے ایک الہامی جملہ ادا کیا۔ اس کے بعد اسے سات آٹھ مرتبہ جذب و عرفان

کے عالم میں دہرایا۔ دیر تک خاموش رہے اور پھر باقی تقریر پوری کی جو بظاہر تسلسل خیال، ترتیب کلام یا ربط سے عاری ہوتی تھی۔ فنی نقطۂ نظر سے آپ اسے اچھا نہ کہیں گے۔ مگر اس کی مجذوبی شان، الہامی جلال اور عرفانی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مقدس صحیفوں میں حضرت عیسیٰؑ کی تقریریں جس طرح موجود ہیں۔ ربط و ترتیب سے عاری ہیں۔ خیالات کا سلسلہ جا بجا ٹوٹا ہوا نظر آتا ہے۔ مذہبی اصطلاح میں اس کے مختلف ٹکڑے قطعہ کہلاتے ہیں۔ ان میں عروضی وزن، قوافی آہنگ اور شعری لطافت کی جھلک نظر آتی ہے۔ دل کو یقین ہو جاتا ہے کہ ہاں اس پیغمبر کی زبان سے الفاظ یوں ہی ادا ہوتے ہوں گے۔ تصور اس کی نورانی صورت، پروقار لہجے اور معصوم شخصیت کو سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عوام کا پرشوق ہجوم اس کی تقریر سننے کے لئے بے تاب ہے۔ وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے اور ہم یہ آواز سنتے ہیں :-

"مبارک ہیں وہ جو عاجزی اختیار کرتے ہیں۔ عقبیٰ کی فلاح انہی کے لئے ہے"

پھر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد یہ کلمے سنائی دیتے ہیں

"مصیبت زدہ لوگوں پر برکت نازل ہو۔ خدا انہیں سکون دے گا"

ساری تقریریں ایسے ہی ٹکڑوں پر مشتمل ہوتی تھیں جنہیں حواری یاد رکھتے تھے۔ انہیں کتابی شکل میں کئی سال بعد ترتیب دیا گیا۔ بایں ہمہ ان کی صحت میں شک نہیں۔ اکثر پرانی قوموں کا مذہبی ادب اسی طرح سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری کو پہنچا ہے۔

وعظ و تلقین کا یہ طریقہ جس کے نمونے انجیل مقدس میں کہیں کہیں اور بھی نظر آتے ہیں مشرقی ممالک کے داناؤں کا معمول تھا۔ بنی اسرائیل کے اکثر پیغمبر

یہی ضرب الامثالی طریقہ استعمال کرتے تھے۔ حضرت ایوب پر جو آزمائش کا دور گزرا
اس میں ان کے رفیقوں نے جس طرح غمگساری کی ہے وہ بھی یہی انداز رکھتی
ہے وہ ایک ہفتے تک جناب ایوب کے پاس بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے
بعد انہوں نے باری باری جناب ایوب سے بحث شروع کی اور پوچھا کہ موجودہ
صورت حال کی ذمہ داری آپ پر کس حد تک عائد ہوتی ہے۔ جناب ایوب اور
ان کے تین رفیقوں کی یہ تقریر کسی طرح منطقی ترتیب میں پیش نہیں کی جا
سکتی۔ ان میں سے ہر شخص باقاعدہ بحث کی بجائے اپنا نقطۂ نظر بار بار
دہراتا ہے اور شاعرانہ محاکات نیز برجستہ عبارت سے اس میں زور پیدا کرتا
ہے۔ وہ سب اپنا نقطۂ نظر بار بار آہستہ آہستہ لیکن پرجوش اور شدت
کے ساتھ ادا کرتے رہے۔ غرض یہی طریقہ حضرت عیسیٰؑ کا تھا۔ ان کی تقریر
یہی الہامی جوش رکھتی تھی۔ اگر اس کا انداز مسلسل باقاعدہ لیکچر کا ہوتا تو
ہمیں یقین ہے کہ ان کے حواری اسے بھی یاد کر لیتے اور بعد ازاں کتابی صورت
میں مرتب کر کے دنیا کو اپنے مرشد کے پیغام سے آشنا کرتے۔

حضرت عیسیٰؑ کا دوسرا طریقہ جو پہلے طریقے سے کافی مشابہ ہے یہ تھا کہ
جذب و محویت کے عالم میں ایک فقرہ کہتے جو دانش و حکمت کا خلاصہ ہوتا۔
پھر ان پر خاموشی طاری ہو جاتی۔ اسی طرح بعض نام نہاد علماء کے جواب میں بھی
وہ یہی طریقہ اختیار کرتے۔ ان کے مریدان معنی خیز فقروں کو بے حد اہم سمجھتے تھے
کیونکہ یہ فقرے مدت کے غور و فکر کا خلاصہ اور کہنے والے کی شخصیت کے مکمل
آئینہ دار ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسا فقرہ کسی اور انسان کی زبان سے نہیں
نکل سکتا۔ لہٰذا وہ اسے حفظ کر لیتے۔ جناب عیسیٰ متعدد مشکل مواقع پر انہی معنی خیز
جملوں سے اپنے دشمنوں کو خاموش کرتے تھے۔ مشرق کے اکثر دانش مندوں
کا (جن میں چین کا رہبر اعظم کنفیوشس بھی شامل ہے) یہی دستور تھا۔ بنی
اسرائیل کے علماء جنہیں رشک و حسد کی آگ کباب کئے دیتی تھی شاطرانہ چالیں

چلتے اور عیارانہ سوالوں سے انہیں عاجز کرنے کی ترکیبیں سوچتے لیکن حضرت عیسیٰ کا ایک جملہ انہیں خجل کر دینے کے لئے کافی ہوتا۔ ایک مرتبہ یہ لوگ کسی زانی عورت کو پکڑ لائے جس کا جرم ثابت ہو چکا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ حضرت عیسیٰ موسوی شریعت کے مطابق اسے سنگسار کرنے کا حکم دیں۔ کچھ دیر خاموش رہ کر آپ نے کہا کہ ہاں اسے سنگسار کر سکتے ہو۔ لیکن پہلا پتھر وہ شخص مارے جس سے عمر بھر گناہ سرزد نہ ہوا ہو۔ کس کی مجال تھی کہ معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا اور پتھر اٹھاتا۔

کبھی کبھی حضرت عیسیٰؑ پند و نصیحت کے جواہر ریزے اپنے ذاتی افعال یا مخصوص اعمال کے پیرائے میں پیش کرتے تھے۔ یہ ان کا تیسرا طریقہ تھا۔ تمام بڑے استادوں کی طرح وہ خوب آگاہ تھے۔ کہ جس طرح تصویر کسی واقعہ یا منظر کو ناقابلِ فراموش بنا دیتی ہے۔ اسی طرح دقیق باتوں کو ذہن نشین کرنے کے لئے بن کے ارشادی اعمال یا سلسلہ افعال بے نظیر ذریعہ ہے۔ افلاطون اس طریقہ سے کام لیتا تھا۔ حضرت مسیح بھی کہانی، تمثیل اور اعضاء کی حرکات سے مطالب ذہن نشین کرنے کا کام لیتے تھے۔ ان کے اکثر فیصلے، احکام اور اشارے اب تک ہماری نظر میں پھرتے ہیں۔ خطاکار عورت کو بچانا۔ بیت المقدس سے مہاجنوں کو دُرّے مار کر نکالنا اور آخری عشائے ربانی کے مناظر آج بھی ایسے تازہ ہیں کہ گویا ہم نے انہیں بچشمِ خود دیکھا ہے۔

چوتھا طریقہ تبلیغ کا تھا وہ اپنے مریدوں کو دینداری و معرفت کا درس دینے کے بعد انہیں جا بجا فلسطین میں تبلیغ کے لئے بھیج دیتے تھے۔ بہت کم استاد ایسا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ مذہبی مبلغ بھی یہ طریقہ شاذ و نادر استعمال کرتے ہیں۔ وہ تو بس ایک جماعت کو ایک محدود قوم تصور کر کے اپنی تعلیم کے لئے مخصوص کر لیتے ہیں۔ اگرچہ سقراط اور سقراط کے شاگرد ہر اس شخص کو تعلیم دینے کے لئے تیار رہتے جو سوالات کا جواب دے سکے۔ لیکن ان میں سے کسی نے اپنے خیالا

کی اشاعت کے لئے شاگردوں کو باہر نہیں بھیجا۔ اس طرح خود سقراط، افلاطون
اور ارسطو نے بھی تعلیم کو محدود رکھا۔ تبلیغ کی طرف توجہ نہیں دی۔ بلکہ ارسطو
نے اس کے محدود دائرے کو تنگ کر دیا۔ اس کی اعلیٰ تعلیم صرف چند ممتاز
شاگردوں کے لئے وقف تھی۔ جس میں عوام کا دخل نہ تھا۔ ان کی تعلیمات
عام نہ ہو سکیں اور آج صرف چند اقتباسات، مکالمات اور یادداشتیں ہیں جو ہم
تک پہنچی ہیں۔ حضرت عیسیٰ نے اپنی تعلیمات عام کر دیں۔ ان کے حینِ حیات
بارہ حواری یہ فرض انجام دیتے رہے اور آج یہ عالم ہے کہ جہاں بھی علم و دانش
کا نور پہنچا ہے۔ اس مرشدِ کامل کا پیغام وہاں سُنا اور سنایا جاتا ہے۔ دنیا کے
ہر گوشے میں کسی راہب، کسی عالم، کسی نن (راہبہ) یا کسی فلاحی کارکن کی بدولت
حتیٰ کہ ہر گھر میں جہاں ماں اپنے بچے کو نماز سکھاتی ہے یہ محسوس ہوتا ہے
کہ ۵۰ پشتوں کا فاصلہ ہو جانے کے باوجود اس رہبرِ اعظم کا پیغام زندہ ہے۔

معلمِ انسانیتؐ

عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا

...وْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمْ

...ۃَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ؕ

بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین پر بڑا احسان کیا۔ جب ان

... میں سے ایک رسول بھیجا۔ جو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ

کی آیات ... سناتا ہے۔ ان کو آلائشوں سے پاک کرتا ہے اور ان

... ... ائی کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک اس سے پہلے وہ صریح

... پڑے ہوئے تھے۔

... عسقلانی نے لکھا ہے کہ قرآن میں ایک سو پینتیس آیات ایسی

ہیں ... کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ

... محنت دھندے کرتے ہیں۔ کیا سب کو اپنے اپنے پیشے

کے لئے آپ کی حیاتِ طیبہ سے راہِ تقلید مل سکتی ہے۔ جواب ہے کہ بات سے ساری دنیا کو۔۔۔ اور ہر شعبۂ زندگی میں۔۔۔ جیسے تجارت کرنا ہو۔ وہ شام کے تاجر کو دیکھے۔ جس کی صداقت وامانت کی دھوم مچ گئی تھی۔

کوئی سپہ سالار ہو تو وہ بدر و حنین کے قائد کو سامنے رکھے جو اکیلا کھڑا (و انا النبی لا کذب) کا نعرہ لگاتا تھا۔ منصف بننا ہو تو مدینہ کے منج اور کعبہ کے منصف سے سبق لے۔ آقائی کرنی ہو تو انس بن مالکؓ۔ زید بن ثابتؓ اور ابو ہریرہؓ کے آقا کو دیکھ لے۔ باپ ہو تو فاطمہؓ کے باپ جیسا اور خاوند ہو تو خدیجۃ الکبریٰؓ اور عائشہ صدیقہ کے شوہر جیسا۔ اسی طرح جسے تعلیم و تعلم میں ہدایات لینی ہوں وہ صفہ کے پرنسپل سے رجوع کرے۔ جنابِ رسالت مآبؐ نے تو لوگوں کے سوچنے کے انداز بدل ڈالے۔ ان کے افکار و نظریات بدل ڈالے۔ تہذیب و تمدن بدل دیئے۔ آئین و قوانین تبدیل کر دیئے آپؐ نے اپنی تعلیم سے عربوں جیسی قوم کو جسے اونٹ چرانے کے سوا اور کسی چیز کا سلیقہ نہ تھا۔ شتربانی کے مرتبہ سے اٹھا کر جہاں بانی کے مرتبہ پر پہنچا دیا اور جو قوم زیادہ سے زیادہ امراؤ القیس اور زہیر کے درجہ کے آدمی پیدا کر سکتی تھی اس کے اندر اس استاد کے فیض سے ابوبکرؓ و عمرؓ اور علیؓ و ابوذرؓ جیسے انسانیت کے شاہکار پیدا ہوئے۔ اس کملی والے معلم نے ایسے ایسے عقدے جو فلسفیوں سے حل نہ ہوئے اور نکتہ وروں سے کھل نہ سکے چند اشاروں میں بتا دیئے۔

اسکول کی ابتداء

یوں تو صفحۂ ہستی اس کا مدرسہ تھا اور پوری انسانیت رہتی دنیا تک اس کی شاگرد رہے گی۔ لیکن جیسے آگے چل کر پتہ چلے گا اپنی اسکیم کے مطابق

اس نے پہلے یہ مدرسہ ان پاک روحوں سے شروع کیا جو پہلے ہی سے علم کے پیاسے سرگرداں تھیں اور تشنہ تھیں۔ پس داخلے کا اعلان ہوتے ہی انہوں نے اس محسنِ انسانیت کا دامن مضبوطی سے تھام لیا اور اس کی تعلیمات کو اپنے اندر جذب کرنے لگے۔

اول کلاس

یہ پہلی کلاس حضرت ارقم رضؓ کے مکان پر شروع ہوئی۔ طالب علموں میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ، حضرت علی رضؓ۔ حضرت عمار رضؓ، جناب عثمان رضؓ عبداللہ ابن مسعود رضؓ۔ عثمان ابن مظعون رضؓ، ابوعبیدہ ابن جراح، صہیب رومی رضؓ اور ابوذر غفاری رضؓ زیادہ ممتاز ہیں۔

ان مبتدیوں کو کورس سے پہلے تعریفات (DEFINITIONS) پڑھائی گئیں۔ لیکن نہایت شیریں زبان میں چھوٹے چھوٹے بول جو کانوں میں رس گھولتے اور دلوں میں تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو جاتے۔ آنحضرت صلعم کی تعلیمات سے اخلاق درست ہوتے اور اس کی قوت پر وہ اپنے تجربات (تزکیہ نفس) کرتے اور دشمنانِ اسلام کی وہ سختیاں سہتے۔ جن کی تاریخ میں کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔

عملی تجربات

یہ لوگ مدرسے میں استاد سے (THEORY) (نصاب قرآن) پڑھتے تھے۔ اور جوار مدرسہ ان کے لئے تجربہ گاہ بنا ہوا تھا۔ یہاں طلبا کو سخت سے سخت شکلات اور مصائب میں ثابت قدم رہنے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ انہیں تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کے سینے پر آتشیں مہریں لگائی جاتی تھیں۔

ان کو انگاروں پہ لٹا کر کباب کیا جاتا تھا۔ ان کو اپنے گھروں سے نکال دیا گیا۔ اپنے پرائے دشمن ہو گئے۔ انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ لیکن استاد نے جو سبق کہ ایک دفعہ پڑھا دیا اسے وہ کسی صورت نہ بھلا سکے۔

اب یہ کلاس کافی بڑی ہو گئی تھی اور اس نے ابتدائی امتحانات بھی پاس کر لئے تھے۔ لہذا ہجرت کے بعد اسے ایک یونیورسٹی کی حیثیت دے دی گئی۔ جس میں مختلف قسم کی کلاسیں تھیں

اصحاب صفہ یا ہمہ وقتی طلباً

پہلی قسم کی کلاسیں (BOARDERS) کی تھیں۔ اس میں ان طالب علموں نے داخلہ لے رکھا تھا۔ جنہوں نے اپنی زندگی آنحضرتؐ کی تربیت پذیری کی نذر کر دی تھی۔ یہ لوگ دربار نبوتؐ میں حاضر رہتے، قرآن پڑھتے۔ احادیث سنتے اور رات کو اسی چبوترے پر پڑ رہتے۔ گویا (BOARDERS) تھے۔ یہ اصحاب اصحاب صفہ کہلاتے تھے۔ نادار تھے بلکہ اس قدر مفلس تھے کہ کسی کے پاس ایک کپڑے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال یہ آنحضرتؐ کے محبوب طلبا تھے آپ کو ان کا بہت خیال رہتا۔ ان کی (NIGHT CLASSES) بھی لگتی تھیں اور ان کی مجموعی تعداد مؤرخین نے ۴۰۰ تک لکھی ہے۔ یہ وہ درس گاہ تھی جس کے فارغ التحصیل (DEGREE HOLDERS) حضرت ابوہریرہؓ حضرت انسؓ۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے جن کا امت مسلمہ پہ اتنا بڑا احسان ہے کہ وہ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

دوم کلاس

دوسری کلاس (DAY SCHOLARS) کی تھی۔ یہ جملہ مہاجرین وانصار

تھے۔ جو سارا وقت نہیں دے سکتے تھے۔ مشاغل دینی کے ساتھ ساتھ ہر قسم کا
کاروبار یعنی تجارت وزراعت وغیرہ بھی کرتے تھے۔ لیکن بڑے حاضر باش
(REGULAR) تھے اور سبق میں کبھی ناغہ نہیں کرتے تھے۔ بعض نے تو مل کر
باریاں بنائی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک انصاری ہمسائے سے باری بنا رکھی تھی
کہ ایک دن وہ دربار رسالت میں حاضر رہتا اور شام کو آپ کو ساری باتیں سناتا
دوسرے دن حضرت عمرؓ کی باری ہوتی۔ دوسرے یہ کہ اپنے اسباق ہی ان کا
اوڑھنا بچھونا تھے اور اٹھتے بیٹھتے یہ انہیں کا چرچا کرتے تھے۔ بلکہ ازبر
کئے ہوتے تھے۔

سوم کلاس

ایک تیسری کلاس تھی جو اس مدرسِ کائنات کے گھر پر لگتی تھی۔ یہ امہات
المومنین کی تھی۔ کتنے ہی زندگی کے مسائل ہیں جو زندگی کے لئے سیکھنا لابدی و
لازمی ہیں۔ لیکن انہیں کوئی شخص مدرسے میں بیٹھ کر نہیں سیکھ سکتا۔ رات دن
کے ۲۴ گھنٹوں میں سے نصف سے زیادہ وقت انسان کا گھر میں کٹتا ہے۔ یہ سب
کچھ سکھانے کے لئے اس چانسلر (CHANCELLAR) نے یہ کلاسیں جاری
کی تھیں۔ سورۃ الاحزاب میں انہیں ان کا کام بتا دیا گیا تھا اور داخلے
کے وقت انہیں اختیار دیا گیا تھا۔ کہ اگر دنیاوی زندگی بسر کرنا ہے تو اللہ
کا نبی تمہیں رخصت کر دیتا ہے۔ معاشرے میں باقی عورتوں کی طرح تم بھی زندگی
گزارو۔ لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کو اختیار کرنا چاہتی ہو تو پھر کام
یہ ہے کہ جو اس گھر میں سیکھو وہ دوسری عورتوں کو سکھاؤ۔ اس کلاس کی
(PREFECT) حضرت عائشہ صدیقہؓ تھیں۔ جو سب سے زیادہ ذہین اور
عقلمند تھیں۔ چنانچہ فقہا کے قول کے مطابق امت نے ½ دین صرف ان سے

سیکھا ہے۔

بیرونی شاخیں (AFFILIATED COLLEGES)

سال ہا سال کی عرق فشانی اور دن رات کی محنت سے اب اس تعلیم کے چرچے بہت دور دور ہونے لگے تھے۔ بستیوں سے قبائل اور علاقوں سے لوگ اپنے ہاں اس کی شاخ کھلوانے کی سفارش لے کر آتے۔ چنانچہ جہاں آنحضرتؐ مناسب سمجھتے وہاں کوئی ماہر العلوم بھیج دیا جاتا اور یوں اسے اس یونیورسٹی سے ملحق کر دیا جاتا۔

خاص لیکچر (SPACIAL LECTURES)

خاص لیکچرز کی اسکیم یہ تھی کہ ہر آبادی میں چند لوگوں کو لے کر تعلیم و تربیت دی جائے۔ پھر وہ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر عوام کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیں تاکہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں اسلام کا شعور اور حدود اللہ کا علم پھیل جائے۔ چنانچہ حضرت عباس رضؓ سے روایت ہے کہ عرب کے ہر قبیلے والے لوگ آنحضرت کے پاس آتے اور مذہبی امور دریافت کرتے اور دین میں سمجھ حاصل کرتے۔ یہ تربیت گاہ ان کے لئے دس بیس دن اور مہینہ مہینہ کے لئے کھلتی جس میں رہ کر عقائد و فقہ کے ضروری مسائل سیکھ لیتے اور اپنے قبیلہ میں واپس چلے جاتے اور انہیں تعلیم دیتے۔

ان کا تزکیہ (PRACTICALS) اب جہاد تھا جس میں جملہ آزمائش آجاتی تھیں اور جان و مال سب حاضر کرنے پڑتے تھے۔ عام دنوں میں اس کی مستقل مشق ارکانِ دین میں تھی۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ سب سے آئے دن نئے نئے مواقع سامنے آتے رہتے۔ جس میں خالص دنیا خالص جیت کر سامنے

جاتے ہیں۔

اس طرح اس معلم انسانیت ؐ نے ۲۳ سال میں یہ کورس مکمل کیا اور آئندہ کے لئے کا تیفڈر (ENDAD) تیار کر گئے۔ چنانچہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ضروری ابواب (CHAPTERS) کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا "میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر انہیں پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ ایک قرآن اور دوسرے میری سنت۔ یعنی کورس (قرآن) اور اس پر استاد کے نوٹس (سنت)۔

تجربات (PRACTICALS) کے لئے فرما دیا میرے صحابہ ستارے ہی ستارے ہیں جس کی پیروی کرو گے راہ پا لو گے۔ چنانچہ ان کی شاندار روایات مشعل راہ بنیں گی۔ اس کے بعد فرمایا کہ "جو یہاں موجود ہیں وہ یہ تمام باتیں ان لوگوں تک پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔

استاد ؐ کی خصوصیات

اللہ کی ہدایت میں اس استاد ؐ نے ایسے دھیرے دھیرے اور بتدریج ان کی زندگیوں پر اپنی تعلیم کا رنگ چڑھایا۔ کہ انہیں معلوم بھی نہ ہو ا کہ انسانیت کے شاہکار بن گئے۔ پہلے مجمل احکام دیئے جاتے ساتھ ساتھ عقائد سے ذہنوں میں استعداد کو اخلاقی قوت پیدا کر دی جاتی اور پھر مفصل احکام آجاتے۔ اسی حکمت کا نتیجہ تھا کہ وہ شراب کے رسیا جن کی گھٹی میں یہ کافر پڑی تھی۔ جب حرام ہوئی تو مدینہ کی گلیوں میں سیلاب کی طرح بہتی ہوئی دیکھی گئی۔ جس کے منہ میں گھونٹ تھا وہ اس نے باہر پھینک دیا۔

جناب رسالت مآب ؐ کی کامیابی کا بڑا راز یہ تھا کہ جو کچھ آپ فرماتے تھے اس پر پوری طرح عمل بھی کرتے تھے اور یہ طلباء کے لئے ایک نمونے

د DEMONSTRATION) کا کام دیتا تھا۔ نفسیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ سیکھنے کے لئے عملی مثال کتنی ضروری ہوتی ہے۔

آپؐ اور آپؐ کے طلباء کا تعلق نہایت گہرا، بلند، پاک، خالص اور وجدانی تھا۔ وہ آپ کے ایک اشارے پر جانیں نچھاور کر دیتے۔ انؐ کی خوشنودی پر اپنے دنیا تک کو وار کر ارزاں سمجھتے۔ کلاس ہوتی تو یوں سکوت (SILENCE) ہوتا کہ گویا سروں پر پرندے بیٹھے ہوتے ہیں۔

یہ سارا کام مفت اور رضاکارانہ تھا جس پر کچھ فیس نہ تھی۔ چنانچہ آپؐ سے اعلان کرا دیا گیا "میں تم سے اس پر کچھ اجر نہیں مانگتا"۔ اور اس پر اس قدر اصرار کیا گیا کہ اس استادؐ نے اپنی اولاد پر بھی طلباء (مسلمانوں) سے کوئی فدیہ، فیس، نذرانہ و شکرانہ حرام کر دیا۔

یہ تھا وہ استادؐ جس نے اپنی کاوش سے دنیا کے گئے گزرے طلباء کو لے کر انہیں دنیا کا استاد بنا دیا۔ جنہوں نے صدیوں جہان کو انسانیت کا درس دیا اور ہر شعبۂ زندگی میں دنیا کی قیادت کی۔

تاریخ عالم میں ابھی تک کوئی ایسی ہستی نہیں گزری جس میں بیک وقت اتنی خوبیاں اور اوصاف جمع ہو گئے ہوں۔ ایک ہونہار فرزند، ایک شفیق باپ، ایک متوازن شوہر، ایک ہر دلعزیز شہری، ایک بہادر سپاہی، ایک نامور جرنیل ایک مدبر حکمران، ایک بے مثال معلم، ایک عالمگیر مذہبی رہنما، ایک لاجواب قانون ساز یعنی آپؐ ایک انسان کامل کا مکمل نمونہ تھے۔ پروفیسر ہٹی اپنی کتاب میں رقمطراز ہے

"فانی زندگی کے اس مختصر عرصۂ حیات میں عرب کی بنجر زمین اور صلاحیت نہ رکھنے والے انسانوں سے جناب رسالتمآبؐ ایک ایسی قوم تیار کی جس کے افراد تاریخ میں اس سے پہلے کبھی متحد نہ ہوئے تھے اور اس سرزمین میں ایک ایسا مذہب

قائم کیا جو کرۂ ارض کے اکثر وسیع حصوں میں پھیل گیا اور جو اب تک دنیا کی اچھی خاصی آبادی کو اپنے حلقۂ عقیدت میں لئے ہوئے ہے۔ جناب رسالت مآب نے اس خطۂ زمین پر ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھی جو متمدن اور تہذیب یافتہ دنیا کی دور دراز حدود اور خوب صورت ترین علاقوں تک پھیلتی چلی گئی۔ جناب رسالتمآبؐ امی تھے مگر وہ اپنی قوم کو ایسی تعلیم دے گئے کہ جس تعلیم کی کوئی اور مصلح نظیر پیش نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر محمد ثبات موس

ابتدائی اسلامی دور میں تعلیم

اسلام کے ابتدائی زمانے میں (وفات رسول اللہ ۶۳۲ عیسوی میں ہوئی) صرف قرآن اور حدیث کی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ چونکہ یہ تعلیم مذہبی تھی اس لئے مسجد کا بطور مکتب استعمال کرنا بہت مناسب تھا۔ مسجد کے پڑھانے والے کا نام مُعلّم تھا۔ جو مکتب ثانوی تعلیم دیتے تھے ان کا نام مدرسہ رکھا گیا اور وہاں پڑھانے والے کو مدرس کہتے تھے۔ شہر کا سب سے بڑا مکتب جہاں اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ شہر کی جامع مسجد تھی۔ اس میں نماز جمعہ ادا کی جاتی تھی۔ اس لئے اس کا نام جامع مسجد اور مکتب کی حیثیت سے جامعہ رکھا گیا۔ جامعہ کے پڑھانے کو استاد کہتے تھے۔ جس کا ترجمہ آج کل کی زبان میں پروفیسر ہوگا۔ جامعہ کے پرنسپل کو شیخ، امام یا علامہ کہتے تھے۔

بعد میں بہت اعلیٰ تعلیم کے لئے خاص درس گاہیں بنائی گئیں ان کو دارالعلوم یا

یا فنون یا دارا حکمت کہتے تھے۔

اسلامی علوم میں کوئی ۶۹۰ عیسوی کے قریب گرامر اور تفسیر کا اضافہ ہو گیا۔ اب متبوں میں قرآن، حدیث، گرامر، تفسیر اور اشعار عرب پڑھائے جاتے تھے۔ مختلف ممالک سے تُرتیب کے لئے مکہ آتے تھے۔ انہوں نے جغرافیہ کی کتابیں لکھیں اور ان کا نام المسالک و الممالک (راستے اور مختلف ملک) رکھا۔ مسجدوں اور عمارات کے بنانے کے لئے جیومیٹری کی ضرورت ہوئی۔ علم الانساب عربوں کا مشغلہ تھا۔ ہیئت اور کیمیا کی تعلیم ہوبہو یونانی کے ابتدائی دور میں شروع ہو گئی۔ انسان کی پرائیویٹ اور پبلک زندگی کو اسلامی شعار کے ماتحت رکھنے کے لئے اس وقت کے عالموں نے قرآن اور حدیث کے اصولوں کے مطابق قانون بنائے ان کا نام فقہ رکھا

بنو اُمیہ کا عہد

بنو امیہ کے ابتدائی عہد (۶۶۱ عیسوی کے بعد) میں اسلامی تعلیم میں مندرجہ ذیل مضامین شامل تھے (۱) قرآن (۲) کتابت (۳) گرامر (۴) اشعار العرب (۵) حدیث (۶) ریاضی (۷) الجبرا (۸) جیومیٹری (ہندسہ) (۹) جغرافیہ (۱۰) ہیئت (۱۱) فقہ (۱۲) اسناد - نسب نامہ (۱۳) سیرت (۱۴) تاریخ (۱۵) طب (۱۶) کیمیا - ان میں سے مختلف مضامین مختلف درجوں کے مکتبوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ قرآن - کتابت اور سادہ حساب ابتدائی درس گاہوں میں پڑھایا جاتا تھا۔ جن کا نام مکتب تھا۔ گرامر، اشعار العرب (یعنی عرب کے بہترین شاعروں کے کلام کا انتخاب۔ ان میں سے شعرا ایام جاہلیت کے تھے) الجبرا - جیومیٹری - سیرت (یعنی رسولِ خدا کی زندگی کے حالات وغیرہ) اور حدیث ثانوی درس گاہوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ جن کا نام مدرسہ تھا۔ اور باقی مضامین ریاضی، جغرافیہ، ہیئت، کیمیا وغیرہ اعلیٰ درس گاہوں میں

زیر تعلیم تھے۔

بنو عباس کا عہد

بنو عباس نے ۷۵۰ء میں تخت خلافت کو زینت بخشی تو اسلامی علمی فضا بدل گئی۔ بنو امیہ مسلمان تو تھے مگر عملی طور پر وہ اسلام کے فریفتہ نہ تھے۔ بنو عباس نے حکومت اسی زور پر حاصل کی تھی وہ اسلام کے طرف دار ہیں اور بنو امیہ اسلامی شریعت کی حمایت پورے زور کے ساتھ نہیں کرتے اس لئے تمام علوم و فنون کی ابتداء قرآن و حدیث سے کی گئی۔ مگر بنو عباس کے ابتدائی دور میں تمام دنیا کے علوم و فنون جمع کئے گئے۔ ان کے تراجم عربی میں کئے اور اس ذخیرۂ علم کو سیکھنے کے بعد مسلمانوں نے نئی کتابیں لکھیں۔ نئی ایجادیں کیں۔

اس عہد میں مسلمان عالموں نے علوم و فنون کی تقسیم اس طریق سے کر دی علوم کو دو شعبوں میں تقسیم کیا گیا۔

شعبۂ اول

وہ علوم جو عربوں نے قرآن کی وساطت سے سیکھے۔ ان کا نام العلوم النقلیہ ـ ـ ـ رکھا۔ حدیث اور مذہب اسی شعبہ میں شامل تھے۔ لسان۔ زبان لغت گرامر وغیرہ اسی شعبہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ملکی علوم مندرجہ ذیل تھے:۔

۱۔ علم التفسیر	۲۔ علم القرآت
۳۔ علم الحدیث	۴۔ فقہ
۵ علم الکلام	۶۔ نحو
۷۔ لغت،	۸۔ بیان ۹۔ ادب،

شعبۂ دوم

یہ وہ علوم تھے جو عربوں نے غیر قوموں سے سیکھے۔ ان کو عقلی علوم یا فلسفی علوم کہتے تھے۔ ان کا نام العلوم العقلیہ یا العلوم الحکمیہ رکھا ہوا تھا۔ ان کو بعض دفعہ غیر ملکی علوم بھی کہتے تھے۔ علوم العجم۔

غیر ملکی علوم مندرجہ ذیل تھے:۔

۱۔ فلسفہ

۲۔ ہندسہ (جیومیٹری اور انجینئرنگ)

۳۔ علم النجوم

۴۔ موسیقی

۵۔ طب

۶۔ السحر والکیمیا۔ اس وقت تک علم کیمیا نے اتنی کم ترقی کی تھی کہ کیمسٹری کو کیمیاگری (سونا بنانا) سمجھا جاتا تھا۔ یہ سحر کا ایک حصہ یا سحر سے ملتا جلتا علم تھا

عباسی خلفا، علماء اور فضلا کی بڑی قدردانی کرتے تھے۔ مذہب کو ہر وقت تخت کی حمایت حاصل تھی۔ مذہبی فاضلوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے جاتے تھے۔ تمام علوم کو ان سے قبل مذہب کی روشنی میں دیکھا جاتا تھا۔ ہارون الرشید (۷۸۰ - ۸۰۹ء) اور المامون (۸۰۹ - ۸۳۳ء) کے زمانے سے اسلامی علمی قنادیل گئی اور آزاد خیالی کو بڑا فروغ ہو گیا۔ فلسفہ، سائنس، طب کا دور دورہ ہو گیا۔ اب زندگی کے مسائل کو مذہب کی روشنی میں نہیں پرکھا جاتا تھا۔ بلکہ مذہب کی تشریح زندگی کے مسائل اور سائنس کے اصولوں کے مطابق کی جاتی تھی۔ یہ دور خلیفہ متوکل (۸۴۷ - ۸۶۱) کے عنان حکومت سنبھالنے تک (۸۴۷) جاری رہا۔ اس عہد میں اسلامی فنون نے بہت ترقی کی۔ اسلامی فاضلوں کی قوت مشاہدہ اور تجربہ بہت بڑھ گئی اور انہوں نے دنیا بھر کے علوم اسلامی حلقہ میں شامل کر دیئے۔ (اس عہد (۷۵۰ - ۸۴۷) کو اسلامی فراست کی تعمیر نو کا عہد کہہ

سکتے ہیں۔

جب خلیفہ متوکل (۸۴۷ - ۸۶۱) تخت پر بیٹھا تو علمی فضا بدل گئی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ مذہبی اصولوں کو کسی صورت سے زیر بحث نہ لایا جائے۔ نہ آج خیال جس صورت میں بھی موجود ہے اس پر بحث ہی نہ کی جائے۔ گویا فلسفہ اور سائنس کے مباحثوں کو روک دیا گیا۔ اس سے اسلامی علم و فضل کی ترقی رک گئی اور اسلامی فراست کی نشو و نما بند ہو گئی۔ متوکل نے آزاد خیالی روکنے کے لئے شدید قوانین بنائے۔ عوام یہ خیال کرتے تھے کہ سائنس اور فلسفہ شرک اور کفر ہے جو کوئی عقلی علوم پر کتاب لکھتا تھا تو وہ پہلے قرآن سے سند لیتا تھا۔

دسویں صدی کے وسط میں الوالحسنؒ فلسفے کو فروغ ہوا۔ اس کا فلسفۂ زندگی یہی ہے کہ قرآن اور حدیث کے علاوہ دنیا میں کامیابی کے لئے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ انسان کے لئے یہ کام ہی کافی ہے۔ یہ فلسفہ فروغِ فراست اور حصول علوم نو کے خلاف ہے۔ انسان کا ذہن اور اس کا فکر ایک حلقے کے اندر مقید ہو جاتا ہے اور ترقی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ فلسفہ تمام عالم اسلامی پہ چھا گیا اور اس کے زیر اثر تمام اسلامی ممالک میں تساہلِ فکر کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مسلمانوں نے کسی ملک میں نئی تحقیق کی فکر ہی نہ کی۔ ان کا علم قدیم دیوار کے اندر اپنے ہی نفس پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اسلام سے قوتِ نمو رخصت ہو گئی۔ اس کے خلاف یورپ نے اپنی فراست میں تجدید کے نئے نئے مسائل دریافت کئے اور یورپ والے تمام دنیا پر اپنے علم اور عقل کے زور سے چھا گئے۔

بنو عباس کے عہد میں مندرجہ ذیل شہروں میں یونیورسٹیاں موجود تھیں

۱۔ مکہ ۲۔ مدینہ ۳۔ بصرہ ۴۔ کوفہ ۵۔ یمن ۶۔ دمشق

۷۔ قاہرہ ۸۔ نیشاپور (ایران۔ عمر خیام کا وطن) ۹۔ بغداد اس وقت کی ساری دنیا سے طالب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یہاں آتے تھے۔ ان

یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل سرکاری عہدوں پر مامور ہوتے تھے۔ ملک کے فاضل اور عالم۔ مفکر اور مؤرخ انہیں یونیورسٹیوں کی پیداوار تھے۔

یورپ میں اسلامی علوم کا فروغ

یورپ میں مسلمانوں نے علم و فن کے فروغ میں رہنمائی کی اندلس میں جب وہ حکمران تھے تو وہاں پر کئی یونیورسٹیاں تھیں۔ قرطبہ، غرناطہ۔ ٹولیڈو، سول وغیرہ یہ اقامتی یونیورسٹیاں تھیں۔ جہاں استاد اور شاگرد تمام وقت رہتے تھے۔ یورپ کے تمام ممالک سے طالب علم تکمیل کی خاطر آتے تھے اور پھر اپنے وطن میں جا کر ان اسلامی علوم کو پڑھاتے تھے۔ القانون کے ترجمے کئی سو سال تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے کورس میں رہے اور یورپ نے اپنی یونیورسٹیاں بھی ان یونیورسٹیوں کے نمونے پر تیار کیں۔ میں نے شعبۂ طب کے متعلق تحقیق کی۔ تو معلوم ہوا کہ یورپ کا تمام تر موجودہ طبی علم اسلامی حکمت کا احسان مند ہے۔

اسلامی اندلس کے دار العلوم

علامہ شبلی نعمانیؒ نے ایک پُر از معلومات تاریخی مضمون "اسلامی مدارس اور دار العلوم کے عنوان پر تحریر فرمایا ہے۔ اس مضمون میں علامہ موصوف تحریر فرماتے ہیں :-

"اس بات کا ہم کو افسوس ہے کہ اسپین جو تیغ و قلم دونوں میں خلافت بغداد کا حریف مقابل تھا۔ اس خاص سلسلہ میں سب سے اخیر نمبر پر ہے۔ ہم قرطبہ (کارڈوا) غرناطہ (گریناڈا) کی شہرت اور عظمت کے منکر نہیں ہیں۔ قرطبہ کے نقشہ میں ہم ۳۸۳۷ مسجدیں، ۷۰۰ حمام، ۱۱۲۰۰۰۰ (گیارہ لاکھ ۲۰ ہزار) عام رعایا کے مکانات دیکھتے ہیں۔ قصر الزہرا کا ملبہ، مجدد قصر طاؤر روضۃ مبارک، قصر السرور، رشیق، تاج بدیع کے بلند اور زیب و زینت سے معمور عمارتیں سب ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ لیکن اس تمام وسعت میں کسی کالج یا اسکول کا ہم کو نشان نہیں ملتا۔

بے شبہ یورپ کی استادی کا فخر اسپین ہی کا خاص خاصہ ہے۔ لیکن اس
اصلاحی مدارس سے بحث ہے جس کے معنی اتنے ہی محدود ہیں کہ خاص
و تدریس کی غرض سے کوئی عمارت تیار کی گئی ہو۔ اسپین کی بجا طرفداری
مقریزی سے زیادہ کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ جو اسپین کی ایک ایک خوبی کو
مالکِ اسلامیہ کے سامنے اس دعوے سے پیش کرتا ہے کہ تم ایک کا بھی
لا سکتے ہو؟ تاہم اس محقق اور وسیع النظر مؤرخ نے صاف صاف اقرار
ہے کہ تمام اسپین میں ایک مدرسہ نہیں تھا۔ صرف مسجدوں کے صحن تھے جن میں
علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے۔"

علامہ شبلی کی اس تحریر کے دیکھنے کے بعد ایس پی اسکاٹ کی کتاب ہسٹری
دی مورش امپائر ان یورپ اور دوسری کتابیں دیکھی جائیں تو ان میں
سے کالج اور یونیورسٹیوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ جیسے کہ اسکاٹ لکھتا
"کالج اور یونیورسٹی کے داخلہ کا امتحان ڈگریاں وغیرہ وغیرہ کا انتظام
باضابطہ طریقہ سے ہوا کرتا تھا جس طرح آج کل ہوا کرتا ہے۔ وہ لکھتا
ان دارالعلوم اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر اپنے زمانہ کے چیدہ لوگ
تے تھے۔ ان کی قابلیت اور جوہر کی جولان گاہ صرف مدارس کی چہاردیواری
ہوتی تھی۔ بلکہ وہ اپنی قابلیت اور کامیابی سے اکثر کرسیٔ عدالت کے زیب
ینت ہوتے تھے۔ اور سیاسی امور میں بھی اپنا کمال دکھلاتے تھے۔ تعلیم
سند تک لازمی تھی۔ قانون کے لئے مذہبی سند کی ضرورت ہوتی تھی۔ مدرسہ
کا جزو لاینفک تھا۔ مختلف مدارس جو تمام جزیرہ نما میں پھیلے ہوئے
۔ جو یونیورسٹی قرطبہ سے ملحق تھے۔ اسی طرح تدریجی تھے جس طرح زمانۂ حال
ہیں۔ صرف قرطبہ ہی میں آٹھ سو مدارس تھے جن میں اساتذہ لیکچروں سے
سے مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو بلاتفریق مذہب و ملت تعلیم دیتے
۔ غرناطہ، اشبیلیہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیاں تو ایشیا اور افریقہ اور یورپ میں

نہایت حیرت و عظمت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ ان عظیم الشان یونیورسٹیوں
میں قرآن مجید اور اصول فقہ کے علاوہ علوم قدیمہ، ہندسہ، ہیئت، علم طب، موسیقی
نظم و نثر اور دیگر فنون بھی سکھائے جاتے تھے۔ روشن دماغ اور آزاد خیال
اندلسی مدرسوں اور کالجوں کی استادی اور منتظمی کے لئے خاص شخص کا مسلمان ہونا
لازمی نہیں تھا۔ بلکہ تمام دارومدار علمی انہماک و قابلیت پر تھا۔ جس میں یہ صفات
ہوتی تھیں وہ بے تامل ان عہدوں پر فائز ہو سکتا تھا۔ نویں صدی میں صرف
جماعت الٰہیات میں ۴ ہزار طلبا کے نام رجسٹرڈ تھے اور تمام جماعتوں کو ملا کر اوسط
حاضری روزانہ گیارہ ہزار طلبا کی تھی۔ تعلیم کی یہ نعمت و برکت کسی فرقہ یا کسی
مذہب کے لئے محدود نہ تھی۔ کالجوں کے دروازے ہر قوم کے طالب علموں کے
لئے کھلے تھے۔ یہاں جس طرح اندلس کے مسلمانوں کو تعلیم کی آسانیاں تھیں بالکل
اسی طرح ایشیائے کوچک، مصر، جرمنی اور انگلستان کے ہر مذہب و ملت کے
طلبا کو بھی میسر تھیں۔ اس زمانہ اور موجودہ زمانہ کے کالجوں کے قواعد و ضوابط
میں جو تطابق ہے۔ وہ حیرت انگیز ہے کالجوں کے نصاب، یونیورسٹی کے داخلہ کا
امتحان، ڈگریاں، انعامات، وظائف، مشاہرہ و مناظرہ کے مقابلے وہی تھے جو
آجکل ہیں۔ مختلف مدارس اور دارالعلوم کے معلم تاریخ اور سائنس کے متعلق
اپنی بہت بڑی اور قیمتی معلومات برابر شائع کرتے رہتے تھے۔

ایک جگہ اسکاٹ مشہور پادری گربرٹ کا تذکرہ کرتا ہے کہ وہ اندلس کے
شہروں کی کن کن چیزوں کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا تھا۔ لکھتا ہے:۔

دربار شاہی وہ حشم، عجیب و غریب کتب خانے لاتعداد مدرسے
اور کالج میں سائنس کے وہ آلات مہیا تھے۔ جن کو مسلمانوں ہی
کی تہذیب و تمدن اختراع کر سکتے تھے۔ مثلاً رنگین نقشے گھومنے
والے کرّے دھوپ گھڑیاں۔ آب پیما (HYDROMETRE) آلات
منظر کواکب (PARALLACTICRULE) تربیعات (QUADKANTS)

اضطراب ... غرض یہ وہ منظر تھے جنہوں نے فرانس کے اس جوان
پادری کو مبہوت کر دیا تھا۔ مگر گربرٹ کے دل نے بہت جلد کو تسلیم
کر لیا کہ مسلمانوں کی تعلیم گاہیں اور مسلمان علماء کی فضیلت علم سے
بہت سے فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ قرطبہ کی یونیورسٹی
میں داخل ہو گیا۔ (اخبار الاندلس جلد ۳ صفحہ ۴۵)
یہی فاضل مورخ دوسری جگہ لکھتا ہے کہ :۔
" اندلس کی اسلامی یونیورسٹیوں کے تمام طالب علم بلا کسی
استثناء کے سائنٹیفک مضامین پر مطالبات میں شامل ہوتے
تھے۔ معمل میں ہر روز ہزاروں آدمیوں کے سامنے تحلیل
و تجزیہ کا کام کرتے تھے (ایضاً صفحہ ۵۴)
اندلس و صقلیہ کے مدارس میں یورپ کے تمام ملکوں سے شوقین طالب علم
تحصیل علم اور شہرت کے لئے کھینچے چلے آتے تھے ۔ (ایضاً)
عبدالرحمٰن الداخل (۱۳۸ - ۱۷۲ھ) نے مسجد اعظم دو لاکھ سکہ طلائی سے تعمیر
کرائی تھی۔ اس کی عمارت میں مدرسہ قائم کیا تھا۔ گراں قدر رقم اس کے صرف کے
لئے مقرر کی اور اس کی درس گاہ میں نامی گرامی اساتذہ مقرر کئے۔ (عبرت نامہ
اندلس)
قرطبہ کے مدارس میں طلبا کثرت سے تعلیم حاصل کرنے لگے تھے ۔ امیر عبدالرحمٰن
نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ امراء کے لڑکے لڑکیاں نامی گرامی تخصات کے دربار میں
میں بعد تعلیم حاضر ہوا کریں اور علم مجلس حاصل کریں۔ جب ہوش مند ہو جائیں ۔
تو خلیفہ کے دربار شاہی میں شریک ہوں ۔ (تاریخ اسپین از پیا کالی گٹ)
اسکاٹ کے بیان کے مطابق مہمان خانے جو سلطان کی طرف سے مسجد کے قریب
تعمیر کرائے تھے۔ ان میں طلبا کے رہنے کا بھی انتظام تھا اور طلبا کے جملہ اخراجات
خزانہ شاہی سے ادا کئے جاتے تھے ۔

فرانس، جرمنی اور انگلستان نے ادبیات عربیہ کے خم کے خم چڑھائے ۔

مؤرخ مرانہ کتاب "فلسفۂ تاریخ" میں لکھتا ہے کہ مغربی علوم کے اصل ماخذ عربوں کے وہ مدارس ہیں جو اسپین میں قائم تھے اور یورپ کے ہر ملک کے طلباء ان مدرسوں کی طرف دوڑتے تھے اور ان میں علوم طبیعہ، علوم ریاضیہ اور ماوری الطبیعہ حاصل کرتے تھے۔ اسی طرح جب عربوں نے جنوبی اٹلی پر قبضہ کیا تو وہ بھی یورپ میں اسلامی علوم کے داخلہ کا واسطہ بنا ۔

جرمنی مستشرق ڈاکٹر ڈانیال ہملنے بیرگ (DANIEL HANEBERG) کا کہنا ہے کہ جب کسی عالم کا ذکر آئے کہ اس نے فلاں فلاں مسجد میں لیکچر دیا تو اس سے ہر دفعہ یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ یہ لیکچر اسی گنبد کے نیچے دیئے گئے ہوں گے جس کے نیچے لوگ نماز ادا کرتے ہیں۔ بڑی بڑی مسجدوں میں الگ بڑے بڑے ہال کمرے اور ملحقہ مکانات ہوا کرتے تھے ۔ اور اب بھی ہیں جن سے تعلیم و درس کا کام لیا جاتا تھا ۔

اڈگر سبنڈرسن اپنی کتاب "تاریخ دنیا" میں تصدیق کرتا ہے کہ اندلس کے مسلمانوں کے مدرسے یونیورسٹیاں اور کتب خانے موجود تھے ۔

ڈاکٹر فلپ کے حتی اپنی کتاب "ہسٹری آف دی عربس" میں لکھتا ہے :-

"کتنے بڑے بڑے شہروں میں ایسے درسگاہیں تھیں۔ جنہیں جامعات کہا جا سکتا ہے ۔ ان میں قرطبہ، اشبیلیہ، مالقہ اور غرناطہ کی جامعات بہت بلند پایہ تھیں۔ جامع قرطبہ میں فقہ اور قانون کے سوا ہیئت ریاضیات اور طب کے شعبے بھی قائم تھے ۔ اس جامع میں ہزاروں طالب علم شریک ہوتے تھے اور یہاں کی سندیں ملک کے سب سے زیادہ بیش قرار عہدوں کی ضمانت سمجھی جاتی تھیں ۔ جامع قرطبہ کا نصاب تعلیم فقہ، اصول۔ قانون، طب، کیمیا

فلسفہ اور ہیئت کے مضامین پر حاوی تھا۔ فسیا لیسہ
(CASTILEA) اور دوسرے ملکوں کے طالب علم اس ادارہ کے
بڑے دلدادہ تھے۔ (ہسٹری آف دی عربس ۵۶۳)
مؤرخ سیدلو کا بیان ہے کہ قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، مرسیہ اور طلیطلہ
کے بڑے مدارس اور کتب خانے قائم ہوتے۔ ان مدارس سے بڑے
کامل مدرس پیدا ہوئے، جن کی شاگردی کا فخر علماء یورپ کو ہے۔
لین پول کا بیان ہے کہ سائنس کی ہر شاخ میں تعلیم ہوتی تھی اور علم طب
نے ترقی جالینوس کے زمانے سے اس وقت تک کل صدیوں میں ہوئی
اس سے کہیں زیادہ یہاں کے علماء اور اطباء کے تحقیقاتی تجربوں سے ہوئی۔
(ان اسپین)
اسی طرح انگریز فرانسیسی اور جرمن مؤرخوں نے اندلس کے عظیم کالجوں
یونیورسٹیوں کا شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔
ایک امریکی مصنف لکھتا ہے:۔

"اس زمانہ میں قرطبہ یورپ کا علمی مرکز تھا۔ سیکڑوں یورپ کے
اہل علم تعلیم حاصل کرنے کے لئے اور تحقیق کے لئے اسلامی
اندلس کا رخ کرتے تھے اور بالآخر انہی لوگوں کے ذریعے
عربوں کے بہت سے علوم فرانس اور اٹلی پہنچ گئے۔ (تہذیب
کا ماضی اور حال ص۳۱۹)

عیسائی مؤرخ جرجی زیدان لکھتا ہے کہ:۔

"اس ملک میں ہزار دو ہزار نہیں لاکھوں مدرسے اور
مکتب اور سر بفلک کشیدہ عمارتیں تھیں۔ (تاریخ تمدن
اسلام حصہ اول)

اسی طرح انگریز فرانسیسی اور جرمن مورخوں نے اسلامی اندلس کے عظیم کالجوں

یونیورسٹیوں کا شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے -

آخر میں برصغیر پاک و ہند کے مشہور مؤرخ مسٹر جسٹس سید امیر علی اپنی تاریخ میں کیا تحریر فرماتے ہیں - وہ بھی ملاحظہ فرما لیں :-

" ہر یونیورسٹی کا اہتمام ایک ریکٹر کے سپرد تھا جو چیدہ علماء سے منتخب کیا جاتا تھا - تیرھویں صدی کا ریکٹر سراج الدین ابوجعفر المکی تھا - ریکٹروں کے تقرر میں مذہب کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا تھا - یہودی اور عیسائی عالم بھی اس عہدے پر برابر ممتاز ہوتے تھے - اسلامی ہسپانوی یونیورسٹیاں سالانہ جلسے کرتیں - جن میں عام لوگ مدعو کئے جاتے - ہر کالج کے دروازے پر یہ عبارت کندہ تھی -

" دنیا چار چیزوں سے قائم ہے - دانا کے علم سے ، بڑے آدمیوں کے انصاف سے - عابد کی دعا سے ، بہادر کی بہادری سے "

HISTORY OF SARACENS 515 - 570

شہر کیا ، کوئی چھوٹا سا قصبہ بھی مدارس اور دارالعلوم سے خالی نہ تھا - اشبیلہ ، ملاغہ وغیرہ میں یونیورسٹیاں تھیں جن میں یورپ کے عیسائی بھی بڑی تعداد میں علم حاصل کرنے کی غرض سے آتے تھے -

قرطبہ یونیورسٹی

قرطبہ یونیورسٹی کا سنگ بنیاد عبدالرحمٰن الداخل نے رکھا اس نے جامع مسجد کی بنا رکھی تھی - اس میں ایک دارالعلوم بنانا بھی تجویز کیا تھا - یہ عمارت گو اس کی موت تک تکمیل نہ پا سکی - ہشام نے اسے مکمل کیا - لیکن حکومت اموی کی طرح اس عمومی دارالعلوم کا حقیقی بانی [illegible] تھا - دوسرا بانی ہشام تھا - جس کے دور میں

یہ مسجد اور دارالعلوم کی عمارت تکمیل کو پہنچی۔ ہشام کا زمانہ اس دارالعلوم کا دورِ آغاز تھا۔ عبدالرحمٰن ثانی اور ثالث نے اسے پھیلایا اور الحکم ثانی نے اسے انتہائی عروج بخشا۔ قرطبہ یونیورسٹی کا یہ دور ایک مثالی دور تھا۔ اس زمانہ میں گو بغداد یونیورسٹی اور ازہر یونیورسٹی نے بھی حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ لیکن قرطبہ یونیورسٹی کی بات ہی اور تھی۔

الحکم نے محض یونیورسٹی کی عمارت کی تزئین پر اور اس میں پانی بہم پہنچانے کے لئے دو لاکھ اکسٹھ ہزار پانچ سو سینتیس اشرفیاں خرچ کیں۔ صرف اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے وہ عمارت کتنی بڑی ہوگی۔ جس کی آرائش و پیمائش پر کوئی تین لاکھ اشرفیاں خرچ ہوئیں۔ (عبیدہ ۲۵۳ - ۲۵۷) عمارت کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ اس کے معیارِ تعلیم کو بھی اوپر اٹھانے پر توجہ کی۔ دور دور سے بڑے بڑے علماء کو بلوایا اور بڑی بڑی تنخواہیں نذر کیں۔ ان مشہور علماء میں ابوعلی القالی صاحب الامالی بھی تھے۔ اس وقت اندلس کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز یہ یونیورسٹی تھی۔ تمام علوم و فنون پر الگ الگ تعلیم دی جاتی تھی۔

مسٹر اسٹینلی لین پول اور دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ انگریزی دارالعلوم کے جبّے اور قبائیں ROBES & GOWNS اندلس کے دارالعلوم سے لئے گئے ہیں۔

موحدین

عبدالمومن (۵۲۴-۵۵۸ھ) بڑا علم دوست تھا۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کی بڑی ترقی ہوئی۔ اسکاٹ کے بیان کے مطابق ملکِ محروسہ کے بڑے بڑے شہروں میں مدارس اور کالج قائم کئے اور علوم و فنون کی سرپرستی کی۔ دنیائے اسلام کے تمام ممالک سے نہایت قابل و فاضل علماء اس کے دربار میں جمع ہوگئے تھے۔

دارالسلطنت کی یونیورسٹی میں تین ہزار طالب علم نہایت نامور خاندانوں کے بچے تھے یہاں وہ نہ صرف علماء وفضلا کی تعلیم سے فیض یاب ہوتے تھے۔ بلکہ ان کو فنون حرب بھی سکھائے جاتے تھے (اخبار الاندلس جلد ۲ ص ۳۰۲)

یعقوب منصور (۵۸۰ – ۵۹۵ھ) نے ہرایک بڑے قصبے اور ہرایک شہر میں بازیب وزینت مسجدیں بنوائیں۔ اور ان میں مدرسے قائم کئے۔
موحدین نے ترویج وتوسیع علوم کے لئے عام مدارس قائم کئے۔

غرناطہ

جس علم وفضل اور اس کے شوق نے بنو امیہ کے دارالخلافہ کو باعث فخر بنادیا تھا اس کا کچھ حصہ غرناطہ کو وراثت میں مل گیا تھا۔ اس کے مذاکرات علمیہ وغیرہ اس زمانہ کے تمام یورپ سے بڑھ کر تھے۔

محمد الاحمر کے زمانہ میں غرناطہ میں بڑی ترقی ہوئی۔ اس نے مدارس اور کالج کھولے اور ترقی علوم وفنون کی بہت سی تدابیر اختیار کیں۔
محمد ثانی اور الناصر کے عہد میں بھی کالج اور مدرسے قائم ہوئے۔

جے۔ بی۔ ٹرنڈ (T REND) کے بیان کے مطابق اندلس اور پرتگال میں شاندار درس گاہیں قائم ہوئیں۔ جہاں یورپی دنیا سے طلبا کھنچ کھنچ کر آتے۔ طلیطلہ کی درس گاہوں میں جن ممتاز عیسائیوں نے تعلیم پائی۔ ان میں مائیکل اسکاٹ ڈینیل مورلے، ایڈیلا آف اور رابرٹس (انگلیکس مترجم قرآن) قابل ذکر ہیں۔

خلفائے فاطمیہ کے عہد میں علمی ترقیاں

ابو محمد عبداللہ المہدی نے شمالی افریقہ میں ۲۹ ربیع الثانی ۲۹۷ھ (۱۵ جنوری ۹۱۰ء) میں خلیفہ ہونے کا اعلان کیا اور "امیر المومنین" کا لقب اختیار کیا۔

خلافت فاطمیہ خلافت عباسیہ کی حریف بن کر عالم وجود میں آئی۔ اس کا دائرہ عمل مغرب میں بحر اخضر، مشرق میں دریائے فرات۔ شمال میں ایشیائے کوچک اور جنوب میں بلاد نوبہ تک وسیع ہوتا گیا تھا۔ دوسری طرف جزیرہ سسلی اور بلاد حجاز اس کے قلمرو میں داخل تھے۔ یمن میں بھی فاطمی خلیفہ کے مذہبی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہاں بھی اس کے نام کا خطبہ جاری تھا۔

اس وقت تک عباسی قلمرو میں طاہری، سامانی، صفاری، طولانی وغیرہ جتنی حکومتیں قائم ہوئی تھیں۔ وہ سب خلافت بغداد کے ماتحت تھیں لیکن فاطمی حکومت عباسی خلافت کی سیادت سے آزاد تھی۔

قیروان کے قریب ایک شہر آباد کرکے اس کا نام مہدیہ رکھا گیا اور یہی شہر اس حکومت کا دارالخلافہ بنا۔

فاطمی خلفا کی شاہانہ فیاضیوں، ان کی علم نوازی اور علما پرستی سے بلادِ اسلامیہ کے اکثر ماہرین ان کے دربار میں کھچ کر آ گئے۔ ان کے زمانے میں علم و ادب کو بڑی ترقی ہوئی۔

مؤرخ سید امیر علی کے بیان کے مطابق فاطمی علم و ہنر کے بڑے مربی تھے۔ انھوں نے دارالعلوم کتب خانے اور دارالحکمت قائم کئے۔ بڑی بڑی کتابیں اور سائنس کے متعلق آلات بہم پہنچائے۔ ان علمی خزانوں تک ہر ایک کی رسائی تھی۔ ہر ایک ان سے مستفیض ہو سکتا تھا۔ لکھنے کا سامان مفت دیا جاتا تھا۔

مغربی یونیورسٹیوں میں جو گون گریجوایٹوں کو دیئے جاتے ہیں وہ بالکل اسی طرح کے ہیں جس طرح کا لباس یعنی خلعت پہن کر پروفیسران علمی مجلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ دو لاکھ ستاون ہزار اشرفی سالانہ کا بجٹ، پروفیسروں اور آ...ی افسروں کی تنخواہیں، تعلیمی سامان اور علمی آلات پر خرچ کئے جاتے تھے اور بطریق شائستہ رعایا سے وصول کئے جاتے۔ ہر علمی شاخ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ علم ہیئت کو شائع کرنے کے لئے رصدگاہیں بنی ہوئی تھیں۔ ایشیا اور ہسپانیہ سے بڑے بڑے عالم اور سائنس دان حکمرانانِ مصر کے عہد کو زینت دینے کے لئے بلائے گئے تھے۔[1]

فاطمین کے دور میں شاعروں کی بڑی عزت قدر کی جاتی تھی۔ کوئی شاعر ان کے دربار سے محروم نہ جاتا۔ ان کی فیاضیوں سے مالا مال ہو کر واپس جاتا۔

فاطمین نے عام اسلامی تمدن کی ترقی میں جو اس زمانے میں رائج تھا، وافر تعداد میں مسجدیں بنوائیں جن میں جامع ازہر، جامع حاکم، جامع اقمر آج تک باقی ہیں۔ ان میں مدرسہ گاہیں قائم کیں۔ جن میں مختلف علوم فقہ، حدیث، تفسیر، تاریخ، نحو، صرف، ہیئت، نجوم، طب، طبیعات وغیرہ کی تعلیم تمام رعایا کو بلا امتیاز مذہب و ملت دی جاتی تھی۔ ایک ایسا کتب خانہ قائم کیا جس کی نظیر دوسری ریاستوں میں نہ تھی۔[۱]

فاطمی خلفا ہمہ وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ ان کے محل کے کتب خانے میں زمانہ بھر کی کتابیں جمع ہو جائیں۔ ان کی تڑپ کا نتیجہ تھا کہ ان کے کتب خانے میں بعض کتابوں کے غیر معمولی نسخے موجود تھے لیکن پھر بھی وہ دیگر نسخے خریدنے پر خوشی سے آمادہ رہتے تھے۔[۲]

قاہرہ

جوہر صقلی نے بغداد کے نقشہ پر قاہرہ کی داغ بیل ڈالی۔ اس شہر کی ابتدا ۲۴ جمادی الاول ۳۵۹ھ (۶ اپریل ۹۷۰ء) کو ہوئی اور ۷ رمضان المبارک ۳۶۱ھ (۲۲ جون ۹۷۰ء) کو تعمیر مکمل ہوئی۔ معزلدین اللہ ۷ رمضان المبارک ۳۶۲ھ کو قاہرہ آیا اور اسی تاریخ سے قاہرہ دارالخلافہ بنا۔

کرشین پرائس لکھتا ہے کہ قاہرہ کا اسلوب تعمیر ایک قصری شہر اور دارالحکمت کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا اور اسے چاروں طرف ایک دیوار سے جس میں آٹھ دروازے تھے محفوظ کیا گیا تھا۔ قصر خلافت مرکز میں تھا جس پر سے ایک وسیع فوجی جولان گاہ سامنے نظر آتی تھی۔ اس کے قریب ہی عظیم جامع الازہر تھی

---

[۱] تاریخ فاطمین مصر۔ [۲] تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ ص۹

جو اسلامی دینیات کی مشہور درس گاہ بن گئی اور آج تک اس کی یہ شہرت برابر قائم ہے۔ فاطمی سلطنت کی دولت قاہرہ میں بھی چلی آتی تھی۔ جہاں خلفائے خزانوں کے علاوہ فنون کے بڑے مخزنوں کا انتظام بھی کیا تھا۔

پندرھویں اور سولھویں صدی کے یورپین سیاح بھی قاہرہ کو دیکھ کر گمان کرتے تھے کہ روضۂ رضوان یا باغ جناں میں داخل ہوتے ہیں۔ مسجدیں، کالج، شفاخانے اور بڑے بڑے ہوٹل اور سرائیں بے شمار تھیں۔ چار جامع مسجدیں تھیں اور ان کی شان و شوکت دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ [۵]

قاہرہ میں بے شمار کالج تھے۔ شاہی کتب خانے میں نہایت خوش خط اور کمال خوب صورتی سے مجلد کی ہوئی ایک لاکھ قلمی کتابیں تھیں۔ جو طلبا کو بلا تامل مستعار دی جاتی تھیں۔ [۶]

ادبی نشستیں

فاطمی خلفاء اکثر و بیشتر علمی مباحثے منعقد کیا کرتے تھے۔ جہاں اکادمیوں کے پروفیسر جمع ہو کر اپنے اپنے شعبۂ علوم کے مطابق جماعت وار تقسیم ہو جاتے۔ مثلاً منطقی، فقہی، ماہرین ریاضی ماہرین طبیعات اور یہ سب اپنی خلعت یا مخصوص علمی لباس میں ملبوس ہوتے تھے۔ [۱]

لغت و ادب

<u>عربی لغت و ادب سے فاطمیوں کا اہتمام اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ وہ</u>

[۵] تاریخ اسلام امیر علی [۶] تاریخ اسلام امیر علی

[۱] A SHORT-HISTORY OF SARACUS, BYS. AMIR ALI P. 614.

دفتری کاررعایئوں تک میں عربی کی صحت کا خیال رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے دفتری کارندوں کی انشا پردازی کی صحیح تہذیب کے لئے ماہر ادیب مقرر کر رکھے تھے جو ماہر عربی سمجھنے والے کلرکوں اور انشا پردازوں کی عبارتوں کو درست کرتے اور عربی نہ سمجھنے والوں کو عربی انشا نویسی کی تربیت دیتے تھے۔ (تاریخ ادب عربی)

مصر میں عہد فاطمی میں بارہ نقیب تھے جن کو نقباء المعلمین کہا جاتا تھا۔ ان کا صدر نقیب النقباء کہلاتا تھا۔ اس عہدہ پر صرف اسی شخص کا تقرر کیا جاتا تھا جو اسماعیلی تعلیمات، قوانین و آئین کا وسیع علم رکھتا تھا۔ اور ملک کے تمام علمی و تعلیمی امور اس شخص کے سپرد کر دیئے جاتے تھے۔ الخطط[1]

خلفائے فاطمیین کے اسراف بیش بہا جواہرات و نوادرات نیز اسلحہ و کتب کی ذخیرہ اندوزی کے بارے میں جو کچھ سنا گیا ہے وہ بے نظیر ہے پھر جس تزک و احتشام سے خلفائے قاہرہ میلے عیدین اور دیگر جشن مناتے تھے۔

فاطمیین قاہرہ کی محفلوں میں شاعری کی بڑی مانگ اور کھپت تھی اور اس میدان میں شعراء کے باہمی مقابلے ہوتے تھے۔ چنانچہ اس حکومت کے آخری دور میں بلند پایہ مصری شعراء کی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ جو صنعت بدیع اور لفظی آرائش میں بغدادی شعراء کے آخری دور کے اسالیب کی اتباع کرتے تھے۔ اسی طرح یہاں جو نثر نگار پیدا ہوتے وہ بھی اسی پر رجحان کرتے ہوتے تھے۔

پانچویں صدی کے وسط میں قاہرہ تہذیب و تمدن کے اوج کمال پر پہنچ چکا تھا۔ اس کی آبادی انتہائی گنجان ہو چکی تھی۔ علم و ادب اور دیگر فنون کے ماہروں کی وہاں کثرت ہوتی تھی۔ اقوام گذشتہ اور قرون ماضیہ کا متروکہ سرمایہ وہاں جمع ہو گیا تھا۔ (تاریخ ادب عربی)[2]

---

[1] بحوالہ تاریخ تعلیم و تربیت [2] بحوالہ تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ ص ۱۲۹

مصر میں فاطمی حکومت قائم ہونے کے فوراً بعد مدرسے قائم کئے گئے جہاں اسماعیلی مذہب کی تعلیم دی جانے لگی۔ ان مدارس کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھ گئی۔ الازہر کی زیر نگرانی کثرت سے مساجد تعمیر کی گئیں۔ دارالعلم قائم کیا گیا اور محلات میں باقاعدہ درس دیا جانے لگا۔ ان مقامات پر وزراء داعی الدعات اور دیگر اہل علم اسماعیلی مذہب کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ [۱]

فاطمیوں نے اپنے عہد عروج میں محلات کے لئے ایک خاص نصاب تیار کرایا۔ ان کے عہد میں محل شاہی میں ایک مدرسہ تھا۔ جہاں امراء کے لڑکے اس مقصد کے لئے تعلیم پاتے تھے کہ خلفاء کی ملازمت کے قابل ہو جائیں (الخطط ج ۱) [۲]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتب فروشی کی دوکانوں نے عربوں کے پبلک سیلون کی جگہ لے لی۔ کتب فروش صرف تاجر ہی نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ عموماً صاحب علم حضرات ہوا کرتے تھے۔

المقریزی قاہرہ کے سوق الوراقین کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ شائقین علم کی بڑی دل پسند جگہ تھی۔ جہاں اکثر طلبا اور اہل علم جمع ہوتے تھے۔ (الخطط ج ۲) [۳]

فاطمی خلفا اپنے شعراء پر انعام و اکرام کی ایسی فیاضانہ بارش کرتے تھے کہ جس سے مذہب کی تبلیغ میں ان کی جد و جہد دو چند ہو جاتی تھی اگر کوئی اچھا شاعر خلیفہ کی شان میں قصیدہ لکھتا اور اس میں اس کی فیاضی کا ذکر نہ ہوتا یا اس سے مذہب کی تبلیغ نہ ہوتی تو بڑی شرم کی بات تصور کی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے فاطمی شعراء کا کلام اسماعیلی مذہب کا بہت بڑا ماخذ ہے۔ [۴]

---

[۱] تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ ص ۱۸۵۔ [۲] تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ ص ۱۸۹

[۳] ۔ تاریخ ملت جلد ہفتم

[۴] بحوالہ تاریخ و تعلیم و تربیت اسلامیہ ص ۲۹۰

قرار الحضرۃ

ایک جماعت قاریوں کی تھی جن کو حکومت سے تنخواہ ملتی تھی۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ مجلس اور جلوس کے وقت خلیفہ کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت کریں۔

ابو تمیم معد المعزلدین باللہ

۳۴۱ - ۳۶۵ ھ ۹۵۳ - ۹۷۵ء

سید امیر علی کے بیان کے مطابق بنی فاطمہ کے مخالف مؤرخ کی نظر میں معزلدین باللہ دانا، متعمد، شجاع، بہادر، عالم اور سائنس اور فلسفہ کا ماہر اور علم و ہنر کا مربی تھا۔ درحقیقت وہ مغرب کا "مامون" تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں شمالی افریقہ ترقی و تہذیب کے انتہائی درجہ پر پہنچ گیا۔ (تاریخ اسلام)

"المعز ایک لائق اور قابل آدمی تھا۔ وہ عربی، یونانی، بربر اور مختلف سوڈانی زبانیں حتیٰ کہ سالوانک SALVONIC زبان تک جانتا تھا"

اس کے دورِ خلافت میں فاطمیوں کا سپہ سالار ابوالحسن جوہر صاحب صقلی کا غلام تھا (صاحب بھی غلام تھا)، وہ شجاع و بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت بلند پایہ ادیب اور اہل قلم بھی تھا۔ فارس اور سجلماسہ وغیرہ کی فتوحات کے بعد اس نے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ معزلدین باللہ نے اسے خلعتِ شاہانہ سے سرفراز کر کے مصر فتح کرنے کے لئے بھیجا۔ ۳۵۸ھ میں جوہر صقلی مصر میں داخل ہوا۔ جہاں اس کا بڑا شاندار استقبال ہوا۔ جمعہ کے دن جامع عمرو بن عاص میں فاطمی خلیفہ کا خطبہ پڑھا۔ معزلدین کے قاضی القضاۃ محمد بن نعمان نے اسماعیلی فقہ پر متعدد کتابیں لکھیں۔

ابو منصور نزار العزیز باللہ

(۳۶۵ - ۳۸۶ھ ، ۹۷۵ - ۹۹۶ء)

عزیز کریم الطبع اور شجاع تھا۔ اس کی طبیعت داد و دہش کی طرف مائل تھی۔ علمی ذوق کا خلیفہ تھا۔ وہ بڑا ادیب اور فاضل تھا۔ ابو منصور الثعالبی نے اس کے چند اشعار اپنی مشہور کتاب یتیمۃ الدہر میں نقل کئے ہیں (ابن خلکان ۲/۱۵۲) عہد فاطمی میں یہی وہ پہلا حکمران ہے جس نے حکومت کی طرف سے جامع ازہر مدرسہ قائم کیا۔

کتب خانہ

عزیز نے قاہرہ میں ایک کتب خانہ "خزائن القصور" کے نام سے قائم کیا۔ جو اپنے زمانہ کا بے نظیر کتب خانہ تھا۔ اس میں فقہ، نحو، لغت، حدیث، تاریخ، ہیئت، کیمیا وغیرہ کی سولہ لاکھ کتابیں تھیں۔ اس تعداد میں کتابوں کے سارے مکررات بھی شامل ہیں۔ جرجی زیدان لکھتا ہے کہ ان مکررات کو نکالنے کے بعد بھی کتابوں کی تعداد دس لاکھ سے کم نہ تھی۔ ان میں چھ ہزار کتابیں صرف ریاضی اور ہیئت کی تھیں۔ یہاں خلیل بن احمد کی "کتاب العین" کے تیس نسخے تھے۔ جن میں ایک خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ ایک سو نسخے ابن درید کی تصنیف "الجمہرہ" کے تھے۔ تاریخ طبری کے بارہ نسخے اور قرآن مجید کے دو ہزار چار سو نسخے مشہور خطاطوں کے لکھے ہوئے تھے۔ کتب خانوں کی بیشتر کتابوں کا خط نہایت پاکیزہ اور ان کی جلدیں سونے اور چاندی کے نقش و نگار سے مزین تھیں۔ کتابوں کے علاوہ یہاں زمین کے دو کرے بھی محفوظ تھے۔ ایک چاندی کا تھا جس پہ تین ہزار دینار صرف ہوئے تھے۔ دوسرا پیتل کا جو بطلیموس کے ہاتھ کا بنا ہوا

تھا۔

اس کتب خانے میں کتابوں کی تعداد اس قدر زیادہ بڑھ گئی تھی کہ اس کے متعلق عجیب وغریب روایات مشہور تھیں۔ اگرچہ یہ مستند متنازعہ فیہ ہے۔ ابوشامہ شنی سنائی باتوں کی بنیاد پر کتابوں کی تعداد بیس لاکھ بتاتا ہے (الروضتین) اور المقریزی نے مختلف تعداد بتائی ہے۔ لیکن اس کا رجحان اس طرف ہے کہ سولہ لاکھ کتابیں تھیں (الخطط)

ابوشامہ اور المقریزی متفق ہیں کہ یہ کتب خانہ عجائبات عالم میں سے تھا اور یہ کہ قرون وسطیٰ کے اسلامی کتب خانوں میں بے نظیر تھا (الروضتین[۲])

اس عظیم الشان کتب خانے کی عمارت اس قدر وسیع تھی کہ اس میں چالیس کمرے اور ہر کمرہ میں اٹھارہ ہزار کتابوں کے رکھنے کی گنجائش تھی (اسلامک کلچر جلد ۱۲ - ۱۹۳۸ء سرف ص۱۹۵)[۱]

خلیفہ کے وزیر یعقوب بن کلس کے حکم سے شاہی خزانہ سے بے دریغ صرف کی گئی اس میں ترجمہ اور تالیف کے لئے بڑی تعداد میں علماء بلوائے گئے تھے۔

یعقوب بن کلس

فاطمیوں کے دور عروج میں یعقوب بن کلس سب سے ممتاز وزیر تھا۔ وہ اپنے قصر میں ہر ہفتہ اور پنجشنبہ کے روز ایک بہت بڑی مجلس منعقد کرتا تھا۔ جس میں اس کی تالیفات سنائی جاتی تھیں۔ اس مجلس میں قضاۃ، فقہا، اساتذہ

---

[۱] بحوالہ تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ ص۹۱-۹۰

قرأت و تجوید، محدثین، شعراء اور ممتاز ا[illegible]

میں بھی ملازمین کی ایک بہت بڑی تعداد وقت آن کے نسخوں اور حدیث، فقہ اور

اور دوسرے علوم و فنون کی کتابوں کی نقل کرنے پر مامور تھی۔ علماء، شعراء، ادباء

فقہا، متکلمین اور ماہرین فن کی بڑی بڑی تنخواہیں مقرر تھیں۔ یہ ارباب فن

اسی محل کے ایک مخصوص حصہ میں سکون قلب کے ساتھ علمی کاموں میں منہمک رہتے

تھے۔

الازہر میں یعقوب بن کلس ایک بڑے مجمع میں الرسالۃ الوزیریہ کا درس دیا کرتا

تھا۔ وہ ایک بڑی ضخیم کتاب تھی جس میں فقہ اسماعیلی کے اصول درج تھے۔ جو اس

کے مؤلف نے اماموں سے سنے تھے اور اس مجمع میں علمائے دینیات، قضاۃ اور

محدثین بھی آتے تھے اور پھر اس تعلیم کو عوام میں پھیلاتے تھے۔ (الخطط ۲/۳۴۱)

یعقوب کے گھر پر کئی کاتب کام کرتے رہتے تھے اور مختلف مضامین کی

نقل کرتے تھے۔

۳۸۰ھ کے ماہ رمضان میں عزیز نے باب الفتوح کے قریب ایک بڑی جامع

مسجد کی بنیاد ڈالی۔ اس کا نام جامع ازہر کے مقابلہ میں "جامع انور" رکھا گیا۔ لیکن

یہ جامع الحاکم کے نام سے مشہور ہوگئی۔

"فاطمۃ الذہب" کی تعمیر نے خلیفہ عزیز کے دور کو خاص طور پر ممتاز بنا دیا

اس عمارت کی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ خلفائے فاطمیہ کی مجلسیں کس شان و شوکت

کی حامل ہوتی تھیں۔[۵]

ابو علی الحسین حاکم بامر اللہ بن العزیز باللہ

۳۸۶ - ۴۱۱ھ ۹۹۶ - ۱۰۲۱ء

حاکم بڑا علم دوست تھا۔ نجوم کا عالم تھا۔ اس کے عہد میں قاہرہ علوم و

فنون کا مرکز تھا۔ لیکن مؤرخ سید امیر علی کے مطابق اس پر دیوانگی کے آثار

[illegible] نافذ کرتا۔ مگر جب ہوش و حواس میں ہوتا
تو علم و [illegible] سعی و کوشش کرتا۔ چنانچہ اس نے شام اور مصر میں
[illegible] میں ہوئیں۔ وہ مشہور منجم اور ہیئت دان ابن

[illegible] کے مطابق حاکم متلون طبع اور غیر مستقل مزاج تھا۔ اس
[illegible] عجیب ہیں۔
[illegible] کی حیثیت: حکمت کے مقابلہ پر قاہرہ میں اپنے قصر سے متصل
[illegible] کے نام سے عظیم الشان عمارت بنوائی۔ جس میں ہر فن کی کتابیں جمع
کی گئیں۔

حاکم نے ۱۰ جمادی الآخر ۳۹۵ھ کو دار العلم یا دار الحکمت کا افتتاح کیا۔

افتتاح سے قبل ایسی تیاریاں کی گئیں کہ اس کے سامنے دور مامون الرشید کا دار الحکمت
ماند پڑ جائے۔ تمام عمارت کو سجایا گیا اور اعلیٰ قسم کا خوش نما فرنیچر مہیا کیا گیا۔
دروازوں اور غلام گردشوں پر قیمتی پردے لٹکائے گئے اور ضروری عملہ کا انتخاب
کیا گیا۔ شاہی محل میں جس قدر کتابیں تھیں انہیں دار العلم میں منتقل کرنے کے
احکام نافذ کئے گئے اور دار العلم میں بیش بہا ذخیرۂ کتب جمع ہو گئیں جو بادشاہوں
ہی کے پاس ہو سکتا تھا۔ مختلف مضامین پر کتابیں جمع ہو گئیں جن میں بیشتر مصنفین
کے ہاتھ ہی کی لکھی ہوئی تھیں۔ یہاں درس و تدریس کے لئے حفاظ، ہیئت داں
ماہرین علم اللسان اور اطبا مقرر کئے گئے۔ ان لوگوں کو بڑی آسانیاں مہیا
کی گئیں۔ مثلاً قلم، کاغذ، دوات مفت مہیا کئے جاتے تھے۔ بغیر تخصیص
ہر شخص کو کتب خانے میں آنے کی اجازت تھی۔ چنانچہ طلبا کا ایک مجمع رہا
کرتا تھا۔ کچھ درس میں شرکت کے لئے آتے تھے اور کچھ کتابوں کی نقلیں
کرنے اور مطالعہ کے لئے آتے تھے (الخطط ص ۴۵۸ د ۴۰۹ ج ۲ ص ۳۳۴)

مورخ جرجی زیدان نے تاریخ التمدن الاسلامی جلد ۳ میں لکھا ہے کہ
دارالعلم کے اخراجات کے لئے ایک رقم خطیر مقرر کی گئی۔ اس کتاب خانہ کا
جو فرش بنایا گیا تھا وہ نہایت خوب صورت تھا۔ اس کو جواہرات سے
مزین کیا گیا اور اس کے دروازے پر پردے لگائے گئے تھے اور ان دروازوں
پر پہریدار خدام مقرر تھے۔ لیکن یہ دروازے بلا تخصیص ہر ایک کے لئے
کھلے تھے اور اس کے قیام سے بھی غرض وہی تھی جو بیت الحکمت کے قیام
سے تھی۔ یعنی لوگ آئیں اور درس مطالعہ تالیف کی برکات سے متمتع ہوں۔
دارالعلم کی عمارت اہل علم کے مناظرہ کے لئے مخصوص تھا۔ جس میں
خود حاکم بھی شریک ہوتا اور جس کسی کی تقریر یا قابلیت اس کو پسند آتی

اس کو خلعت اور انعام دیتا۔

جرجی زیدان کا بیان ہے کہ دارالعلم میں اکثر مناظرے ہوا کرتے تھے۔
جو عموماً حجت اور نزع پر منتج ہوتے تھے۔ (تاریخ التمدن الاسلامی)
کتب خانے کے ضوابط کے مطابق قاہرہ ہی کے باشندے کتابیں مستعار
لے جا سکتے تھے (محمد فرید وجدی)
الازہر ۳۷۸ھ میں جامعہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور ۳۹۵ھ میں الحاکم
نے دارالحکمتہ کی بنیاد ڈالی۔ ان دونوں اداروں کے لئے تنخواہ دار طلباء اور
لائبریرین کا تقرر ہوا۔ (الخطط ج ۲)
مسجد میں طب کا بھی درس ہوا کرتا تھا۔ عبداللطیف بغدادی سے روایت
ہے کہ میں جامع ازہر میں صبح و شام درس دیا کرتا تھا اور دوپہر کو ایک
عالم طب آتے جو طب پر درس دیا کرتے تھے۔ (ابن ابی اصیبعہ ج ۲ ص ۲۰۴)
الحاکم نے جامع ازہر میں ۴۰۰ھ میں ایک جدید عمارت تیار کرنے کا
حکم دیا اور جامع ازہر کے ضروری مصارف کے وقف کا فرمان جاری کیا۔ جس

کی مالیت ایک ہزار سو ستر دینار سالانہ کی تھی۔ اس کے علاوہ روشنی کے لئے ۲۷ قندیلیں چاندی کی بنوائیں۔

مصر میں فاطمی کتب خانے کے متعدد کمرے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں فاطمی کتب خانے کی کوئی مکمل فہرست نہ تھی۔ بجائے اس کے ہر کمرہ کے دروازہ پر اس کمرہ کی کتابوں کی فہرست لٹکی رہتی تھی (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام) ابن القوطی ص۴) لیکن ابوالقاسم الجرجانی وزیر نے ۴۳۵ھ میں حکم نافذ کیا کہ کتب خانہ کی ایک پوری فہرست تیار کی جائے۔ اس

کام پر القاضی ابو عبداللہ القاضی اور ابو خلف الوراق کا تقرر ہوا (اخبار الحکمار القفطی ص۳)

فاطمی کتب خانہ کا مہتمم علی بن الشبشتی (متوفی ۳۹۰ھ) تھا۔ وہ العزیز باللہ کے امرائے دربار میں سے تھا۔ اور متعدد کتابوں کا مصنف تھا۔ (ابن خلکان ج ۱ ص۴۸)

حاکم کو مسجدوں کی تعمیر اور ان کی آرائش سے بڑی دلچسپی تھی ان میں بڑی شاندار وہ مسجد ہے جو اس کے نام سے اب تک جامع الحاکم کہلاتی ہے۔ اس مسجد کی بنیاد حاکم کے باپ عزیز نے رکھی تھی عزیز کے انتقال کے بعد حاکم نے ۴۰ ہزار دینار کے مصارف سے ۳۹۳ھ میں اس کی تکمیل کی اور مزید ۵۰۰۰ دینار خرچ کرکے اس کی چٹائیاں، قندیلیں اور پردے مہیا کئے۔ چار بڑے بڑے چاندی کے فانوس بھی لگائے گئے۔ اس کی حفاظت اور مرمت کے لئے بڑی املاک اس پر وقف کی گئی یہ مسجد قاہرہ کے باب النصر شمالی دروازے کے قریب ہے (مقریزی جلد ۴ ص ۵۵ - ۵۶)

اسی سال یعنی ۳۹۳ھ میں ایک اور مسجد موضع راشدہ میں بنائی گئی

تھی۔ جہاں اکثر حاکم جمعہ کی نماز پڑھا کرتا تھا۔ اس محراب کا رُخ بہت ہی احتیاط سے علی بن یونس نے معین کیا۔ جو حاکم کے زمانے کا بہت بڑا ہیئت دان تھا۔ اس کا نام "مسجد راشدہ" رکھا گیا (تیسری مسجد جو حاکم نے بنوائی وہ جامع مقس کہلاتی ہے۔)

مسیحی کہتا ہے کہ ۴۰۴ھ میں حاکم نے ان تمام مسجدوں کو گنتی کا حکم دیا جن کو غلہ، سرکاری امداد نہیں ملتا تھا۔ یا جن کو غلہ کو ملتا تھا مگر کافی نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ ایسی مسجدوں کی تعداد آٹھ سو تیس تھی اور ان کو ماہانہ نو ہزار دو سو بیس درہم کی ضرورت ہے۔ حاکم نے اس رقم کی منظوری دیدی۔ اس کے بعد ۴۰۵ھ میں بڑی املاک، قاریوں، فقیہوں، موذنوں، پانی کے حوض، دوا خانوں اور اموات کے کفنوں کے لیے وقف کی گئی (مقریزی)

الحاکم نے ۴۰۳ھ میں ایک علمی مجلس منعقد کی۔ جہاں علم الحساب، منطق فقہ، ادب، طب و دیگر علوم کے علماء مدعو کئے گئے۔ وہاں انھوں نے بہت سے مسائل بحث مباحثہ کے بعد طے کئے۔ اور جلسہ کے اختتام پر خلیفہ نے ان کو خلعت اور انعامات سے نوازا۔ الفاطمیوں فی مصر ص۱۳۵)

جامع حاکمی

اس جامع کی بنیاد العزیز باللہ نے ڈالی تھی۔ مگر تکمیل حاکم کے عہد میں ۴۰۳ھ میں ہوئی۔ تکمیل کے بعد حاکم نے حکم دیا کہ جامع ازہر کے تمام مدرس جامع حاکمی میں چلے جائیں اور وہیں حلقۂ درس قائم کئے جائیں۔ نیز جامع ازہر کی تمام کتابیں بھی منتقل کرنے کا حکم دیا۔

جامع حاکمی میں ایک لاکھ روپیہ کی قیمتی جا نماز اور مصلے تھے۔ بارہ سو بتیوں کا عظیم الشان جھاڑ لگوایا گیا تھا۔

جامع حاکمی جامع ازہر کی نسبت زیادہ وسیع تھی۔ جامع ازہر میں تیرہ ہزار گز بور یئے کا فرش بچھتا تھا۔ اور جامع حاکمی میں چھبیس ہزار گز فرش بچھتا تھا۔

ڈاکٹر اورنگا بیڈو کا کہنا ہے کہ اسے سب سے پہلی یونیورسٹی کہنا چاہیئے۔ اس میں ریاضیات، نجوم، طب اور مابعد الطبیعات کی تعلیم دی جاتی تھی۔[1]

ابن الہیثم

ابو علی محمد ابن الحسن ابن الہیثم فاطمی دور کا مشہور سائنس دان تھا۔ اسے یورپ والے ALHAZAM کہتے ہیں۔

دار الحکمت میں ابن الہیثم بھی علمی تحقیقات میں مصروف تھا بہ نسبت ہیئت اور خالص ریاضی کے اس کو طبیعات سے زیادہ دلچسپی تھی۔[2]

حاکم بامر اللہ کے عہد میں ابن الہیثم نے دریائے نیل کے پانی کی زیادتی اور کمی کو اعتدال پر رکھنے اور طغیانی کو مفید طور پر استعمال کرنے کے لئے ایک اسکیم تیار کر کے خلیفہ کی خدمت میں پیش کی۔ خلیفہ کو یہ اسکیم پسند آئی اور ابن الہیثم کی خدمات لی گئیں۔ لیکن اس کام میں کامیابی نہیں ہوئی۔ جب اس نے حاکم کے سامنے اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے میں اپنی ناکامی کا اظہار کیا تو وہ آپے سے باہر ہوگیا اور سخت خفگی کا اظہار کیا۔ ابن الہیثم نے پاگل کی صورت اختیار کرلی۔ حاکم کے حکم سے وہ پاگل خانہ بھیج دیا گیا۔

حاکم کے انتقال کے بعد ابن الہیثم اپنے مصنوعی پاگل پن کو خیرباد کر کے ہوش میں آیا اور جامع ازہر کے کتب خانہ میں اپنا وقت صرف کرنے لگا۔

---

[1] قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات حصہ اول [2] قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات حصہ اول ص ۱۸۹

ابنِ یونس

ابن یونس اپنے عہد کا سب سے بڑا منجم اور ماہر مثلثات تھا۔ مصر میں فاطمی فرماں رواؤں نے اس کو ہیئت کی تحقیق کے اچھے مواقع عطا کئے۔ [۱]

ابن یونس قاہرہ کی رصدگاہ میں مشاہدات فلکی میں مصروف تھا۔ جو اس زمانہ کے بہترین آلات سے مزین تھا۔ خلیفہ العزیز (۹۷۵ - ۹۹۶ء) کے حکم سے قریب ۹۹۰ء میں کام شروع کیا اور الحاکم کے زمانہ میں ۱۰۰۷ء میں کام ختم کیا۔ ان مشاہدات کا نام "الزیج الکبیر الحاکمی" ہے۔ اس میں قدیم و جدید کسوف و خسوف اور کے واقعات تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ [۲]

یہ زیج اس قدر مفید اور مستند ثابت ہوئی کہ اکثر لوگ تقویم کے جوابات کے نکالنے میں اس سے مدد لیتے تھے [۳]

ابن یونس نے علم المثلثات میں مثلثوں کے حل کے متعلق نئے مسائل پر بحث کی۔

عمّار

ابوالقاسم عمار ابن علی الموصلی الحاکم کے زمانہ میں مصر میں تھا۔ مسلم اطبا رِ چشم میں سب سے زیادہ جدت پسند محقق تھا۔ اس کی کتاب المنتخب فی علاج العین میں امراض چشم اور ان کے علاج بھی بڑی وضاحت کے ساتھ ترتیب وار بتائے گئے ہیں۔ [۴]

---

[۱] قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی خدمات حصہ اول [۲] قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی خدمات حصہ اول صفحہ ۱۸۹ [۳] تاریخ فاطمین [۴] قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات حصہ اول صفحہ ۱۰۲۔

ابوالحسن

ابن رضوان ابوالحسن علی ابن رضوان متوفی ۴۵۳ھ حاکم بامراللہ کا افسر الاطباء تھا۔ تصانیف شرح کتاب الفرق جالی نوس، کتاب الصنا عنہ رسالہ فی علاج الجذام، مقالہ فی الرد علی افراہیم وابن زرعہ فی الاختلاف الملل کتاب فی الرد علی الرازی فی العلم الالٰہی واثبات الرسل [1]

ناصر خسرو

ناصر خسرو مصر کے ایرانی سیاح نے زبانِ فارسی میں آٹھویں فاطمی حکمران کے زمانہ کے مصر کے حالات اور طریقۂ زندگی بیان کئے۔ ساتھ ہی وہاں کے آثارِ قدیمہ اور انواع واقسام کے اقوام کی نسبت بھی دلچسپ معلومات شائع کئے [2]

جامع ازہر

رمضان ۳۶۱ھ (جون ۹۷۰ء) شہر قاہرہ کی تعمیر کے بعد سپہ سالار جوہر نے ایک مسجد بنوائی جس کا نام "جامع ازہر" رکھا۔ جسے اس نے شیعہ مذہب کی تبلیغ واشاعت کا مرکز بنایا۔

جامع ازہر جامع ابن طولون کے بعد مصر کی قدیم ترین مسجد ہے اس کی

---

[1] حسن المحاضرہ سیوطی [2] قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات حصہ اول ص ۲۰۶

وسعت بھی تمام جوامع سے زیادہ تھی۔ اسے جامع کبیر بھی کہا جاتا تھا۔

جامع ازہر کے مکمل ہونے کے کچھ عرصہ بعد اس میں درس و تدریس جاری کیا گیا۔

(د) مسجد جو قاہرہ کی شہر پناہ کے اندر بنائی گئی تھی اب مشہور زمانہ جامع ازہر ہے۔ فاطمی خلفاء کے عہد میں اور ان کے بعد سے آج تک بھی بہت تبدیلیاں مرمتیں اور اضافے ہوتے رہے ہیں۔ یہ مسجد کوئی دو ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کی مسافت عرض میں دو سو فٹ اور طول میں ۲۵۰ فٹ تھی۔

المعز نے اصل میں یہ مسجد جامع کے لئے نہیں بنائی تھی۔ بلکہ اسے اپنے فوجیوں کی عبادت گاہ کے طور پر بنایا تھا۔ اس کے جانشین ۹۷۵ - ۹۹۶ ھ نے اسے عبادت گاہ کے ساتھ ساتھ مقام درس و تدریس بھی بنا دیا۔ [1]

جامع ازہر کو جوہر نے شیعہ تبلیغ و اشاعت کا مرکز بنا رکھا تھا۔ مگر ابن کلس نے عزیز کو مشورہ دیا کہ "جامعہ ازہر" کو دعوت شیعہ کے مرکز کے بجائے ایک یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ جہاں علوم عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم دی جائے۔ خلیفہ نے اسے شرف قبولیت بخشا اور جامع کی وائس چانسلری کے فرائض ابن کلس کو تفویض کئے۔ یہ واقعہ ۳۷۸ھ (۹۸۸ء) کا ہے۔ [2]
(ابن خلدون)

اس واقعہ کے چند سال بعد اس کے جانشین الحاکم نے جو "دار الحکمۃ" کا بانی تھا۔ متعدد دکانیں، عمارتیں، سرائیں، کوٹھیاں اور مکانات ان دونوں درس گاہوں اور مسجد کے لئے وقف کر دیئے۔ اس وقف نامہ کی دستاویز کو المقریزی نے اپنی کتاب میں نقل کیا (الخطط ج ۲) [3]

---

[1] اسلامی فن تعمیر (انجمن ترقی اردو علی گڑھ) ص۱۱۹ ، [2] بحوالہ تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ ص۱۹۰-۱۹۱ [3] تاریخ ادب عرب ،

عزیز باللہ کی خلافت کے زمانہ میں الازہر کی روشنی دور تک پھیلنے لگی تھی۔ اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا تھا کہ تمام عالم اسلامی سے جس قدر ممکن ہو سکے۔ زیادہ سے زیادہ مجتہد فقیہوں کو بلائے تاکہ وہ مذہب شیعہ کی حمایت اور ہوا خواہان خلافت کی تائید کریں۔ اس نے ان کے لئے معقول مشاہرے دیئے اور موزوں مکانات بنوانے کا حکم دیا تھا۔ [1]

یعقوب کلس نے اساتذہ وعلماء کی تنخواہیں مقرر کردیں اور جامع ازہر کے قریب ان کی رہائش گاہ کے لئے مکانات تعمیر کرا دیئے۔ یہ فقہا ہر نماز کے بعد فقہ شیعہ کا درس دیتے تھے۔ وعظ کی مجلسیں قائم کرتے اور قدرے بحث وتحقیق کی شکل بھی اختیار کر لیتے۔ لغوی، نحوی مسائل میں بھی حصہ لیتے اور مجلس مناظرہ منعقد کرتے تھے۔ [2]

صبح الاعشیٰ میں تحریر ہے کہ جامع ازہر کے قریب فقیہوں کے لئے دار الجماعت تعمیر کروایا گیا جس میں لوگ نماز ظہر کے بعد جمع ہوتے اور عصر تک مذاکرات کیا کرتے تھے۔ عزیز کے حکم سے اس کے وزیر یعقوب بن کلس نے فقیہوں کے لئے وظیفہ اور آزوقہ بھی مقرر کیا تھا۔ [3]

خلیفہ العزیز نے یعقوب بن کلس کو چند علماء کے متعلق ہدایات کر دی تھیں کہ ان میں ہر ماہ ایک ہزار دینار تقسیم کئے جایا کریں۔ [3]

اساتذہ کا جب تقرر ہوتا تو انہیں باقاعدہ خزانہ سرکار سے تنخواہ ملا کرتی تھی یا ان اوقاف سے جو درس گاہ کے لئے مخصوص کر دیئے جاتے تھے۔

عہد فاطمی کے اساتذہ کے متعلق نہایت مفید تاریخی دستاویز ہم تک المقریزی اور القلقشندی کے توسط سے پہنچی ہے جس میں مختلف قسم کے ملازمین کی تنخواہیں مذکور ہیں۔ [4]

---

[1] حاشیہ [2] بحوالہ عہد فاطمی میں علم وادب [3] بحوالہ تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ [4] بحوالہ تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ۔

فاطمی عہد حکومت (۳۶۵ھ/ ۹۷۵ء) میں سرکاری داعی الدعاۃ علی ابن القاضی النعمان الازہر میں اسماعیلی فقہ کا درس دیتا تھا اور یہیں اس نے اپنے والد کی تصنیف "المختصر" لکھوائی۔

وزیر نامزد ہونے کے بعد یعقوب بن کلس اپنے گھر میں ادبا، شعراء اور علمائے دینیات کی مجلس منعقد کیا کرتا تھا۔ ان سب کو وظائف دیتا تھا اور پھر یہ لوگ مسجد عمرو بن العاص میں اسماعیلی عقائد کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

۳۷۸ھ/ ۹۸۸ - ۹۸۹ء میں العزیز نے ۳۵ فقہا کو الازہر کے قریب رہنے کے لئے مکان دیا اور ان کے گزارے مقرر کئے۔ ہر جمعہ کو ظہر اور عصر کے درمیان ان کا جلسہ منعقد ہوتا تھا اور ان کا صدر ابو یعقوب قاضی الخندق درس و تدریس کا نگران تھا۔

جامعہ الازہر کو فروغ دینے کے لئے فاطمین کے دور دراز شہروں سے علماء اور فقہا طلب کئے اور ان کی معقول تنخواہیں مقرر کیں۔ فقہ اور وعظ و نصیحت کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے کثرت سے طلباء جمع ہونے لگے۔ جوں جوں ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ ازہر میں بھی توسیع ہوتی گئی اور اس کا رقبہ ۱۲۰۰۰ مربع میٹر تک پہنچ گیا۔ اور پہلے کے مقابلہ میں دگنے سے زیادہ ہو گیا۔ اس کے ستون بھی وقتاً فوقتاً تعداد میں بڑھتے گئے جس زمانہ میں وہ بنی ستونوں کی تعداد بہتر (۷۲) تھی اور اس کے دروازے نو تھے۔

ابتدائی زمانہ میں فقیہوں کی تنخواہیں مقرر نہ تھیں۔ عزیز کے حکم سے اس کے وزیر یعقوب بن کلس نے ان کی تنخواہوں کا موازنہ تیار کیا اور مسجد کے پہلو میں ان کے رہنے کے لئے مکانات بنوائے۔

جرجی زیدان۔ تاریخ الحدیث ص ۲۱۳ - ۲۱۴

معز کے آخری زمانے سے لے کر صلاح الدین ایوبی کی ابتدائی حکومت

تک یعنی تقریباً دو سو سال ازہر شیعی مدرسہ رہا۔

قاہرہ کی جامع ازہر تمام دنیا میں مشہور ہے۔ کیونکہ اسی میں وہ مشہور معروف مدرسہ ہے۔ جو مشرقی علوم کا آخری مسکن ہے۔ کسی زمانہ میں بارہ ہزار طلباؔ علوم مختلف کی بلادِ اسلامیہ سے آکر تعلیم پایا کرتے تھے۔ اور اس وقت بھی یہی حال ہے۔ یہ جامع سب سے پرانی یونیورسٹی سمجھی جاتی ہے۔

مصر کے متعلق مؤرخ لین پول نے جامعہ ازہر کا حال لکھا ہے:۔

"یہاں آج بھی بے شمار طلبا اسلامی دنیا کے اطراف سے آکر جمع ہوتے ہیں۔ گھانا سے لے کر ملایا کی ریاستوں تک سے طلبا آتے ہیں اور ہر ملک کے طلبا کے لئے مخصوص رواق ہیں۔ جامع ازہر میں یہ سب طلبا نصاب تعلیم کے مختلف شعبوں میں فاضل شیوخ سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ طلبا کے لئے یہ رعایت ہے کہ کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ بلکہ ان کے قیام و طعام کا انتظام بھی اوقاف سے ہوتا ہے مفت تعلیم کی یہ نہایت قابلِ قدر مثال ہے۔ جس سے غریب سے غریب بھی مستفیض ہوتے ہیں۔ خواہ کسی قوم سے ان کا تعلق ہو۔ کوئی زبان ہو اور کسی طبقے سے تعلق ہو۔

ڈاکٹر گستاؤ لیبان کا بیان ہے کہ:۔

"میں نے جس وقت مسجد ازہر کے مدرسہ میں استادوں کو پڑھاتے ہوئے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ کسی جادوگر کی انگوٹھی نے مجھے یورپ کے کسی تیرھویں صدی کے دار العلوم پہنچا دیا ہے۔ دینی اور دنیاوی تعلیم کا ملا جلا ہونا، درس کا طریقہ۔ طلبا کی جماعتوں میں تقسیم اور ان کے وہی حقوق اور مراعات یہاں بھی موجود ہیں ایک بڑے دالان میں جہاں مصلی ہے۔ ہر ایک استاد چٹائی پر بیٹھا ہے اور اس کے گرد طلاب کا دائرہ ہے۔ جو سیاہ خفتان پہنے ہوتے اور

سعید عمامہ باندھے ہوئے اور قلم ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں۔
مسجد ازہر میں بہت سے غریب طالب علموں کو مسجد کے اوقاف سے کھانا اور رہنے کے لئے حجرہ ملتا ہے۔ یہ سب طلاب علم کے شائق اور محنت پر آمادہ ہوتے تھے۔ بعضوں کا یہ شوق دور دراز اسلامی ملکوں سے مثلاً ہندوستان اور مراکش سے یہاں لایا تھا۔
ازہر میں تین سو استاد اور دس ہزار طالب علم ہیں جو کل ممالک اسلام سے آئے ہوتے ہیں۔ یہ دار العلوم بہت بڑا مرکز مذہبی اور علمی تعلیم کا ہے اور اس میں سے بڑے بڑے باوقعت علماء وغیرہ نکلتے ہیں۔
علاوہ درس قرآن و تفسیر، صرف و نحو، ادب، معنی و بیان و منطق وغیرہ پڑھائے جاتے ہیں۔ (از تمدن عرب)
علامہ شبلی نعمانیؒ نے جامع ازہر کو ۱۳۰۹ھ-۱۸۹۲ء میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے سفرنامے میں تحریر کرتے ہیں:-
"... آج تو یہ حالت ہے کہ کثرت طلباء کے لحاظ سے تمام دنیا کی کوئی یونیورسٹی اس کی ہمسری نہیں کر سکتی ہے... ہر قسم کے طلبا کی تعداد جن کو جامع ازہر سے تعلق ہے، بارہ ہزار سے متجاوز ہے۔ ہر ملک کے طالب علموں کے لئے الگ الگ بالاخانے ہیں جن کو یہاں "رواق" کہتے ہیں۔ جن جن ملکوں مثلاً شام، مغرب، جزیرہ، عراق بخارا، خراسان، افغانستان، ہندوستان وغیرہ کے طالب علموں کے لئے رواق بنے ہوئے ہیں۔ وہاں لوگ ہمیشہ سوداگروں کے ذریعہ سے سالانہ رقم بھیجتے ہیں۔ جو ان طلبا کو جیب خرچ کے طور پر دی جاتی ہے۔
اس مدرسہ کا مجموعی خرچ دو تین لاکھ روپے سالانہ سے کم نہیں

۱۹۴۰ء میں علاوہ اس رقم کے سرشتہ تعلیم سے دولاکھ کی رقم منظور ہوتی ہے : ۱

ڈاکٹر نجیب العزالدین کا بیان ہے کہ :-

"قدیم عرب نو ادر اور تاریخ اسلام کے محافظ کی حیثیت سے الازہر کو عرب مسلم ثقافت میں ایک مقام حاصل ہے منگول حملے کے وقت سے الازہر مسلم دنیا میں تعلیم کا سب سے بڑا مرکز رہا ہے اور اس کی چار دیواری میں اسلام کی وسیع و عریض دنیا کے ہر گوشے سے طلبا جمع ہوتے رہے ہیں۔ نپولین کے مصر آنے کے قریب زمانے میں شمالی افریقہ، زیبہ، ملک سینگال و مالی ساحل اور بلاد مقدسہ مکہ مدینہ، یمن، شام، عراق، ترکی، کردستان، خراسان، افغانستان، جاوا، بورنیو اور ہندوستان کے طلبا الازہر میں موجود تھے"

علوم دینیہ کے حاصل کرنے، لغت عربیہ کے سیکھنے کا بھی ایک بہت بڑا ذریعہ تھا۔

عربی لغت کے زندہ کرنے میں ازہر کی برکتیں صرف مصر اور اس کے متعلقہ اضلاع ہی تک محدود نہیں رہیں۔ بلکہ دوسرے تمام بلاد اسلامیہ میں بھی پھیلیں اس مدرسہ میں ترکی، مغرب، یمن، زنجبار، ہند، افغانستان وغیرہ جیسے دور دراز شہروں سے طلبا آتے۔ اس کی طرف لوگوں کی توجہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہوگئی کہ یہاں تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ طعام، لباس، مکان وغیرہ کے مصارف بھی دینا نہیں پڑتے۔ ان سب کا بار ازہر ہی اٹھاتا ہے۔ مختلف زمانوں کے سلاطین اور امراء نے اس کے لئے وسیع جائدادیں وقف کیں۔ جن کی سالانہ آمدنی ۱۹۱۱ء میں بیس ہزار گنی تھی۔ ۱

عرفان صدیقی

تعلیم کی نظریاتی اساس اور مسلم مفکرین

تعلیم کے افادی پہلو کو کسی بھی دور میں نظر انداز نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ افادی پہلو ہمیشہ متنوع اور رنگا رنگ افکار کی آماجگاہ بنا رہا۔ ہر قوم نے اپنے مخصوص ماحول اور سیاسی و معاشرتی پس منظر میں اس افادی پہلو کا تعین کیا۔ کبھی تعلیمی افادیت کا دائرہ وقت کے محدود تصور کے گرد گھومتا رہا۔ کبھی تعلیمی ترقی کا انحصار مادی حوالے سے جانچا گیا اور کبھی تعلیم کو تعمیر کردار کا اہم اور کارگر حربے کے طور پر اختیار کیا گیا۔ تاہم اس امر سے انکار نہیں کہ مخصوص نقطہ ہائے نظر کے تحت تعلیم کو سماجی نظام میں ہمیشہ ایک نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔

اسلامی حوالے سے تعلیم کے عمل کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلم معاشرے دین کا محوری نقطہ ہے اور اسلام کی ساری تعلیمات اسی سرچشمہ سے پھوٹتی ہیں۔ ہمارے ہاں تعلیم ایک جزوی یا ذیلی سا شعبہ نہیں بلکہ پورے نظام حیات کا دیباچہ ہے۔ فلاسفہ اسلام نے تعلیم کو ہمیشہ اسی تناظر میں رکھا اور اسے صرف بعض مہارتوں پر دسترس حاصل کرنے یا کائنات میں ایک مؤثر مقام حاصل

کرنے کے لئے مادی طور پر توانا بننے کی کوشش قرار نہیں دیا۔ ان کے ہاں تعلیم ایک مستقل مکتب فکر نظر آتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کو عام طور پر انفرادی کردار کی عظمت، سائنسی شعور وادراک کی نشوونما، تسخیر کائنات کے عظیم محرک اور قرب خداوندی کے لئے ایک اہم ذریعے کا درجہ دیتے ہیں۔

ان تمام مفکرین نے تعلیم کی نظریاتی اساس پر بڑا زور دیا ہے اور نصاب سازی کے تمام مراحل میں ان اساسی نکات کو اولین اہمیت دینے کی تلقین کی ہے۔ اسلام نے انسان اور کائنات کے حوالے سے جو نظام حیات تجویز کیا ہے، وہی ایک زبردست قوت محرکہ ہے جو ہمارے تعلیمی نظام کو نظریاتی اساس فراہم کرتی ہے۔ یہی نظریاتی اساس ہمارے قومی جسد میں گردش کرنے والے لہو کا درجہ رکھتی ہے

انبیاء الہامی ہدایات کے پیغام بر تھے اور تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں بطور معلم مبعوث ہوئے۔ ان معلمین نے جہاں آسمانی ہدایات کو عام کیا وہاں تعمیر انسانیت کا فرض عظیم بھی سرانجام دیا۔

حضرت علامہ ابن قیمؒ ایک جگہ لکھتے ہیں (مفتاح الصادق)

"اگر نبوت یعنی الہامی ہدایات کا سلسلہ بند نہ ہوتا تو دنیا علم نافع سے محروم رہتی۔ نہ اور اخیر انجام پاتے نہ معاش میں کوئی بہتری ہوتی نہ ضابطہ مملکت کا قیام عمل میں آتا۔ انسان جانوروں اور درندوں اور ان خونخوار کتوں کی طرح ہوتے ہیں جو ہر دم ایک دوسرے پر بھونکتے رہتے ہیں۔ دنیا ایک جسم ہے اور نبوت اس کی روح ہے"

گویا نظریاتی اساس استوار کرنے کا کام اور انسان کو راست فکری کے ساتھ ساتھ نظم وضبط کا خوگر بنانے کا عمل ان عظیم انسانوں کے توسط سے جاری ہوا جو نبوت کے منصب پر فائز ہوئے۔

ایک مغربی مفکر ایمرے ریوز (AMERY REVES) کا کہنا ہے۔

"اگر حضرت موسیٰؑ کے احکام عشرہ توریت میں موجود نہ ہوتے تو انگریزی

مثبت کارٹا بھی وجود میں نہ آتا اور میگنا کارٹا نہ ہوتا تو دوسرا انگریزی دستور
قانون حقوق بھی وجود میں نہ آتا اور اگر قانون حقوق نہ ہوتا تو پھر اقوام
متحدہ کا چارٹر بھی وجود میں نہ آتا "

"ابو یوسف یعقوب ابن اسحق کندی کو پہلا مسلم فلسفی خیال کیا جاتا ہے۔ طب فلسفہ
علم حساب، منطق، موسیقی، ہندسہ اور نجوم کے عالم اس مفکر نے برسوں بصرہ کے
مدارس میں تعلیم دی۔ کندی کو ارسطو کا سب سے بڑا شارح خیال کیا جاتا ہے۔ کندی
کی اکثر و بیشتر تالیفات، عقلیات سے تعلق رکھتی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ
کندی کا رجحان سائنسی علوم کی طرف تھا۔ لیکن ان افتاد طبع کے باوجود کندی نے
اپنے فلسفۂ تعلیم میں نظریئے اور مقصد کو بڑی جگہ دی اور اخلاقیات کو مرکزی مقام
دیا۔ کندی کے تین اشعار ہیں ۔

فان الغنی فی قلوب الرجال	وان التعزز بالانفس
وکائن تری من اخی عسرة	غنی وذی ثروة مفلس
ومن قائم شخصه میت	علی انه بعد لم یرمس

(اصلی استغنا استغنائے قلب ہے اور حقیقی بزرگی نفس کی بزرگی ہے ۔
اکثر لوگ جو بظاہر مفلس نظر آتے ہیں۔ نفس کے اعتبار سے غنی اور اکثر ایسے لوگ
جو بظاہر دولت مند نظر آتے ہیں۔ لیکن دل کے مفلس ہیں۔ بہت سے انسان ہیں جو
دیکھنے میں زندہ اور قائم ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان کا جسم مردہ ہے ۔

چوتھی صدی کے ربع الاول میں فارابی کے فلسفیانہ افکار کا سکہ چلتا تھا۔
اس درویش صفت مفکر کی ساری زندگی فقیرانہ تھی۔ اگرچہ وہ خود مملکت عقل
وخرد کا حکمران تھا۔ فارابی کو علم کی سب سے بڑی فضیلت قرار دیتے ہوئے
عقل کے لئے سب سے بڑا محرک قرار دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ خیر و شر کے امتیاز
کے لئے صرف عقل کافی ہے۔ وہ عقل جو خدا نے عطا کی ہے اور جسے علم جلا بخشتا ہے
گویا علم کا ایک بڑا مقصد تمیز خیر و شر ہے۔ وہ لے فلسفۂ نفسیات کا نچوڑ الالفا

میں پیش کرتا ہے :-

"تمام حکومتوں میں حکومت وہ ہے جو دینی رنگ لئے ہوئے ہو"

پانچویں صدی عیسوی میں ابن سینا نے بڑا نام پایا۔ سائنس طب اور دوسرے علوم میں ابن سینا کی لافانی خدمات دنیا بھر کے اصحاب علم کی نظر میں ہیں۔ وہ اپنی کتاب "الشفاء" میں علوم کی تین بڑی قسمیں بتاتے بتاتے ہیں۔

۱۔ اعلیٰ علوم :-

یہ علوم کی برتر شاخ ہے جو مادہ سے بحث کرنے کی بجائے حکمت اولیٰ اور مابعد الطبیعات کا احاطہ کرے۔

۲۔ علوم دینوی

یہ وہ علوم ہیں جو طبیعات اور اس کے تابع ہیں۔

۳۔ علوم وسطیٰ

وہ علوم جو بیک وقت طبیعات اور مابعد الطبیعات سے بحث کرے۔ علوم کی اس تقسیم و تخصیص پر بعد میں آنے والے مفکرین نے تنقید بھی کی اور خود ابن سینا نے استفادات کو بھی مدت بنایا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا تصور علم بھی اپنے مدارادراک سے ماورائی حقیقتوں کو سموئے ہوئے ہے۔

امام غزالی کے فلسفہ تعلیم پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مختصراً ان کے ہاں چار بڑے مقاصد تعلیم نظر آتے ہیں۔

۱۔ معرفت حشر و نشر
۲۔ تعمیر کردار
۳۔ معرفت الٰہی
۴۔ حصول رضائے الٰہی

اگرچہ حصول رضائے الٰہی ترتیب میں آخری مقصد ہے۔ لیکن امام غزالی نے اسے سب سے بڑا مقصد قرار دیا ہے۔ وہ نصاب تعلیم کو بھی اپنے چار مقاصد پر استوار کرتے

ہیں۔

علامہ ابن رشد کو عام طور پر ارسطو کی منطق کا پرستار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ منطق ہی کو انسانی سعادت کا ماخذ و مصدر خیال کرتے ہیں۔ وہ حریت فکر کے قائل اور عقل کی فرمانروائی کے داعی ہیں۔ انہوں نے امام غزالی کے بعض نظریات پر تنقید بھی کی۔ ان کی اس فکری انداز نے یورپ کو متاثر بھی کیا۔ ایک انگریز مفکر جان رابرٹسن کا کہنا ہے:۔

"ابن رشد بلحاظ اثر مسلمان مفکرین میں سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ اس نے یورپی افکار و نظریات کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔"

ابن رشد اس فکری پس منظر کے باوجود علم کو ازلی حقیقتوں سے متصادم نہیں کرتا۔ بلکہ سائنسی طرز تفکر کو ان حقیقتوں کے اثبات کے لئے استعمال کرتا ہے۔

آٹھویں صدی ہجری کے آخر اور نویں صدی ہجری کے عشرہ اول میں ابن خلدون کے فلسفیانہ افکار سامنے آئے۔ علامہ ابوزید عبدالرحمن محمد بن خلدون عمرانیات سیاسیات اور تعلیمات کے بہت بڑے ماہر تھے۔ "کتاب العبر" ان کی تعلیمی نظریات کی مظہر ہے۔ آپ نے علم کو خوراک کی طرح انسان کی طبعی ضرورت قرار دیا ہے۔ ابن خلدون نے علوم کو واضح اقسام "عقلیہ اور نقلیہ" میں تقسیم کیا۔ انہوں نے اپنے ہم مذہب افراد پہ لازمی قرار دیا تھا کہ ان کی ایک خاص مجلس ہو جس میں وہ اوقات معینہ پر جمع ہوں۔ اور کوئی اجنبی اس میں شریک نہ ہو۔ اس میں وہ علوم پر بحث کرتے تھے۔ ان کے مباحثے اکثر علم نفس، حس محسوس، عقل معقول پر مشتمل ہوتے۔ لیکن سب سے زیادہ توجہ کتب الہیہ اور تنزیلات نبویہ کے اسرار و مسائل پر دی جاتی۔ وہ علوم الہیہ کو منتہائے مقصود خیال کرتے تھے۔ کیونکہ یہی علوم حقیقت ازلی و ابدی کے مظہر ہیں۔ جو تکمیل انسانیت کے لئے ضروری ہیں۔

ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں ابن عربی کے نظریات سامنے آئے جو صوفیانہ خیال کے مظہر اس مسلم مفکر کی تصنیفات ۲۵ کے لگ بھگ ہیں۔ ابن عربی کے افکار کو زیادہ تر

صوفیانہ روایت کے تسلسل میں دیکھا جاتا ہے۔ علوم کے ضمن میں ابن عربی حقیقت اعلیٰ کے ادراک کو ضروری خیال کرتے ہیں اور اس کے بغیر کسی بھی علم کو کامل خیال نہیں کرتے۔ تربیت فکر و نظر ان کے فلسفہ تعلیم کی جڑ ہے اور وہ تعمیر کردار کے اعلیٰ مقاصد کا حصول ضروری خیال کرتے ہیں۔ ایک جگہ وہ خیالی مکالمے کے انداز میں اپنے نفس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں :-

"اے نفس میں تجھے اپنے حال پر نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک کہ تو اپنے حالات کتاب الٰہی اور سنت رسولؐ کے مطابق نہ کرے اگر تیرے خیالات ان کے مطابق ہیں تو تیرے لئے سلامتی ہے اور اگر نہیں تو میں تجھ پر مہربانی اور رحم کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ تھوڑی دیر میرے ساتھ اصحاب صفہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے حالات پر غور کر اگر قرآن کے منتہائے مقصود سے پیچھے رہ جاتے تو تیرے لئے آگ زیادہ بہتر ہے۔"

دور قدیم کے ان مسلمان مفکرین کے نظریات کے ساتھ ساتھ نہایت مختصر طور پر علامہ اقبال کا ذکر بھی ضروری ہے۔ کیونکہ انہوں نے مسلم فلسفہ حیات کو انتہائی دقیق نظر نظر سے پرکھا اور پھر اپنے افکار کی بنیاد بنایا۔ وہ نظریئے اور مقصد اعلیٰ کو نہ صرف تعلیم بلکہ ہر انسانی شعبہ لئے زندگی میں بے حد اہم خیال کرتے ہیں۔ روحانیت کی ترقی اور افکار عالیہ کی ترویج ان کے خیال میں انسان کو عظمت سے ہمکنار کرتی ہے۔ وہ مولانا روم کے اس شعر کو علمی سوچ کی بنیاد بناتے ہیں۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

ان کا فلسفہ فکر و نظر ایک ایسے مثالی انسان کی تخلیق چاہتا ہے جو زمین پر نیابت الٰہی کا صحیح حق ادا کر سکے۔ علامہ اقبال انسان کا مطالعہ تین حوالوں سے کرتے ہیں۔

۱- اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ
۲- اللہ تعالیٰ کا خلیفہ

۳- آزاد شخصیت کا امین

ان کے بڑے بڑے مقاصد تعلیم یہ ہیں:-

۱- حیات انسانی کو ممکنہ رفعتوں سے ہمکنار کرنا۔

۲- صالح سے صالح تر معاشرہ کی تخلیق کرنا۔

۳- انفرادی اور قومی خودی کی تعمیر و حفاظت کرنا۔

مسلم مفکرین کے افکار کا یہ نہایت ہی اجمالی سا خاکہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے محدود اور مختصر حوالے سے ان کی سوچ یا ان کی خدمات کا ہمہ پہلو جائزہ مکمل نہیں ہوتا۔ لیکن ہم اس نتیجے پر ضرور پہنچتے ہیں کہ ان اصحاب علم و دانش نے تعلیم کے بارے میں بڑا ہی متحرک، تعمیری اور وسیع المشرب رویہ اختیار کیا ہے۔ ہم اس جائزے کو سمیٹتے ہوئے طائرانہ نگاہ ڈالیں تو تعلیمات کے ضمن میں بڑے بڑے نکات ہمارے سامنے آئیں گے

۱- علم کا تصور لا محدود ہے

۲- علم صرف مادی حقیقتوں کے ادراک کا نام نہیں بلکہ اعلیٰ نظریات اور مقاصد سے وابستگی کا بڑا محرک بھی ہے۔

۳- علم اگر عقل و خرد کا تقاضہ کرتا ہے تو ایمان و یقین کے والہانہ پن سے بے نیاز بھی نہیں ہوتا۔

۴- علم تسخیر کائنات کے بے کراں جذبے کو مہمیز کرتا ہے

۵- علم جوہر انسانیت ہے جس کی نشو و نما لازمی ہے۔

۶- علم تنگ نظری کی بجائے وسیع المشربی سکھاتا ہے۔

اس ساری بحث کا حاصل اس قدر ہے کہ ہمیں اپنے مخصوص علمی اور تاریخی پس منظر میں تعلیم کے عمل کو ایک ایسا شخصیت ساز اور متحرک عمل بنانا چاہیئے۔ جو مادی اور اخلاقی دونوں پہلوؤں سے مکمل اور بھرپور ہو۔ ہم کسی طور بھی اپنی اقدار اور اپنی روایات کے حوالے سے ایک ایسے تعلیمی نظام کے روادار نہیں ہو سکتے جس کی نظریاتی اساس محدود ہو یا جو سرے سے نظریاتی اساس پر استوار ہی نہ کیا گیا ہو۔

سید قدرت نقوی

ابنِ خلدون کا نظریۂ تعلیم

رویہ کو تعلیم و تعلم میں بنیادی حیثیت حاصل ہے مگر خود رویہ کی بنیاد انسان کے رجحانِ طبع اور زندگی کے مختلف تجربات پر ہے۔ یہ تجربات عملی بھی ہوتے ہیں اور فکری بھی۔ مطالعہ اور مشاہدہ اور غور و فکر کا سرمایہ تہ در تہ شعور و لاشعور کا حصہ بنتے رہتے ہیں اور آخر میں انسان کا رویہ اس کے تجربات اور سرمایۂ فکر سب تحلیل ہو کر یک جان ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک ٹھوس اور سائنسی نظریہ وجود میں آتا ہے جو اس حد تک قابلِ عمل ہوتا ہے کہ اس کے لئے بس ذرا سے محرک کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو جب بھی زندگی کے گوناں گوں انقلابات و تجربات سے استفادہ کا موقع ملا ہے۔ اس نے اپنے رویہ کو ان سے ممتزج اور تمام تر اس کو ان کے تابع کر کے سیکھنے کا کرب آمیز سفر ابتہاج اور انتہا اہتزازی کیفیت میں طے کیا ہے۔ مگر ہوا ہمیشہ یہی ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی بساطِ ذات کے مطابق زندگی کی گوناں گونیت کا متلاشی ہوا تب ہر چیز اور وقت کے ہر موڑ نے اس کی طرف اتنا ہی کچھ منعکس کیا جتنا اس کے شعور کے پرتو نے چاہا۔

یعنی بات ظرف، مقدار عطا اور وقت کی کروٹ تینوں کی ہے۔ گر سیکھنے کے اس عمل سے
ہر شخص گذرتا ہے۔ مگر کوئی آگ کے اس دریا میں مردانہ وار کرتا ہے اور ڈوبتا
ابھرتا، ہر آنچ اور ہر شعلہ سے محترق اور مستنیر ہوتا۔ کچھ پالینے کے مقام تک پہنچتا
ہے اور کوئی لمحے واتے کرتا، کنارے کنارے دوڑتا الاماں الاماں پکارتا چلا
جاتا ہے۔ اس کا تجربہ نہ صرف ناقص بلکہ نہ زندگی آمیز ہے اور نہ زندگی آموز
ان میں پہلا پیروں کے آبلوں کو سرمایۂ حیات بناتا ہے
اور دوسرا عرق جبیں سے بھی استکراہ کرتا ہے۔ مگر سیکھنے کا عمل سبھی سکھانے
کا عمل تب بن سکتا ہے۔ جب تجربہ میں زندگی کی آمیزش ہو۔ اسی آمیزش سے
آموزش شروع ہوتی ہے۔ ابن خلدون ایک ایسا ہی مفکر اور معلم ہے جس
نے زندگی متحرک رہ کر گذاری ہے۔ وہ تجربات کی بھٹی سے نکل کر اور غور و فکر
کے سفر سے گذر کر سکھانے کے مقام پر فائز ہوا ہے۔ تعلیم و تعلم کی تاریخ پر نظر
ڈالئے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو فکر و علم کے مقامات عالی پر فائز نظر آتے
ہیں۔ ان کی تدریس کے طریقے بھی خاصے عملی اور زندگی آمیز نظر آتے ہیں۔ مگر
ان کا کھوکھلا پن اس وقت ظاہر ہوتا ہے۔ جب ان کے موضوعات کو دیکھا جائے
یہی وجہ ہے کہ ان کے ارشادات غور و فکر کے دروازے کھولتے ہوئے صرف
نظریات سے بحث کرتے ہیں اور زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ بند کر کے صرف اکیڈیمی
کی فضا میں بحث کے پر تولتے اور کھولتے نظر آتے ہیں۔ ابن رشد اور ابن عربی
بھی فلسفے کے باقیات کے جوڑ توڑ میں ایسے نظر آتے ہیں۔ مگر زمین اور کائنات
کے تاریخی ارتقا سے صرف نظر کر نے والے معلمین در حقیقت خیالی سیر بیچنے والے
والے فاتحین ہیں۔ خلدون ان سب میں تنہا وہ شخص ہیں جن کے تجربات کی
گونا گونی انقلابات زمانہ سے ہم آہنگ ایک ایسے فلسفہ میں ڈھلی جس نے کائنات
اور تاریخ کائنات کے طلبا اور اساتذہ کو ایک نئے موڑ سے آشنا کیا۔ خلدون

تاریخ کے اساتذہ کا امام تصور کیا گیا اور تاریخ میں اس کے فلسفہ اور نظریہ کی
اہمیت مسلمہ ہو گئی۔ تیونس کا رہنے والا یہ مفکر اندلس اور مصر میں درس و تدریس
کے میدان میں اس وقت اترا جب اس کا سیاسی، معاشرتی اور علمی شعور کمال
تک پہنچ چکا تھا۔ قید و بند کی صعوبتیں اور سیر و سفر کی وسعتیں اس کے تجربات
میں جگہ پا چکی تھیں اور اسے بصیرت و عرفان حاصل ہو چکے تھے اس نے اپنے
مفکرین کے خلاف تعلیم کو ہر شخص کا حق قرار دیا اور کہا کہ یہ انسان کا فطری تقاضا
ہے اس لئے فرد کو اس کے حق سے محروم کرنا گویا اس کے فطری تقاضوں اور
انسانیت کی راہ کو مسدود کرنا ہے۔ تعلیم ہر شخص کا حق ہوتے ہوئے انسانی معاشرہ
میں اہم ترین حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز انسان کی سرشت
میں داخل ہو اس پر کسی قسم کی پابندی نہ تو قائم رہ سکتی ہے اور علم کی پیاس کسی حد بندی اور رکاوٹ کو قبول کر سکتی ہے۔ ابن خلدون
کے تجربات نے اسے سکھایا کہ انسان حیوان ہوتے ہوئے غور و فکر کی صلاحیتوں سے
نوازا گیا ہے جو اسے اصلاح احوال و معاشرتی قواعد و ضوابط اور معاشی ضروریات
کی تکمیل کی راہ پر ڈالتی ہے۔ اسی طرح عمرانیات کا چوکھٹا تیار ہوتا ہے۔
جس میں انسان کا عکس کامل پوری طرح جاذب نظر ہو کر ظاہر ہوتا ہے۔ ابن
خلدون غور و فکر کو کسی خاص وقت کی عطا قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ
سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے اور اسی سے علوم و فنون کے چشمے پھوٹتے ہیں
اور علم و حکمت کے سوتے نکلتے ہیں۔ انسان کی فکری صلاحیتیں دوسروں سے
استفادہ کر کے تاریخ اور اپنے عصری تجربوں کو اپنی گرفت میں لیتی ہیں۔
ماضی اور حال کے مشاہدے نئی تحقیق کو جنم دیتے ہیں اور انسان اگلے قدم
کی جرأت پیدا کرتا ہے۔ یوں علم ماضی اور حال کے گلے میں بانہیں ڈالے مستقبل
کا سہارا بنتا ہے۔ اور ایک ایسا گروہ وجود میں آ جاتا ہے جو علم کا علم ہاتھ میں
لے کر آگے بڑھتا ہے اور صدا دیتا ہے کہ ہم چراغ روشن کرنے والے ہیں۔ حجاب جہاد

چراغ جلتے ہیں وہاں وہاں تعلم کا عمل شروع ہوجاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ سب ایک کاروان کی شکل میں منزل کی طرف گامزن ہوتے ہیں۔ ابن خلدون تعلیم و علم کو فلسفہ نہیں بناتا۔ بلکہ اسے زندگی سے قریب کرتے ہوئے اسے صرف اصلاح احوال کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں غور و فکر ہی تعلیم کا اہم ترین مقصد ہے جو بہتر اور پرسکون زندگی اور بعد کی نسل کا اہتمام کرتا ہے اور عمرانی زندگی کی بہتری کے زاویوں سے روشناس ہوتا ہے۔ گویا ابن خلدون کے خیال میں تعلیم کا مقصد علم کا حصول ہے۔ علم کے حصول میں جہاں عقل و استدلال اور حواس کارفرما ہوتے ہیں وہیں اللہ اپنے برگزیدہ بندوں کو ایک اور قوت عطا کرتا ہے جسے الہام کہتے ہیں یہ قوت انسان کو معرفت تک پہنچاتی ہے۔ معرفتِ حق حاصل کر لینے والے افراد علم و عمل میں کامل ہو کر دوسروں کے ہادی اور استاد کامل قرار پاتے ہیں اور ان کی اطاعت سب پر فرض ہوتی ہے۔ خلدون تعلیم کے میدان میں اپنے دور سے بہت آگے نظر آتا ہے۔ اس کا ذہن خاصا جدید ہے۔ ان کے دور سے بہت بعد کی تحقیقات بھی اس کے ہاں معمول کی چیزیں نظر آتی ہیں۔

وہ آج کی نفسیات کے ماہرین کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ متعلم کی ذہنی سطح کس قدر بلند ہے اور وہ علم و فن کی کس قدر مقدار کا متحمل ہو سکتا ہے۔ آج کا ماہر تعلیم اس نکتہ پر بہت زور دیتا ہے اور اس میدان میں بہت تحقیق کی جا چکی ہے۔ خلدون کا کہنا ہے کہ معلم کو دیکھنا چاہیئے کہ متعلم کی ذہنی سطح کیا ہے اور اسے سبق میں کتنا حصہ ملنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اس کی مثالیں گرد و پیش سے متعلق ہونا چاہئیں۔ وہ رجحان اور مانوسیت کو تدریس میں اولیت دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب ایک علم سے مناسبت پیدا ہو جائے تب اس سے متعلق علوم اور تشریحات و توضیحات کو چھونا مناسب ہوگا۔ وہ علم کو شاخ در شاخ ذہنوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ سختی اور تشدد کا بھی مخالف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس سے طالب علم

میں جھوٹ بولنے کی عادت پیدا ہوتی ہے اور وہ مکر و فریب کا عادی ہو کر غیرت و حمیت سے عاری ہو جاتا ہے اور اس طرح آخر کار معاشرہ میں ناسور بن کر ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ خلدون فنی تعلیم پر بھی بہت زیادہ زور دیتا ہے اور تمام مروجہ فنون کے سکھانے پر اصرار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فنی تعلیم حاصل کرنے والے ذوق جمالیات سے عاری رہیں اس لئے دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ موسیقی، مصوری اور نقاشی کی طرف بھی توجہ دی جائے۔ غرض ابن خلدون تمام ماہرین تعلیم اور فلسفیوں میں زیادہ جدید اور عملی نظر آتا ہے اور اس کی اہمیت عمرانی فلسفہ کے علاوہ تعلیم کے میدان میں بھی اتنی ہی مسلمہ ہے۔

امام غزالی کا نظریۂ تعلیم

تاریخ اسلام میں خراساں (جس کے معنے سرزمین آفتاب کے ہیں) کو اونچا مقام حاصل ہے۔ اس صوبے میں طوس نامی ایک ضلع ہے۔ جس نے فردوسی نظام الملک اور امام غزالی جیسی نامور ہستیوں کو جنم دیا۔

امام غزالی نے ابتدائی تعلیم طوس میں حاصل کی اور پھر نیشاپور پہنچے۔ ۳۰ سال کی عمر میں وہ مشہور عالم بغداد کے کالج نظامیہ میں معلم کے عہدے پہ فائز ہوئے۔ اتنی کمسنی میں نظامیہ کی مسند درس پر کوئی اور فائز نہیں ہوا۔ اپنی ۵۵ سالہ زندگی میں انہوں نے تمام علوم (تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، علم الکلام، تعلیم، وعظ اور مناظرہ) میں اس قدر مہارت حاصل کی کہ وہ جمال الدین افغانی کے قول کے مطابق "زندگی کے قطب اور سمتوں کے لئے تازہ پانیوں کے مشترکہ چشمہ بنے"۔ انہوں نے ۵۰ کے قریب کتابیں لکھیں، جو کہ مروجہ طرز کے خلاف نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں تھیں۔ انکی تصنیفات کے بارے میں MACDONALD کا قول ہے کہ "دوات کو فخر ہے اور کاغذ خوشی سے تھرتا ہے اور ان کا پیغام پڑھتے وقت عالم خاموشی چھا جاتا ہے اور سر خم ہو جاتا ہے"

انکی مشہور کتاب احیا العلوم الدین کا پہلا باب فضائل علم سے متعلق ہے جس میں انہوں نے بتایا کہ اسلامی تہذیب و ثقافت میں علوم کا کیا درجہ ہے اور اہل علم کو کس مرتبہ و مقام کا خیال کیا جاتا ہے۔ وہ علم کو ایک ایسی نیکی کہتے ہیں کہ جس کے فیض سے عالم ناسوت، ملکوت و لاہوت کے اسرار و حقائق کو اپنی گرفت میں لینے کے لائق ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہ اللہ تعالٰے نے اپنے اور ملائکہ کے پہلو بہ پہلو اہل علم کا ذکر کیا۔ استدلال میں انہوں نے یہ آیت پیش کی: "اللہ شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں فرشتے بھی اس پر گواہ ہیں اور اہل علم کا بھی یہی کہنا ہے۔" (آل عمران)

علم کی وسعت کے بارے میں غزالی نے قرآن پاک کی یہ آیت پیش کی: "جس کے پاس کتاب کا علم تھا۔ اس نے کہا کہ میں تخت آپ کے پاس لے آتا ہوں" غزالی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ملکہ سبا کے تخت کو لانے میں جس قوت کو دخل تھا وہ علم تھی۔ پھر فرمایا کہ علم ساکن اور محدود نہیں بلکہ یہ رواں دواں حقیقت ہے جس میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا ہے۔ لہذا جب تک کائنات کا وجود ہے۔ اس کے لاتعداد گوشے انسانی فکر و نظر سے اوجھل ہیں اس وقت تک علم و اجتہاد کی تگ و دو جاری رہے گی تاآنکہ زمین اپنے تمام اشکال اگل دے اور آسمان راز فاش کر دے۔ دل کی غذا علم و حکمت ہے اور اسی سے زندگی ہے۔ جس شخص میں علم کی طلب نہیں وہ سمجھ لیجئے اس کا دل بیمار ہے۔ غزالی کے نقطۂ نظر کے مطابق قرآن، حدیث، فقہ اور تفسیر کے ساتھ ساتھ ان تمام مادی و سیاسی علوم کو بھی نمایاں جگہ دی جانی چاہئے۔ جو بظاہر دینی تقاضوں سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ان علوم کا حاصل کرنا بھی اتنا ضروری ہے جتنا کہ دین کے دوسرے علوم کا۔ موجودہ دور کے علوم میں SPECIALIZATION کا تصور بھی غزالی کی فکر ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بجائے سب علوم حاصل کرنے کے کچھ لوگ اپنی ذہنی مناسبت کے مطابق علم کی ایک شاخ کو اپنا لیں اور اس کی تمام جزئیات و فروع کو جاننے کے لئے اپنی صلاحیتیں وقف کر دیں۔ اسی علم کے نئے مضمرات کا پتہ چلے گا۔

غزالی کا کہنا ہے کہ علم کے لئے ایک مخصوص گروہ ہونا چاہیئے جس کا کام علم و معارف کو پھیلانا اور اس پردے کی دیکھ بھال اور نگرانی ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر تعلیم کے لئے مخصوص گروہ نہ تیار کیا گیا ہو اور علم کے فیوض کو عام نہ کیا گیا ہو تو امت جہل کی تاریکیوں میں بھٹک جائے گی۔ معلمین کے درجہ و مقام کے ضمن میں انہوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پیش کی۔ "جو شخص لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتا ہے اس کی بخشش اور کامیابی کے لئے اللہ تعالیٰ ملائکہ ارض و سما کے درمیان رہنے والی کائنات سب دعا کرتے ہیں۔ علم کا پڑھنا اور پڑھانا تسبیح ہے۔"

معلم کی ذمہ داریوں کے ضمن میں امام غزالی نے فرمایا کہ معلم کا انداز تعلیم حکیمانہ ہونا چاہیئے۔ اسے اپنے شاگردوں کو شفقت اور محبت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ اسے اپنے شاگردوں میں باہم محبت والفت کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے اسے علم و تدریس محض اللہ کی رضا کے لئے کرنی چاہیئے اور کوئی دنیاوی اجر و صلہ طلب نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ طالب علم کو علوم کی غرض و غایت سے آگاہ کرے اور احسن طریقے سے سمجھائے کہ طالب علم خود ہی اپنی غلطی پر شرمندہ ہو جائے۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہ لے۔ ایک اچھے معلم کو چاہیئے کہ وہ اپنے شاگرد کی ذہنی سطح کا خیال رکھے اور وہی حقیقت اس تک پہنچائے جو اس کی عقل سے بالاتر نہ ہو اور اور اگر کسی کی ذہنی سطح بلند نہ ہو تو اسے دین و علم کی موٹی موٹی باتیں بتانے پر ہی اکتفا کرے۔

امام غزالی نے طالبعلم کے آداب کے ضمن میں فرمایا کہ اسکے لئے ضروری ہے کہ علم حاصل کرنے کے لئے

اس کا نفس و قلب پاکیزہ ہو اخلاقی برائیوں سے دور رہے اور وہ علائق دنیا سے دست کش ہو کر علم حاصل کرے اور اگر گھر اور وطن سے دور بھی رہنا پڑے تو جائز ہے۔ کیونکہ تعلقات انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور اصل کام سے روکتے ہیں۔ حسن ادب طالب علم کا وصف ہونا چاہیئے۔ اپنے استاد کے سامنے مؤدب

رہے۔ حضورِ قلب اور توجہ کے ساتھ بیٹھے۔ ممنونیت اور انبساط کے ساتھ اس کی باتوں پر توجہ دے۔ تواضع کو اپنا شعار بنائے تاکہ افادہ اور استفادہ کی غرض پوری ہو۔ طالب علم اپنے استاد سے اس کی اجازت سے سوال کرے اور جواب کے معاملہ میں اس کو کوفت میں نہ ڈالے۔ ایک طالب علم کو چاہئیے کہ وہ اپنے لئے علم کی غرض و غایت کا تعین کرے اور یہ جان لے کہ جس علم میں وہ مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کی غرض و غایت کیا ہے اور کیا وہ اپنی عمر کے مطابق اس کے تعلقات سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے یا نہیں تب دلچسپی لے۔ علوم و فنون میں جو ترتیب قائم ہے۔ طالب علم اس کا خیال رکھے تمام علوم پر یک دم ہلہ نہ بول دے۔ جو علم اس کے لئے اہم ہو اسے پہلے حاصل کرے کیونکہ عمر میں یہ وسعت نہیں کہ تمام علوم ایک ساتھ حاصل کئے جا سکیں۔

الغرض امام غزالی نے معاذ بن جبل کے اس قول کو مدنظر رکھا: علم پڑھو اس کا سیکھنا اور پڑھنا اللہ کے لئے ہو۔ اس کی طلب عبادت ہے۔ اس کے بارے میں بحث و تمحیص کرنا جہاد اور اس شخص کو تعلیم دینا جو نہ جانتا ہو صدقہ ہے علم تنہائی میں انس، خلوت میں دولت، دین میں رہنما خوشی اور غمی میں صبر، دوستوں کا وزیر مسافروں کا عزیز اور جنت کی راہ کا مینار ہے۔ علم کے ذریعہ اللہ قوموں کو اٹھاتا ہے اور بلندی دیتا ہے سیادت اور ہدایت و ارشاد کی مسند پر عطا کرتا ہے۔ ان کے اعمال کی پیروی کی جاتی ہے۔ نیکی اور حسنات میں ان کے نقوش بنتے ہیں۔ فرشتے ان کی دوستی کے خواہاں رہتے ہیں اور ان کی بخشش کے لئے چرند و پرند ارض و سماں کی ہر چیز دعا گو رہتی ہے۔

مسلم ہندوستان میں نظام تعلیم

محمد بن قاسم نے صرف سترہ (۱۷) سال کی عمر میں اس فوج کی کمان کی جس نے ۹۳ ہجری = ۷۱۱ عیسوی میں سندھ پر حملہ کیا۔ مسلمانوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا اس اسلامی حکومت کے اثرات دیرپا نہ ہوئے۔ محمود غزنوی نے ۴۱۷ ہجری = ۱۰۲۶ء میں پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس عہد میں غزنی علم و فضل کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ہم اس کا ذکر اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہی اسلامی علوم بعد میں اسلامی حکومت کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے۔

محمود کی سلطنت کا دارالخلافہ غزنی تھا۔ محمود خود بھی اچھا خاصا عالم اور شاعر

تھا۔ اس کے دربار میں اسلامی دنیا کے ہر گوشے سے عالم جمع ہو گئے تھے۔ محمود نے غزنی میں ایک یونیورسٹی بنائی۔ جس میں سب علوم کی کتابیں جمع کیں۔ جب کبھی کوئی نیا شہر فتح کیا جاتا تو وہاں کی قیمتی کتابیں اور نوادر اس یونیورسٹی میں بھجوا دیئے جاتے۔ اس یونیورسٹی کا مہتم عنصری تھا جو شاعر اور فلسفی ہوا ہے اس یونیورسٹی سے

منصل ایک شاہی خاندان بھی تھا جس میں حیاتیات عالم رکھے ہوتے تھے۔

چودھویں اور پندرھویں صدی

غزنوی خاندان نے اپنے آخری ایام سلطنت میں لاہور کو دارالخلافہ بنا لیا (بارھویں صدی عیسوی کا تیسرا ربع) اور غزنی کا تمام اسلامی علم ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ دربار غزنویہ کے ساتھ ہندوستان میں استاد، شاگرد، عالم اور سب آگئے۔ غوریوں نے ہندوستان فتح کیا اور ہندوستان کا دارالخلافہ لاہور کی بجائے دہلی قرار پایا۔ اس طرح سے اسلامی علوم کا مرکز دہلی بن گیا۔ دہلی سے اسلامی علوم ہندوستان کے مختلف گوشوں تک پہنچتے رہے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں کالج بن گئے۔ اجمیر۔ لاہور۔ دہلی۔ جالندھر وغیرہ۔

عربی زبان میں تعلیم

[illegible] کے کالجوں میں عربی زبان میں جو علوم پڑھائے جاتے تھے وہ علوم [illegible] کی کتابیں ذیل میں درج ہیں۔ حقیقت ہے کہ تمام اہم علوم وفنون کی تعلیم عربی میں ہوتی تھی۔

۱۔ [illegible] مصباح۔ کافیہ۔ لُبّ الالباب از قاضی ناصر الدین البیضاوی اور بعد میں قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب ارشاد بھی شامل کر دی گئی۔

۲۔ ادب۔ مقامات الحریری

۳۔ منطق۔ الرسالۃ الشمسیہ از علی بن عمر نجم الدین الکاتبی قزوینی۔ یہ کتاب چھ سو سال تک تقریباً ہر اسلامی درسگاہ میں منطق کا کورس تھی۔

۴۔ شریعت اسلامی۔ الہدایہ فی الفروع از شیخ برہان الدین ابوالحسن

۵۔ شریعت اسلامی کے اصول۔ منار الانوار از حافظ الدین ابوالبرکات

اصول البیضاوی از بیضاوی۔

۶۔ تفسیر قرآن۔ مدارک از عبداللہ ابن احمد حافظ الدین۔

کشاف۔ از زمخشری

بیضاوی۔ از قاضی بیضاوی

۷۔ حدیث۔ مشارق الانوار۔ از حسن ابن محمد عمری

مصابیح السنہ۔ از ابومحمد الحسین ابن مسعود

۸۔ تصوف۔ عوارف المعارف از شہاب الدین ابوحفص عمر ابن محمد السہروردی

فصوص الحکم از ابن العربی۔

۹۔ فلسفۂ مذہب۔ شرح الصحائف

پندرھویں صدی کے آخر تک تقریباً یہی نصاب اور طریق تعلیم ہندوستان میں دو سو سال تک جاری رہا۔ ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اس طریق تعلیم میں بحث کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ شاگرد آپس میں بحث کرتے اور استاد سے بحث کرتے۔ شاگردوں کو سننے کا موقع ملتا۔ گویا اپنے تمام شکوک شاگرد رفع کر لیا کرتے تھے۔ آج کل کے کالجوں میں شاگرد کو ایک لفظ بولنے کا حق حاصل نہیں۔ وہ صرف سنتا ہے اور نوٹ لکھتا ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ شاگرد ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ تحصیل علم کے لئے شہر بہ شہر پھرتا رہتا تھا اور ایک استاد سے تحصیل علم کرنے کے بعد دوسرے استاد کے پاس جاتا تھا۔ بعض دفعہ شاگرد ہزاروں میل کا سفر طے کرتا اور زندگی کے بیس پچیس سال طالب علمی میں گزار دیتا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں تعلیم کا ایک اور ذریعہ بھی تھا۔ مکتب مدرسہ اور جامعہ تو موجود تھے۔ ان کے علاوہ بعض دفعہ کوئی فاضل اپنے گھر پہ درس دیا کرتا تھا یا کوئی امیر آدمی کسی فاضل کو اس کام پہ مامور کر دیتا یا کوئی متمول صاحب علم خود ہی درس دیا کرتا۔

یہ کام فیس کے بغیر ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مدرسہ میں تعلیم خاص طور پر فارغ التحصیل طلباء کے لئے ہوتی تھی یعنی اعلیٰ جماعتوں کے لئے ۔

فارسی زبان میں تعلیم

اس زمانے میں تمام علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم سارے عالم اسلام میں عربی میں ہوا کرتی تھی۔ مگر مسلمانوں نے جب دہلی میں اپنی سلطنت قائم کی تو ابتدائی دور میں ہی فارسی نے ہندوستان کی فضا میں اپنی جگہ بنالی۔ فارسی نظم تو عوام کی دلپسند تھی۔ یہ باعث تفریح بھی تھی۔ تجربہ آموز اور اخلاق آفرین بھی۔ غیر زبانوں سے بہت سی کتابیں فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ اس زمانے میں اعلیٰ طبقے کی زبان فارسی تھی۔ خاندان غلاماں کے افراد ترک تھے اور ترکی بولتے تھے۔ مغل بادشاہوں کی مادری زبان ترکی تھی اور وہ ابتداء میں اپنے گھروں میں ترکی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ مگر فارسی نے عہد ہی اپنی جگہ ہندوستان میں بنالی۔ محمد تغلق خوب فارسی جانتا تھا۔ فیروز تغلق کے عہد میں سعدی، جامی۔ خاقانی اور انوری مدرسوں میں پڑھائے جاتے تھے ۔

سکندر لودھی کا عہد ہندوستانی زبان کے ارتقاء میں ہمیشہ یاد رہے گا ۔ اس بادشاہ کے عہد میں زبان پہلی دفعہ فارسی ابجد میں لکھی گئی۔ ابجد میں ان حروف کا اضافہ کیا گیا۔ جن کی آوازیں ظاہر کرنے کے لئے فارسی ابجد میں کوئی حروف نہیں۔ مثلاً

چھ ٹھ تھ پھ بھ ڑ ڈ ٹ

امیر خسرو دہلوی کی کتاب اعجاز خسروی پہلی کتاب ہے جو ہندوستان میں فارسی زبان دانی پر لکھی گئی ۔ جس کے ساتھ یہ معلوم نہیں کہ فارسی نصاب میں کون کون سی کتابیں داخل تھیں مگر یہ ظاہر ہے کہ اس دور میں بھی اسکولوں میں

ذریعۂ تعلیم فارسی زبان تھی اور علوم کی کتابیں عربی میں لکھی ہوتی تھیں ۔

موسیقی

قدیم عربوں کے ہاں موسیقی کو زندگی کی ضروریات میں سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے لہو ولعب سے منع کیا ۔ اسلام ہر ایسے کام سے روکتا ہے جو بیکاری کی طرف یا برائی کی طرف لے جائے ۔ تضیع اوقات کا باعث بنے جس میں کوئی تعمیری پہلو مضمر نہ ہو ۔ بڑے سے راگ اور عیش و طرب کی فتنہ انگیز محفلیں اس شق میں آ گئیں ۔ لیکن فنون کے سیکھنے کی تاکید کرتا ہے ۔ اس لئے موسیقی بطور علم کے سیکھا جاتا رہا ۔ بادشاہوں ، سرداروں ، امیروں کے ہاں موسیقی ہمیشہ دربار یا محفل کی ضروریات میں سے رہی ہے ۔ ہے ۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر عوام کے ہاں بھی گا لیا کرتے تھے ۔

کتاب الاغانی کا مصنف ابوالفرج ہے (۲۸۴ - ۳۵۶ھ = ۸۹۷ - ۹۶۷ء) = راگوں اور گیتوں کی کتاب ہے ۔ اس کی اکیس جلدیں ہیں ۔ العقد الفرید کا مصنف عبد ربہ (۲۴۶ - ۳۲۸ھ = ۸۶۰ - ۹۴۰ء) ہے اس کے ۵ باب ہیں جس کا ایک حصہ موسیقی پر بھی مشتمل ہے ۔ الکندی ۔ الفارابی ۔ ابن سینا نے بھی موسیقی پر علمی بحث لکھی ہے ۔ پندرہویں صدی عیسوی کے بعد سے موسیقی پر کتابوں کے مصنفین کی تعداد کم ہو جاتی ہے ۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کے تمام علوم میں انحطاط ہو گیا ۔

صوفیا نے موسیقی کو اپنی شریعت کا ایک جزو بنا لیا ۔ سب صوفی راگ سنا کرتے تھے

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (۱۱۴۲ء - ۱۲۳۶ء) نے سب سے پہلے ہندوستان میں اس تحریک کو جاری کیا ۔ حضرت نظام الدین اولیا بھی پکے صوفی تھے ۔ انہوں نے حضرت امیر خسرو کو ترغیب دی کہ وہ موسیقی کی ترقی میں کوشاں ہوں ۔ امیر خسرو نے ستار ایجاد کیا ۔ ہندوستانی سنگیت میں بہت سے راگنیوں کا اضافہ کیا ۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ موسیقی اسلامی ممالک کی اعلیٰ مدرسوں کا حصہ یعنی ان کے شعبہ میں شامل تھی۔ ہندوستان میں موسیقی کے متعلق گذشتہ عہد کی بہت کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں جن سے ہم کوئی معین نتائج اخذ کرسکیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ موسیقی شاہی دربار کے رسوم کا لازمی جزو تھا۔ صوبوں کے گورنر اور رئیس بھی موسیقی کے بڑے قدردان تھے۔ ہر ایک کے پاس اپنے اپنے گویے ہوا کرتے تھے۔ عربی موسیقی ایرانی موسیقی، ہندوستانی موسیقی تینوں کا رواج شاہی دربار میں بھی تھا۔

طب

طب کی طرف مسلمانوں نے ابتدا سے توجہ دی۔ صحت قائم رکھنے کے لئے اور بیماری کو دور کرنے کے لئے فن طبابت کی ضرورت ہے۔ قرآن اور حدیث میں مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ علم حاصل کرنے میں کوشاں ہوں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دین کا علم بھی سیکھو اور دنیا کا علم بھی سیکھو۔ اس لئے مسلمانوں نے طب اور علم الاشیاء کی تحصیل کو ضروری سمجھا۔ طب کو اس قدر اہمیت دی گئی کہ جامعہ کے ہر طالب علم کو اعلیٰ جماعتوں میں طب پڑھنی ضروری تھی وہ طبابت کا پیشہ اختیار کرے یا نہ کرے۔ عربوں نے یونانی کتابوں کے تراجم عربی میں کئے۔ ان کتابوں میں سے بعض آج صرف ان عربی تراجم کی شکل میں موجود ہیں اور اصل یونانی کتابیں ناپید ہیں۔ ذکریا رازی کی کتاب۔ علی ابن العباس کی کتاب الملکی۔ بوعلی سینا کی کتاب قانون۔ ابن رشد کی کتاب کلیات طب کی مشہور کتابیں ہیں اور مشرق میں اور یورپ میں صدیوں تک کورس کا حصہ رہی ہیں۔

اخلاق

اسلام نے علم اخلاق کو سوسائٹی کے لئے لازم سمجھا ہے۔ اس لئے ہر طالب کے لئے ضروری تھا کہ وہ اخلاق کے قوانین سے بہرہ ور ہو۔ استاد کا ادب، بزرگوں کا احترام، عزیزوں سے تعلقات۔ سماج میں زندگی کس طرح سے گزارنی چاہیئے۔ اس مضمون پر کبھی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور استاد عملی طور پر ہدایات دیتا رہتا تھا۔ اس کو دور جدید کا سوکس (CIVICS) سمجھ لیں۔

صنعت و حرفت

صنعت و حرفت کے سیکھنے کے لئے کوئی خاص اسکول نہ تھے۔ فن عمارت سازی کے ماہر نقاش۔ مجسمہ ساز۔ سنگتراش وغیرہ شاگرد رکھتے تھے۔ استاد کی دوکان یا مکان ہی ان کی درس گاہ تھی اور وہ استاد کی زیر نگرانی کام سیکھتے رہتے تھے۔ البتہ فیروز شاہ تغلق کے زمانے کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ سلطنت میں ۳۶ سرکاری کارخانے تھے۔ ان میں بارہ ہزار کاریگر کام کرتے تھے۔ کارخانے کے افسر کو خان یا ملک کہتے تھے اور تمام کارخانوں کا افسر خواجہ ابوالحسن تھا۔ ان کارخانوں میں شاہی محلات اور امیروں کے لئے ریشم کے کپڑے۔ اطلس و کمخواب بنائے جاتے تھے۔ سلطان کی طرف سے دربار کے موقع پر اور خدمات کے صلہ میں خلعتیں عطا کی جاتی تھیں۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ محمود خلجی نے مالوہ میں ایک کارخانہ قائم کیا۔ جس میں عورتوں کو مخمل بننا، کشیدہ کاری اور زردوزی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

مغلوں کا عہد

منقولات کی بجائے معقولات پر زور

مغل خاندان کے تمام بادشاہ، علم و فضل کے دلدادہ اور عالموں کے سرپرست تھے۔ اکبر کے سوا باقی سب بادشاہ علم سے بہرہ ور تھے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اکبر سوائے اپنے دستخط کرنے کے کچھ نہ جانتا تھا۔ مگر اس کے دربار میں ہندوستان کے بہترین فاضل جمع ہو گئے۔ ابوالفضل۔ فیضی۔ ٹوڈرمل اس معاملے میں فتح اللہ شیرازی کی قابلیت نے زیادہ اثر دکھایا۔ ایک درس گاہ کے عمل میں منقولات کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ مگر فتح اللہ نے اس بات پر زور دیا کہ معقولات کی طرف زیادہ توجہ دی جائے جس سے فراستِ انسانی میں اضافہ ہو۔ اس نے کہا کہ شعر، ادب، گرامر (منقولات) کا حصول ایک واسطہ بنانا چاہیئے۔ معقولات (طب، جیومیٹری، فلسفہ) میں اضافہ کرنے کے لئے۔ چنانچہ دورِ اکبری میں اسکولوں کی تعلیمی فضا میں تبدیلی ہو گئی۔ اس سلسلہ میں عبدالحق (پیدائش ۹۵۸ھ - ۱۵۵۱ء) کا نام بھی قابل ذکر ہے جو حدیث منقول اور معقول کا بہت بڑا عالم تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغل بادشاہوں میں اورنگ زیب سب سے بڑا عالم تھا۔ اس کا علم وسیع بھی تھا اور وہ اس کو استعمال بھی کرتا تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں فرانس کا رہنے والا ڈاکٹر فرانسس برنیر ہندوستان میں آیا۔ مغل دربار کا مدار المہام امور خارجہ دانشمند خان تھا۔ برنیر دانشمند خان کے ندیموں میں داخل ہو گیا اور چھ سال تک یہاں رہا۔ برنیر نے اپنا سیاحت نامہ لکھا ہے۔ اس میں لکھتا ہے۔

جب اورنگ زیب تخت نشین ہوگیا تو اس کا استاد اورنگ زیب کے پاس انعام حاصل کرنے کے ارادے سے آیا۔ دانش مند خان کی زبانی برنیر کو معلوم ہوا کہ اورنگ زیب نے اپنے استاد کو انعام دینے کی بجائے اس طرح سے جواب دیا کہ میرے استاد کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ مجھے کرۂ ارض کی تمام قوموں کا حال بتاتا۔ یہ واضح کرتا کہ قوم کی خصوصیات، قوت، پیداوار اور ذرائع کیا ہیں۔ ان کی لڑائی کا طریقہ۔ رسوم۔ مذہب اور طرق سلطنت کیسے۔ چاہئے یہ تھا کہ تاریخ کی باقاعدہ تعلیم سے مجھے بتایا جاتا کہ قومیں کس طرح سے وجود میں آتی اور ترقی کرتی ہیں۔ ان کے تنزل کے اسباب کیا ہیں۔ وہ اسباب۔ امور۔ واقعات اور غلطیاں جن کے سبب دنیا میں اتنی بڑی بڑی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ تاریخ اقوام عالم کے متعلق مجھے بسیط اور گہری معلومات پہنچانے کی بجائے آپ ایسے استاد نے مجھے مشکل سے اپنے آباء واجداد کے نام یاد کرائے۔ جو خاندانِ مغلیہ کے بانی اور وسیع کرنے والے تھے۔ آپ نے مجھے عظیم الشان بادشاہوں کی زندگی کے مکمل حالات سے ناآشنا رکھا۔ یہ نہیں بتایا کہ ان کے کامیاب ہونے سے پہلے حالات کیا تھے اور ان میں کون سی خوبیاں تھیں۔ جن کے سبب انہوں نے اس قدر وسیع سلطنت قائم کرلی۔ ایک بادشاہ کے لئے ہمسایہ ممالک کے لوگوں کی زبانوں کا سیکھنا ضروری ہے۔ مگر ان زبانوں کی بجائے آپ نے مجھے عربی لکھنا اور پڑھنا سکھایا۔ آپ نے میری عمر کے دس بارہ سال عربی گرامر اور زبان کی تحصیل میں خرچ کئے اور مجھے اس پر بہت محنت کرنی پڑی۔ مگر یہ علم تو ایک مذہبی عالم کے لئے ضروری تھا۔ مادری زبان بہترین ذریعۂ تعلیم ہے اور آپ نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ کئی قیمتی سال آپ نے بیکار فلسفہ پڑھانے میں خرچ کر دیئے۔ اس کے برخلاف آپ کو ایسا فلسفہ پڑھانا چاہیئے تھا جو دلیل اور دل میں تطبیق پیدا کرے۔ وہ فلسفہ جو ٹھوس دلیلوں پر مبنی ہو۔ آپ کو مجھے ایسا درس دینا چاہیئے تھا جس سے روح میں رفعت پیدا ہو۔ ایسی رفعت کہ جہاں روح پر دنیاوی کاروبار کی کامیابی یا ناکامی کا اثر نہیں ہوتا جب قسمت دنیا میں سرخرو کرے تو انسان کا مزاج نہ

بجھ جائے اور جب ناکامی سے دوچار ہو تو مزاج میں ابتذال پیدا نہ ہو۔ کائنات
مناسب اور دافع تشریح کرنی چاہیئے تھی۔ اس کی تنظیم اور مختلف حصوں کی
روش کا ذکر کرنا چاہیئے تھا۔

BERNIER'S TRAWELS CONSTABLE & COMPANY. PP. 154-16

یہ ڈاکٹر برنیر کی تحریر کا ترجمہ ہے۔ جو حالات اس نے دانش مند خان سے سنے
بہ صحت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اورنگ زیب کی اپنی زبان سے یہ خیال کن
الفاظ میں نکلے تھے اور اس کے خیالات کہاں تک ان الفاظ کا جامہ پہنے ہوئے
ہیں۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ یہ اس زمانے کے خیالات ہیں۔ جب اورنگ زیب حیات
تھا اور اورنگ زیب نے اپنے بیٹے شہزادہ معظم کو انہیں اصولوں کے مطابق تعلیم
دی۔ اورنگ زیب نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں اسکول اور کالج بنوائے
اس نے تعلیم کو اس قدر وسعت دی کہ اگر اس کی پالیسی قائم رکھی جاتی تو آج
ہندوستان کا ہر فرد بشر تعلیم یافتہ ہوتا۔ (المنہاج۔ صوفی۔ صفحات ۹۴ - ۹۷)

شاہ ولی اللہؒ

اورنگ زیب کے عہد کا ایک فاضل شاہ ولی اللہؒ تھا (م ۱۱۱ - ۱۱۷۴ھ
= ۱۷۰۲ء - ۱۷۶۰ء) اس نے علم الکلام کو بہت ترقی دی۔ غزالی کی طرح
شاہ ولی اللہ اسلامی اصولوں کی تشریح فلسفہ سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ
اسلام کے پائندہ اصولوں کی تشریح عوام کی سبک دلیلوں سے نہیں ہو سکتی۔ کم
علم ملاؤں نے اپنی جہالت کے سبب اسلام میں پستی پیدا کر دی ہے۔ فلسفہ اور علوم
عقلیہ کی تعلیم سے اسلام میں رفعت پیدا ہو جائے گی اور شاہ ولی اللہ کو یقین
ہے کہ اسلام تمام عقلی دلائل کے مقابل میں سچا مذہب ثابت ہوگا۔

شاہ ولی اللہ اپنے زمانے کا بڑا محدث تھا اس نے ہندوستان میں تعلیم حاصل

تصنیف کے بعد کئی سال عرب میں تحصیلِ احادیث میں گزارے۔ اس نے اپنی کتاب:
الجزءاللطیف میں ایک نصاب لکھا ہے جو شاہ ولی اللہ کی نگاہ میں تعلیم
کا بہترین نصاب ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں عربی کا یہی نصاب سمجھنا چاہیئے۔

۱۔ گرامر۔ کافیہ۔ شرح جامی
۲۔ فصاحت و بلاغت مختصرمعانی۔ مُطوّل
۳۔ فلسفہ۔ ہدایت الحکمہ کی شرح (میبذی)
۴۔ منطق۔ شمسیہ کی شرح (قطبی) اور مطالع کی شرح
۵۔ علم الکلام۔ العقائد از نسفی۔ خیالی حاشیہ۔ شرح عقائد تفتازانی
مواقف۔
۶۔ فقہ۔ شرح الوقایہ۔ ہدایہ
۷۔ اصولِ فقہ۔ حُسامی۔ التوضیح والتلویح
۸۔ ہیئت اور ریاضی۔ مختلف کتابیں۔
۹۔ طب۔ قانون (از بوعلی سینا) کا خلاصہ
۱۰۔ حدیث۔ مشکوٰۃ المصابیح۔ شمائل از ترمذی۔ صحیح البخاری (ایک حصہ)
۱۱۔ تفسیر۔ مدارک۔ بیضاوی
۱۲۔ تصوف۔ عوارف۔ کتابِ نقشبندیہ۔ جامی کی رباعیات کی شرح۔ نقدالنصوص کی تمہید

اورنگ زیب کے عہد میں فارسی کی جو کتابیں نصاب میں شامل تھیں۔ ان پر بھی
ہم ایک نظر ڈالتے ہیں۔ فارسی کا نصاب مندرجہ ذیل تھا:۔

۱۔ ادب اور نثر۔ بدائع الانشاء (یا انشائے یوسفی) ملاجامی۔ ملا مُنیر
نثر کی کتابیں۔ انشائے ابوالفضل۔ شیخ عنایت اللہ۔ منشی شاہ جہان
بہارِ سخن۔ از شیخ محمد صالح۔ ملا منیر کے خطوط۔ شیدا اور ملا طغرا
حکایت لال چند۔ لیلےٰ ترجمہ شیخ فیضی۔

۲۔ نظم۔ ملا جامی کی یوسف زلیخا۔ تحفۃ الاحرار۔ نزہت الابرار۔ نظامی کی سکندر نامہ۔ مخزن الاسرار۔ ہشت پیکر۔ شیریں خسرو۔ لیلےٰ مجنوں۔ امیر خسرو۔ قران السعدین۔ مطلع الانوار۔ اعجازِ خسروی۔ دیوانِ شعر۔ شمس تبریز۔ ظہیر فاریابی۔ سعدی۔ حافظ۔ صائبؔ قصائد۔ بدر چاچ۔ انوری۔ خاقانی۔ عرفی۔ فیضی۔

حکایات۔ طوطی نامہ از نخشبی۔ انوارِ سہیلی از حسین واعظ کاشفی۔ عیارِ دانش از شیخ ابو الفضل۔ بہار دانش شیخ عنایت اللہ

تاریخ۔ ظفر نامہ از شرف الدین علی یزدی۔ اکبر نامہ ابو الفضل۔ اقبال نامہ جہانگیری۔ تاریخ فیروز شاہی۔ رزم نامہ (ترجمہ مہابھارت) شاہنامہ از فردوسی۔۔

اخلاق۔ اخلاقِ ناصری۔ اخلاق جلالی۔ شرف الدین منیری۔ نزہت الارواح۔ مثنوی مولانا روم۔ حدیقہ سنائی۔

اورنگ زیب کے عہد (۱۶۵۸ء۔ ۱۷۰۷ء عیسوی) کے بعد ہندوستان کی فضا میں عام انحطاط شروع ہو گیا اور تعلیمی فضا بھی اپنی پہلی منزل سے گر گئی۔ مولوی نظام الدین فرنگی محل لکھنؤ میں رہتا تھا۔ وہ اپنے وقت کا بڑا معلم مانا جاتا ہے۔ اس کی وفات ۱۱۶۱ھ = ۱۷۴۸ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ اس نے ایک نصاب تجویز کیا جو درسِ نظامیہ کہلاتا ہے۔ وہ تھوڑی بہت ردوبدل کے ساتھ آج تک دینی مکاتیب میں مروج ہے۔

صرف نحو و لغت۔ میزان۔ منشعب۔ صرفِ میر۔ پنج گنج۔ زبدہ۔ فصولِ اکبری شافیہ۔ نحو میر۔ شرح مائۃ عامل۔ ہدایت النحو۔ کافیہ۔ شرح جامی

فصاحت و بلاغت۔ مختصر المعانی۔ مطوّل

فلسفہ۔ شرح ہدایۃ الحکمہ۔ الشمس البازغہ۔ صدرا۔

منطق - شرح الشمسیہ - سُلّم العلوم - رسالہ میر زاہد - ملا جلال - صغریٰ کبریٰ - ایساغوجی - تہذیب - شرح تہذیب - قطبی - میر قطبی -
علم الکلام - شرح مواقف - میر زاہد - شرح عقائد از تفتازانی -
تفسیر - جلالین (یعنی جلال الدین محلّی کی تفسیر اور جلال الدین سیوطی کی تفسیر
تفتازانی - بیضاوی -
فقہ - شرح وقایہ (پہلی دو جلدیں صرف) ہدایہ آخری دو جلدیں صرف)
اصول الفقہ - نور الانوار - التوضیح والتلویح - مسلم الثبوت (مبادی صرف)
حدیث - مشکوٰۃ المصابیح -
ریاضی - خلاصۃ الحساب - ہندسہ تشریح الافلاک - قوشجیہ - شرح
یخمینی (صرف باب اول)
درس نظامی کے معنی وہ نصاب ہے جو ملا نظام الدین سہالوی نے تجویز کیا۔
اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ نصاب نظامیہ کالج بغداد میں پڑھایا جاتا تھا -
یہ نصاب اس اصول پر بنایا گیا کہ مشکل اور معیاری کتاب مرکزی مطالعہ کے لئے ہو - باقی کتابیں اس کی امداد و تشریح اور بصیرت کے لئے جب ہم نصاب تعلیم کی عہد بہ عہد تبدیلیوں پر غور کرتے ہیں اور مقصد تعلیم کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دنیا علوم منقول سے ہٹ کر علوم معقول کی طرف جا رہی ہے جہاں دلیل، سبب اور نتیجہ کو زیادہ دخل ہے - جہاں انسان اپنے فکر - فراست، اور تجربے سے اپنا نقشہ خود بناتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے اپنی دنیا خود آباد کر لیتا ہے -

حضرت عمرؓ کے وقت میں اسلامی فتوحات زوروں پر تھیں، حضرت عمرؓ اس بات پر اصرار کرتا تھا - والدین بچوں کو سپاہ گری کے کرتب سکھائیں - تلوار چلانا گھوڑے پر سواری کرنا - تیر چلانا - تیرنا - کشتی کرنا یہ سب کرتب سکھائے جاتے تھے -

اسلام یوں بھی فوجی مذہب ہے۔ جو یہ کہتا ہے کہ تلوار کے بغیر قرآن کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ بہر حال بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں بھی رہا اور ملت کے نوجوان۔ فنون سپاہ گری، استادوں سے سیکھنے کا انتظام خود کرتے رہے۔ بادشاہ امراء اور رؤسا اپنے بچوں کو یہ فنون سکھانے کے لئے بڑے بڑے استاد رکھتے تھے اور بڑی کاوش سے یہ کام لیتے تھے۔

ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں عسکری تعلیم کے لئے مرکز بنے ہوئے تھے۔ جہاں گھوڑے کی سواری۔ نشانہ بازی۔ شمشیر زنی، سکھایا جاتا تھا۔ چوگان بازی۔ امیروں اور بادشاہوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ ابوالفضل بھی تشریح کرتا ہے کہ اکبری عہد میں فوجی سپاہیوں کو کس طرح تربیت دی جاتی تھی۔ ہر بڑے شہر کے ساتھ چھاؤنی تھی۔ اس میں بھرتی کے لئے جوان جاتے ان کا انتخاب کیا جاتا ہے اور وہیں پر ان کو تربیت دی جاتی۔

ابن العسکی اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ جوان کو سخت کوش۔ سخت گیر اور سخت بدن ہونا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ مہین حنائم۔ نازک بیگم بننا مرد کا شیوہ نہیں۔ نوجوانوں کو سخت بستر پر سونا چاہیئے تاکہ سختی کی عادت پڑے۔ کثرت اور کشتی سے اپنے بدن کو مضبوط بنانا چاہیئے۔ بدنی تکلیف اور اذیت کی انہیں عادت ڈالنی چاہیئے۔ تاکہ موقع پر وہ بے حوصلہ نہ ہو جائیں۔ لڑکوں اور جوانوں کو کھیل اور تفریح میں حصہ لینا چاہیئے تاکہ ان کا بدن مضبوط ہو جائے۔ اعضاء کی تربیت ہو جائے اور دماغ کو بھی راحت ملے۔ اگر ایک بچے کو کھیل سے محروم رکھا جائے اور وہ تمام وقت اپنی پڑھائی میں معروف رہے تو اس کی روح فرسودہ ہو جاتی ہے۔ اس کی قوت فکر مردہ ہو جاتی ہے۔ اس کے مزاج کی تازگی ناپید ہو جاتی ہے۔ وہ تعلیم اور سبق سے بھاگتا ہے۔ اس کی زندگی سوہان روح بن جاتی ہے اور وہ پڑھائی سے دور رہنے کی ہر کوشش کرتا ہے۔ تعلیم کے یہ اصول تو مسلمانوں نے

اساتذہ کو معلوم تھے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ان پر عمل کس طرح سے کیا کرتے تھے

ہم نے ذکر کیا ہے کہ فیروز تغلق کے زمانے میں ہندوستان میں سرکاری اور غیر سرکاری کارخانے موجود تھے۔ جہاں صناع مختلف قسموں کی مصنوعات بناتے رہتے تھے۔ سولھویں صدی عیسوی میں اس نظام کارخانہ داری کو اور وسیع کیا گیا سلطنت نے خود کارخانے بنائے۔ لاہور۔ آگرہ۔ فتح پور۔ احمد آباد۔ برہان پور، سری نگر میں شاہی کارخانے تھے۔

ابوالفضل ایک سو سے زائد کارخانوں اور اداروں کے نام لکھتا ہے۔ جہاں دولتی انتظام کے ماتحت مصنوعات تیار کی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر برنیر نے ان کارخانوں کو ابوالفضل کے ساٹھ سال بعد دیکھا۔ وہ لکھتا ہے۔ بہت سے شہروں میں بڑے بڑے اطاق ہیں جن کو کارخانہ کہتے ہیں۔ ان میں مختلف کاریگر طرح طرح کا کام کرتے ہیں۔ گل دوزی۔ کشیدہ کاری اور زردوزی۔ ان پر دو باشی مقرر ہیں یا کام کے نگران ہیں۔ دوسری طرف یا دوسرے کمرے میں زرگر۔ نقاش۔ چوتھے میں پشم گر۔ روغن ساز اور لکڑی پر نقش و نگار بنانے والے۔ پانچویں میں چوب ساز خراد پیشہ۔ خیاط۔ کفش دوز۔ چھٹے میں ریشم باف۔ زربفت اور کمخواب کے بنانے والے دیگر کمروں میں اعلیٰ ململیں اور ریشم کے کامدار تیار ہوتے ہیں۔ جن سے پگڑیاں۔ سنہری کمربند۔ زنانہ شلواریں بنتی ہیں۔ جن پر سوئی سے عمدہ کام کیا ہوتا ہے۔ کارخانہ دار (یعنی کارخانہ میں کام کرنے والے) صبح کو کارخانوں میں آتے ہیں۔ سارا دن وہاں کام کرتے ہیں اور شام کو اپنے گھر واپس جاتے ہیں۔ گلدوز اپنے بیٹے کو گل دوزی کا پیشہ سکھاتا ہے اور زرگر کا بیٹا زرگر بنتا ہے۔ لوگ شادیاں اپنی اپنی ذات برادری اور پیشوں کے اندر کرتے ہیں۔ (المنہاج۔ صوفی صفحہ ۸۶ — ۸۷)

چونکہ سرکار کارخانہ داروں کی سرپرستی کرتی تھی۔ اس لئے دور دراز

سے لوگ ان سرکاری کارخانوں میں کام کرنے کے لئے آجاتے تھے۔ صنعت کی
حالت بہتر ہوگئی اور لوگوں کا مذاق بھی بہتر ہوگیا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر شہزادگی
میں دکن کا صوبیدار تھا۔ مسولی پٹم میں کپڑے پر چھپائی اور رنگائی کا کام بہت
عمدہ ہوتا تھا۔ اس نے مسولی پٹم سے کاریگر دہلی اور آگرے بھیجے تاکہ یہ
وہاں اس صنعت کو جاری کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرکاری اور نجی کارخانے
ہی شاگردوں کی تربیت گاہیں تھیں۔ کارخانداروں کے بچے ہی کارخاندار
بنتے تھے اور کارخاندار اپنے بچوں اور شاگردوں کو ان کارخانوں
میں صنعتی تعلیم دیکر ماہرِ فن بنا لیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر محمد شفیع ناموس

برطانوی ہندوستان میں نظام تعلیم

ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آگئی تو ہندوستان کی ساری فضا بدل گئی۔ انگریز حاکم کے ساتھ اُس کی زبان انگریزی ہندوستان میں وارد ہوئی ۔ انگریزی علوم و فنون آ گئے۔ جب ان اورپائی علوم نے ہندوستان میں فروغ پایا۔ تو یہاں کے لوگوں کی ذہنی کیفیت بدل گئی ۔

آریا لوگ ہندوستان میں کوئی دو ہزار قبل مسیح پانچ سو قبل مسیح تک گروہ در گروہ آتے رہے۔ ان کی زبان ویدک زبان تھی۔ جو پانچ سو قبل مسیح کے قریب ایک ادبی زبان کے سانچے میں ڈھالی گئی۔ اس کا نام سنسکرت رکھا گیا۔ ہندوستان کے ترک اور افغان بادشاہ اپنے ساتھ ہندوستان میں عربی علوم لائے۔ درس گاہوں میں عربی پڑھائی جاتی تھی اور انہوں نے فارسی کو ہندوستان میں رواج دیا۔ مغل بادشاہ آئے تو انہوں نے فارسی پر زور دیا۔ اگرچہ عربی کی تعلیم بھی جاری رہی۔ مغلوں کی فارسی اور ہندوستان کے ہندوؤں کی ہندی کے امتزاج سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی۔ اس کا نام مغل بادشاہوں نے اُردو رکھا۔ اب انگریز ہندوستان میں آئے تو انگریزی زبان

کا دور دورہ ہوگیا۔ درس گاہوں میں آہستہ آہستہ انگریزی داخل ہوتی اور ہوتے ہوتے سارے ہندوستان کی دربار سرکار کی زبان قرار پائی۔ علمی، ادبی زبان بن گئی۔

۱۹۱۵ء کے بعد سے انگریزی کے خلاف تحریک پیدا ہوئی اور اس کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اردو کو سرکاری اور قومی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی اور انگریزی کو اب ثانوی حیثیت دے دی گئی مگر انگریزی اپنا میدان ہوتے ہوتے ہی چھوڑے گی۔

سب سے پہلی درس گاہ جو انگریز حاکموں کی سرپرستی میں قائم ہوئی۔ وہ اسلامیہ مدرسہ کلکتہ تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے ایک زمین کا رقبہ حاصل کیا۔ اور کلکتہ مدرسہ ۱۷۸۱ء میں قائم ہوگیا۔ ۱۷۹۱ء میں اس مدرسہ کا نصاب یہ تھا:۔

۱۔ علم طبعیات ۲۔ دینیات
۳۔ قانون ۴۔ ہیئت
۵۔ جیومیٹری ۶۔ ریاضی
۷۔ منطق ۸۔ علم البیان
۹۔ گرامر

اس مدرسے کا کورس سات سال کا تھا۔ مدرسے کے اساتذہ کے علاوہ ایک خطیب تھا جو قرآن پڑھاتا اور اسلامیات پر درس دیتا تھا۔ ایک مؤذن تھا۔ یہ دونوں طالب علموں کو نماز پڑھنے میں ہدایات دیتے تھے۔ ۱۸۵۰ء میں اس مدرسے کے چار شعبے ہوگئے:۔

۱۔ شعبۂ عربی ۲۔ شعبۂ اینگلو عربک
۳۔ شعبۂ انگریزی ۴۔ شعبۂ بنگالی

۱۸۷۱ء میں مدرسۂ اسلامیہ کلکتہ کا کورس حسب ذیل تھا:۔

عربی زبان میں

۱۔ گرامر۔ جنگِ صرف۔ فصول اکبری۔ جنگِ نحو۔ ہدایت النحو۔ کافیہ شرح ملا جامی۔
۲۔ منطق میزان المنطق۔ قطبی۔ میبذی۔ شرح تہذیب۔ مُسَلَّم
۳۔ علم البیان۔ مختصر المعانی۔ مُلّا
۴۔ قانون۔ شرح وقایہ۔ ہدایہ (دونوں میں سے انتخابات)
۵۔ اصولِ قانون۔ نور الانوار۔ توضیح۔ مُسَلَّم الثبوت
۶۔ ادب۔ نفحۃ الیمن۔ عجائب العجب۔ سبعہ معلقات۔ مقامات حریری دیوان متنبی
۷۔ تاریخ۔ تاریخ الخلفا از سیوطی۔ الشفا از قاضی عیاض
۸۔ قانونِ وراثت۔ فرائض شریفیہ۔

فارسی زبان میں

۱۔ اخلاق محسنی۔ یوسف زلیخا۔ سکندر نامہ۔ ابوالفضل۔

اب ہندوستان کی درس گاہوں کی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک وہ جو علوم مشرقی پڑھاتی تھیں۔ دوسری قسم کی درس گاہوں کی سرپرستی حکومت کرتی تھی۔ ان میں مشرقی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔ مگر ان کا مقصد مغربی علوم کو ہندوستان میں رواج دینا تھا۔ ان میں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا۔ ہندوستان میں کئی یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں۔ ان میں کلکتہ سب سے پہلی یونیورسٹی تھی۔

مغل حکومت کے زوال کے ساتھ اسلامی علوم میں بھی ہندوستان میں زوال

آ گیا ۔ ان کی وہ قدر نہ رہی ۔ نہ ان کی ملک میں مانگ تھی ۔ نہ ان کے فاضل بڑے بڑے عہدے حاصل کر سکتے تھے ۔ لارڈ منٹو وائسرائے ہند نے ۱۸۱۱ء میں لکھا کہ ہندوستان میں علم و فنون رو بہ تنزل ہیں ۔ نہ صرف یہ کہ عالموں کی تعداد میں کمی ہو گئی ہے ۔ بلکہ یہ کہ حلقۂ علم بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے ۔ اعلیٰ علوم کی تعلیم منقطع ہو گئی ہے ۔ ادب سے توجہ ہٹ گئی ہے ۔ سوائے مذہبی واقفیت اور شرعی علوم کے سب علوم کی تعلیم لوگوں نے ترک کر دی ہے ۔ ان حالات میں انگریزی کی تعلیم شروع ہوئی ۔ اور انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا ۔

اس ایک تعلیمی لغزش نے قوم کی تعلیمی ترقی میں بہت رکاوٹ پیدا کی ہے ذریعہ تعلیم اس وقت سے ہندوستان کی دیسی زبان ہونا چاہیئے تھا ۔ کلکتہ یونیورسٹی ہندوستان میں سب سے پہلے قائم ہوئی (نصف انیسویں صدی میں) اس وقت تک یہ مانا کہ اردو زبان اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی ۔ کہ اس میں سائنس اور فلسفہ کے مضامین پڑھائے جاتے ۔ لیکن حکومت اگر مائل ہوتی اور کوشش کی جاتی تو ایک بیس سال کے عرصہ میں ساری زمین تیار ہو سکتی تھی اور ہندوستان کی ذہنی ترقی صحیح معنوں میں شروع ہو جاتی ۔ انگریزی کے ذریعۂ تعلیم ہونے میں بڑا نقص یہ ہے کہ طالب پہلے تو ایک غیر زبان پر عبور کامل حاصل کرتا ہے ۔ اسی میں طالب کے دس پندرہ سال لگ جاتے ہیں ۔ پھر انگریزی کی علمی اصطلاحیں یاد کرنا دماغ پر بوجھ ہے اگر تعلیم اردو میں ہوتی تو دماغ پر بوجھ بہت کم پڑتا ۔ وہ قوت جو صرف غیر زبان کے سیکھنے میں خرچ کی جاتی ہے وہ علم اور فن کے سیکھنے میں خرچ کی جاتی ۔ طالب علم کا ذہن کھلتا اور وہ ایجادات اور تعمیر میں مصروف ہو جاتا ۔ ہمیں اس بات سے انکار نہیں کہ انگریزی فی زمانہ ایک مفید اور ضروری زبان ہے ۔ جسے تمام دنیا میں کاروباری زبان کی حیثیت حاصل ہے ۔ مگر انگریزی بطور زبان کے حاصل کرنا چاہئے تھی نہ کہ اسے ذریعۂ تعلیم بنا دیا جاتا ۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے (۱) دیسی زبانوں کی ترقی کو نقصان پہنچا (۲) عوام میں تعلیم عام نہ ہو سکی (۳) فنون اور سائنس کے

اعلیٰ طالب علم انگریزی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد نقال اور طوطے سے زیادہ پوزیشن نہیں رکھتے۔ ان میں ریسرچ ایجاد اور تنقید کا مادہ پیدا نہیں ہوتا۔

۱۸۵۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی کا بی۔ اے کا کورس حسب ذیل تھا۔

فارسی۔ سکندر نامہ۔ گلستان۔ دیوان حافظ۔ اخلاق جلالی۔ دیوانِ عرفی رقعات ابوالفضل۔

عربی۔ الف لیلیٰ۔ نفحۃ الیمن۔ اخوان الصفا۔ تاریخ الخلفاء (از سیوطی) تاریخ یمینی

اُردو۔ باغ و بہار۔ دیوانِ سودا (قصائد)

پنجاب یونیورسٹی کا افتتاح جنوری ۱۸۷۰ء میں ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی کے چارٹر میں یہ لکھا ہوا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی خاص طور پر اس غرض سے بنائی گئی ہے۔ کہ اس میں علوم مشرقی کی تعلیم خاص طور پر دی جائے۔ انگریزی زبان میں لکھی ہوئی معیاری کتابوں کو دیسی زبانوں میں ترجمہ کرایا جائے۔ مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لئے ایسی کتابیں انتخاب کی جائیں۔ جن سے طالب علم کی ترقی درجہ وار بڑھتی جائے۔ عربی سنسکرت فارسی کی تعلیم کو فروغ دیا جائے اور سنسکرت ہندی عربی۔ فارسی اردو میں امتحانات لئے جائیں۔

عربی۔ فارسی کے امتحانات کے کورس ۱۸۷۴ء۔ ۱۸۷۵ء میں حسب ذیل تھے

عربی کے امتحانات

مولوی

گرامر۔ ہدایت النحو۔ پنج گنج۔ کافیہ

ادب - کلکتہ کا ایف اے کا کورس - سنین الاسلام - الف لیلیٰ و لیلیٰ - مقامات حریری -

منطق - شرح تہذیب

قانونِ وراثت - سراجی

مولوی عالم

گرامر - شرح ملا - شافیہ

ادب - تاریخ تیموری (انتخاب) سبعہ معلقہ (انتخاب)

البیان - مختصر المعانی

منطق - قطبی - مسلّم

قانونِ وراثت - شریفی - قدوری

مولوی فاضل

البیان - مطول (فن المعانی تک)

ادب - مقاماتِ حریری - دیوان الحماسہ - دیوان المتنبی

عروض - عروض المفتاح

منطق - تصورات (از قاضی مبارک) تصدیقات (از حمداللہ) شرفیہ

فلسفہ - صدرا -

قانونِ وراثت - ہدایہ - معاملات

فارسی کے امتحانات

منشی

گرامر - رسالہ عبدالواسع - مفتاح الادب حصہ اول -

ادب - تحفۃ الاحرار - انشائے منیر - دیوانِ حافظ (انتخاب)

اخلاق - اخلاق جلالی (سیاست مدن تک)

منشی عالم

گرامر۔ چہار گلزار - منشآت ادب

ادب - قصائد عرفی - کلکتہ کا بی اے کا کورس - مہر نیمروز - ابوالفضل (دفتر اول) عربی ریڈر

اخلاق - اخلاق ناصری

منشی فاضل

البیان اور عروض - ہدایت البلاغہ - اعجاز خسروی

ادب - نعمت خان عالی - ظہورا - قصائد خاقانی - قصائد بدر چاچ -

درۂ نادرہ -

اخلاق - اخلاق جلالی -

یہی کتابیں کچھ ردو بدل کے ساتھ آج بھی مروج ہیں - طب کے امتحانات بھی پنجاب یونیورسٹی میں اس وقت تھے - حکیم حاذق - عمدۃ الحکماء اور زبدۃ الحکماء تین امتحان تھے یہ ڈگریاں نہ تھیں - ڈپلومے تھے - درسی کتابوں کے متعلق کچھ علم نہیں -

انگریزی عہد میں درس نظامیہ

تہذیب الاخلاق میں درس نظامی کا نصاب دیا گیا (جلد دوم ۳۰۸ - ۳۰۹)

سرسید کے عہد تک اس درس میں مضامین کا اضافہ ہو چکا تھا - پرانے مضامین کے نصاب کی کتابیں وہی ہیں یا ان میں کچھ اضافے کر دیئے گئے تھے -

مضامین زیر تعلیم یہ تھے - ادب، گرامر، عروض - زبان دانی - بیان - فلسفہ

منطق۔ طبیعات و مابعد الطبیعات۔ حساب۔ جیومیٹری۔ ہیئت۔ علم الکلام۔ شرع اسلامی۔ اصول شرع اسلامی۔ حدیث۔ اصولِ حدیث۔ لغت۔ طب
شیعوں کے لئے فقہ۔ حدیث۔ اصول فقہ علم الکلام۔ تفسیر کی چند کتابیں نصاب میں جُدا تھیں۔ فارغ التحصیل طلباء کے لئے ایک الگ جماعت تھی اس کا نصاب مندرجہ بالا نصاب سے بلند تھا۔

دورِ جدید میں (۱۹۲۵ء کے بعد سے) مدرسۂ عالیہ نظامیہ۔ فرنگی محل لکھنؤ کے نصاب میں اس مدرسہ کے مہتمم مولانا محمد قطب الدین عبدالولی کی نگرانی میں بھی تبدیلی کی گئی اور تعلیم کے شعبوں کو اس طریق سے تجویز کیا گیا۔

۱۔ ادب۔ صرف۔ نحو۔ بیان۔ عروض۔ نظم، نثر
۲۔ اعلیٰ جماعتوں کے لئے منطق۔ کلام۔ اصول حدیث۔ اصولِ فقہ۔
۳۔ دینیات۔ قرآن۔ تفسیر۔ حدیث۔ مذہبی استدلال۔ قانونِ وراثت۔ فقہ۔
۴۔ مفید عقلی علوم۔ فلسفہ۔ حساب۔ الجبرا۔ جیومیٹری۔ ہیئت دوربین کا استعمال۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ طب۔
۵۔ زبانیں۔ اردو۔ فارسی۔ انگریزی

لیجئے دورِ جدید نے اس درسگاہ میں بھی جو خالص مذہبی تھی آخر اپنا رنگ جما ہی لیا۔

دارالعلوم دیوبند

یو۔ پی میں سہارنپور کے قریب دیوبند کی درسگاہ ہندوستان کی تمام اسلامی درسگاہوں کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ اس میں مذہبی رنگ بھی سب سے زیادہ ہے۔ یہاں کا کورس آٹھ سال کا ہے۔ عربی زبان میں یہاں مندرجہ ذیل مضامین پڑھائے

علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نے ہندوستان میں بلکہ
ایشیا میں اپنا نام پیدا کیا ہے۔ اس کی خصوصیتوں کی بناء پر علی گڑھ کو شہرت حاصل
ہوئی۔ مگر علی گڑھ یونیورسٹی نے ابھی تک کوئی ایسا کام نہیں کیا۔ جس کی بناء پر
دنیا میں اس کا نام روشن ہوتا۔ یعنی اسلام کی خدمت کسی صورت میں چونکہ یہ
مسلم یونیورسٹی ہے۔ علوم اسلامی کی ترقی کسی رنگ میں تاریخ اسلام۔ فلسفۂ اسلام
اسلامی ادب کی ترقی وغیرہ نہیں تو یہ انگریزی ہیں کیمیا یا فلسفہ پڑھانا ہے تو ہندوستان
کی باقی تمام یونیورسٹیاں بھی کرتی ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ اس یونیورسٹی میں
مسلمانوں کی تعلیم کے لئے خاص سہولتیں میسر ہیں جو دوسری یونیورسٹیوں میں نہیں
تو اس کا رستہ یونیورسٹی نے اپنا حلقہ محدود کر کے ایک خاص جماعت کو تعلیم
دی۔ مگر اسلام کی کون سی خدمت کی۔ یہ خدمت ضرور ہے کہ مسلمان تعلیم یافتہ
ہو گئے اور اسلامی جماعت کو فروغ ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی چاہیئے تھا
کہ اسلام۔ اسلامی تعلیم اور اسلامی تہذیب کو فروغ ہوتا۔

ندوۃ العلماء

بعض مسلمان عالموں نے یہ دیکھا کہ علی گڑھ کا گریجویٹ مذہب سے دور ہٹتا
جاتا ہے اور فرنگی محل لکھنؤ کا فارغ التحصیل دنیا کے کاروبار میں کامیاب نہیں۔
اس لئے انہوں نے تعلیم کے ان دونوں سلسلوں کے درمیان ایک راستہ نکالا۔ مولانا
شبلی نعمانی نے اس کام میں خاص حصہ لیا۔ شبلی علی گڑھ میں عربی، فارسی کا پروفیسر رہے
تھے اور مشرقی علوم کا جید عالم تھے۔ ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں ایک دارالعلوم قائم
کیا گیا اور وہ اب بھی لکھنو یونیورسٹی کے قریب دریا گومتی کے شمالی کنارے موجود ہے
اس کا نام ندوۃ العلماء ہے۔ ندوۃ العلماء نے جو فارغ التحصیل طلبا نکالے ہیں

ان کا موازنہ کیا جائے تو وہ علی گڑھ اور فرنگی محل کے طلبا کے بین بین ہیں۔ ان کو جدید پروری کہہ لیں تو بجا ہے۔ ندوہ کا طالب علم شریعت اسلامی کا پابند ہے وہ اسلامی تہذیب اور تاریخ سے بھی واقفیت رکھتا ہے اور اس کا نظریہ حیات علی گڑھ اور فرنگی محل کا امتزاج ہے۔

ندوہ کے چار شعبے ہیں :- (۱) ابتدائی (۲) عالمیت (۳) فضیلت (۴) تکمیل۔

۱۔ ابتدائی ۴ سالوں کا ہے۔ اس میں اردو۔ فارسی۔ حساب۔ ڈرائنگ۔ ابتدائی جغرافیہ۔ ہائی جین۔ تاریخ خلفا پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ قرأت قرآن۔ وضو۔ نماز اور اخلاق اسلامی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

۲۔ عالمیت ۶ سالوں کا کورس ہے۔ اس میں عربی زبان۔ ادب۔ گرامر بیان پڑھایا جاتا ہے۔ فقہ۔ اصولِ حدیث۔ منطق۔ فلسفہ۔ قرآن عقائد۔ سیرتِ رسول۔ تاریخ اسلام۔ تاریخ ہند۔ حساب۔ الجبرا جغرافیہ اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔

۳۔ فضیلت۔ اس کا کورس تین سال کا ہے۔ اس میں یہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ (۱) عربی ادب (۲) نثر اور نظم (۲) اصول فقہ (۳) اصول حدیث (۴) حدیث (۵) تفسیر (۶) تصوف (۷) قرآن (۸) عقائد (۹) کلام (۱۰) قدیم اور جدید فلسفہ (۱۱) تاریخ فلسفہ (۱۲) ہیئت (۱۳) سیاست (۱۴) اقتصادیات (۱۵) اخلاق (۱۶) تاریخ اسلام

(۱۷) انگریزی میٹریکولیشن کا کورس

۴۔ تکمیل۔ اس کا کورس دو سال کا ہے۔ طالب فضیلت کا درجہ حاصل کرنے کے بعد فارغ التحصیل ہو جاتا ہے۔ تکمیل اس کے بعد کا کورس ہے

اس شعبہ میں طالب علم ایک تحقیقی مقالہ لکھتا ہے۔ فی الحال ادب اور دینیات پر مقالے لکھنے کا انتظام ہے۔

۵. شعبہ تبلیغ۔ یہ شعبہ دینیات کے لئے ہے اور اس کا کورس دو سال کا ہے (۱) اس میں علم اسلام کی تعلیم دی جاتی ہے جس سے مراد ہے کہ اسلام کی تشریح جدید فلسفہ کی رو سے کی جائے (۲) دیگر مذاہب کی مذہبی کتابوں کی تعلیم ہوتی ہے (۳) اور خطابت سکھائی جاتی ہے۔ یعنی تقریر کرنا۔ مناظرہ۔ بحث میں حصہ لینا۔

عثمانیہ یونیورسٹی

اپریل ۱۹۱۷ء (رجب ۱۳۳۵ ہجری) میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اس یونیورسٹی کا مقصد یہ ہے کہ عہد جدید اور عہد قدیم کے علم اور تمدن کا اس طرح سے امتزاج پیدا کیا جائے کہ موجودہ دور کی تعلیم کے نقائص دور ہو جائیں اس یونیورسٹی میں ایک بات قابل توجہ ہے کہ ذریعہ تعلیم مادری زبان یعنی اردو ہے۔ مگر تمام طلبا کے لئے بی اے تک انگریزی زبان کی تعلیم بھی لازمی ہے۔

اس یونیورسٹی نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک دارالترجمہ بنایا۔ اس میں یونیورسٹی کی تمام نصاب کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا۔ تاکہ طلبا ان کتابوں کو بطور نصاب کے استعمال کر سکیں۔ فلسفہ اقتصادیات۔ ریاضی۔ فزکس۔ کیمسٹری۔ قانون علم النباتات۔ علم الحیوانات۔ انجینئرنگ۔ طب۔ غرض تمام مضامین کی کتابیں ایم۔ اے تک کے کورس، ترجمہ کر ڈالے۔ اگست ۱۹۱۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج کی جماعتیں جاری ہو گئیں۔

اب عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق دائرۃ المعارف بھی ہے۔ اس کی بنا اصل

میں نواب عماد الملک نے ڈالی تھی اور اس ادارے کا کام قدیم معروف مشرقی
...نب کی اشاعت ہے۔ اب یہ ادارہ یونیورسٹی کے ماتحت کردیا گیا ہے اس
یونیورسٹی میں ایک عورتوں کا کالج بھی ہے جس میں سائنس اور آرٹ دونوں
کی تعلیم دی جاتی اور عورتیں پردہ میں رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتی ہیں ۔

اس نظام تعلیم کی خصوصیات یہ ہیں۔ یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے انگریزی۔ دینیات اور اخلاقیات لازمی ہیں۔ ہر طالب علم کے لئے ان کا پڑھنا ضروری ہے۔ اختیاری مضمون وہ اپنی منشا کے مطابق انتخاب کرسکتا ہے۔ ابتدا میں اختیاری مضمونوں کی تعداد بہت بڑی ہے جس میں سے ایک طالب علم اپنے لئے چند انتخاب کرتا ہے۔ مضمونوں کے گروپ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ طالبعلم ...ے کی جماعتوں میں ایک مضمون کو اپنا مخصوص مضمون بنا کر اسے پوری شدت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ ایم اے میں اس مضمون کو تحقیق کا میدان بنا کر طالب اپنا ...انہ لکھنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ جو کورس اس یونیورسٹی کے لئے معین کئے گئے ہیں وہ دیگر ہندوستانی یونیورسٹیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ان پر بحث کی ضرورت ... دینیات کے علاوہ ہے۔ اس لئے دینیات کے کورس کی کتب بیت ... ی ہیں۔

یونیورسٹی میں دینیات کا لازمی کورس

لیشنی ۱:- عقائد۔ فقہ الاکبر، مرقات

۲: فقہ اور حدیث۔ ملتقی الابحر۔ شمائل (از ترمذی)

... ۱۔ فقہ اور اصول فقہ۔ شرح وقایہ۔ فرائض السراجی

اصول شاشی۔

۲- تفسیر اور حدیث۔ قرآن (انتخاب) مشکوٰۃ المصابیح (انتخاب)

۳- عقائد اور مبادی الحکمت۔ عقائد النسفی۔ شرح عقائد النسفی (انتخاب) ہدایت الحکمت۔ شمسیہ

ب۔ اے ۱- فقہ اور اصول فقہ۔ ہدایہ (انتخاب) مرآت الاصول و شرح مرقات الاصول) تفسیر (البیضاوی) (سورہ بقر) قرآن۔ (جو حصہ انٹرمیڈیٹ میں داخل ہے وہ خارج ہے) کلام۔ اساس التقدیس از امام رازی۔ حجت اللہ البالغہ (انتخاب)

ایم۔ اے ۱- کلام اور عقائد۔ التفریق بین الاسلام والزنادقہ محصل (رازی) نقد المحصل (طوسی) شرح المقاصد (تفتازانی) دین و دانش (اردو میں)

۲- تفسیر الکشاف (کتاب اول۔ کتاب آخر) بیضاوی (کتاب ۲ اور ۹) اعجاز القرآن (باقلانی) تفسیرات احمدی تمہید تفسیر (طبری)

۳- حدیث اور سیرت۔ حدیث:- بخاری۔ ترمذی۔ شرح معانی الآثار (طحاوی) مختصر اصول الحدیث مقدمہ ابن صالح: رجال البخاری (فتوح الباری کی تمہید) سیرت۔ سیرت الرسول (ابن ہشام) تلخ فائح جیسا کہ سہیلی کی کتاب روضۃ الانف میں درج ہے۔

۴- فقہ اور اصول فقہ۔ الصنائع والبدائع (انتخاب) بدایۃ المجتہد جو حصہ الصنائع والبدائع ہے وہ خارج۔ مجلۃ الاحکام۔ آثار السنن۔ اصول فقہ مسلّم الثبوت جنانیہ

یونیورسٹی کی تجویز اور نظام اس طرح سے بنایا گیا۔
کہ یہ تدریس علوم و فنون، تحقیق اور فروغ علوم میں دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹی
کا مقابلہ کر سکے۔ اس یونیورسٹی میں نصاب تو وہی ہے جو دوسری یونیورسٹیوں میں
ہے۔ اگرچہ ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ مگر اس درس گاہ میں طالب کا مزاج تحصیل علم
کے لئے زیادہ مستعد نظر آتا ہے۔ وہ علمی حقائق کو بہتر سمجھتا ہے اور سائنس کی اہمیت
ان طلبا سے بلند ہے۔ جن کی تعلیم انگریزی ہوتی ہے

ہندوستان کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ مسلمانوں کی سیاسی،
اقتداری اور سماجی حالت میں تبدیلی آگئی۔ تعلیمی فضا بدل گئی۔ اسلامی علوم سے
دلوں کی توجہ ہٹ گئی۔ عورتوں کی تعلیم میں بہت کمی آگئی۔ عورتوں کو صرف قرآن کا
پڑھنا سکھا دیا جاتا تھا۔ بعض گھروں میں اردو پڑھنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بہت
کم گھرانوں میں اعلیٰ تعلیم کی ضرورت سمجھی جاتی تھی وہ بھی صرف فارسی تک محدود
رہتی۔

زمانہ بدلا۔ انگریزی علوم ہندوستان میں آگئے اور ہندوستان والوں کا نظریۂ
حیات ایک حد تک بدل گیا۔ انہوں نے عورتوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی۔
علی گڑھ۔ لکھنؤ۔ لاہور۔ بمبئی۔ کلکتہ۔ حیدرآباد میں عورتوں کے اسکول اور
کالج بنائے گئے۔ مگر لڑکیوں کی جتنی تعداد ملک میں زیر تعلیم تھی۔ وہ نسبت کے
لحاظ سے بہت کم تھی۔ مردوں کے لئے تو مغربی تعلیم روزگار کا دروازہ کھولتی ہے
مگر عورتوں کے لئے اس کی ضرورت نہیں۔ اس لئے عورتوں نے اس میں دلچسپی
نہ لی۔ مثلاً اقتصادیات اور ریاضی عورتوں کے کام کے نہیں۔ دور جدید
میں عورتوں سے مناسبت رکھنے والے مضامین صرف عورتوں کے لئے کورس میں
رکھے گئے۔ مثلاً نقاشی، موسیقی، گھریلو حساب وغیرہ یہ اس زندگی کے لئے مفید
ہیں جو عورتوں نے گھر میں رہ کر گزارنی ہے اس لئے عورتوں کی دلچسپی تعلیم

میں بڑھ گئی۔

مسلم تہذیب کے ہاں پردہ کا رواج ہے اور عورتوں کو اپنی مرضی کے استعمال کرنے کا موقع کم ملتا ہے۔ اس لئے شروع شروع میں اسلامی سماج میں نسائی تعلیم کی طرف بہت کم توجہ ہوئی۔ جب ہندو سماج کی عورتیں میدانِ تعلیم میں آگے نکل گئیں تو مسلمانوں کو ہوش آیا۔ ہندوؤں کا نظریۂ حیات۔ نظریۂ تعلیم اور نظریہ ستر مسلمانوں سے مختلف ہے۔ اس لئے انہیں مغربی تعلیم حاصل کرنے میں باک نہ تھا۔ جب زندگی کی دوڑ میں مسلمان عورتیں پیچھے رہ گئیں تو مسلمان جماعت نے نسائی تعلیم میں دلچسپی لی۔

دورِ جدید میں چند پیشے ایسے ہیں جن میں صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں ہی کام کر سکتی ہیں۔ مرد ان کاموں کو نہیں سنبھال سکتے۔ مثلاً لیڈی ڈاکٹر، لڑکیوں کی معلمہ زنانہ کاپریٹو۔ زنانہ دستکاری وغیرہ یہ سب عہدے تعلیم یافتہ ہندو عورتوں کے ہاتھ میں چلے گئے تو مسلمانوں کو محسوس ہوا اور انہوں نے اس بات کی ضرورت سمجھی کہ اسلامی جماعت میں اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتوں کا ہونا بھی لازمی ہے تاکہ سماج کی ترقی ہر پہلو سے ہوتی رہے۔ اس طرف اب رجحان بڑھ رہا ہے۔

پاکستان کے وجود میں آنے سے ملت اسلامیہ پاکستان نے ایک مختلف صورت اختیار کر لی ہے۔ پاکستان میں اب مسلمانوں کی کثیر اکثریت ہے جو پیشے صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہیں ان میں آسامیوں کے پُر کرنے کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان عورتوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں عورتوں کی تعلیم کے لئے تمام سہولتیں پیدا کرنی چاہئیں تاکہ ملت کی ترقی ہموار ہو۔

سید مصطفےٰ حسن رضوی

تقسیم سے پہلے مسلمانانِ پنجاب کی تعلیم

علی گڑھ تحریک کو دورِ اول میں پنجاب سے جو مالی اور اخلاقی امداد ملی اس کی جھلکیاں سر سید علیہ الرحمۃ کے سفر نامہ پنجاب میں موجود ہیں۔ ان کی وفات کے بعد بھی علی گڑھ، پنجاب کے مسلمانوں کی قومی امنگوں اور آرزوؤں کا مرکز بنا رہا۔ ۱۹۰۲ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں اربابِ ادارہ نے حسبِ ذیل ریزولیشن پاس کر کے عظیم صوبہ پنجاب کے مسلمانوں سے اپنی گہری دلچسپی اور وابستگی کا بھرپور اظہار کیا۔

"اس کانفرنس کو علم ہوا ہے کہ دفعہ (۲۴۰) ایجوکیشن کوڈ پنجاب کی رو سے جو حقوق مسلمانانِ پنجاب کو گورنمنٹ نے عطا کئے ہیں ان کی حفاظت کا کوئی ذریعہ اس وقت تک سر رشتۂ تعلیم میں نہیں ہے۔ اس لئے کانفرنس کا فرض ہے کہ گورنمنٹ پنجاب کو توجہ دلائے اور استدعا کرے کہ ڈائریکٹر صاحب سر رشتۂ تعلیم پنجاب اس کی کافی نگرانی کریں۔

اور ایسے نقشے ہر ایک مدرسہ میں تیار کرائیں۔ جس سے پورا علم، تعداد طلباء کا مع وجوہ کے حاصل ہو سکے۔

محرک۔ سید غلام بھیک نیرنگ   موئید۔ خواجہ غلام الثقلین

مندرجہ بالا تجویز کے علاوہ ملک بھر میں منعقد ہونے والے اجلاسوں میں مسلمانانِ پنجاب کے تعلیمی اور سماجی مسائل کو ہمیشہ اولیت دی گئی۔ نیز اس صوبہ میں بھی حسب ذیل مقامات پر وقفہ وقفہ سے کانفرنس کے عظیم الشان سالانہ اجلاس منعقد ہوئے۔

۱۔ لاہور ۱۸۸۸ء زیر صدارت سردار محمد حیات خان

۲۔ لاہور ۱۸۹۸ء زیر صدارت نواب فتح علی قزلباش

۳۔ امرتسر ۱۹۰۸ء زیر صدارت نواب سر خواجہ سلیم اللہ (نواب ڈھاکہ)

۴۔ دہلی ۱۹۱۱ء زیر صدارت نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی[1]

۵۔ راولپنڈی ۱۹۱۴ء زیر صدارت خان بہادر مولوی سر رحیم بخش

۶۔ رہتک ۱۹۳۱ء زیر صدارت سر سید رضا علی۔

۷۔ لاہور ۱۹۳۲ء زیر صدارت کرنل مقبول حسین قریشی[2]

صاحبزادہ آفتاب احمد خان مرحوم آنریری جوائنٹ سیکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ سالانہ کانفرنس کے موقع پر ایک مبسوط اور تفصیلی رپورٹ پیش کرتے تھے۔ یہ طویل رپورٹیں اپنے دامن میں بے شمار علمی و قومی معلومات اور تعلیمی سیاست کے اتار چڑھاؤ نیز مقامی مسلمانوں کے مسائل کی آئینہ دار ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قومی تعلیمی تاریخ لکھتے وقت مستقبل کا کوئی بھی مورخ ان تاریخی یادداشتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ۱۹۰۸ء میں امرتسر میں مسلمانانِ ہند کے عظیم تعلیمی اجتماع بڑی حسین یادوں کا حامل ہے۔ یہ وقت تھا جب پنجاب کے ہندو اور سکھ صوبہ سے اردو زبان کو خارج کر کے ہندی، پنجابی اور گورمکھی کو رائج کرنا چاہتے تھے حکومت وقت کو متاثر کرنے کے جملہ انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ غیر مسلموں کی پروپیگنڈا

مشنری زور وں پر تھی لیکن جب پنجاب یونیورسٹی کا نووکیشن ایڈریس پڑھتے ہوئے ڈاکٹر پی سی چٹرجی نے یہ تجویز پیش کی کہ پنجابی زبان کو اردو کی بجائے رواج دیا جائے تو مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ان کو اندازہ ہو گیا کہ زبان کی تبدیلی کی آڑ میں مسلمانوں کے اتحاد ملی کے خاتمہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس لئے قوم کے صائب الرائے حضرات نے طے کیا کہ امرتسر میں ایک آل انڈیا کنونشن منعقد کیا جائے۔ یہ تجویز بڑی بروقت اور برمحل تھی۔

امرتسر میں اجلاس کانفرنس کی دعوت کا سہرا تین بزرگوں کے سر رہا۔

۱۔ خان بہادر شیخ غلام صادق ۲۔ خان بہادر خواجہ یوسف شاہ اور ۳۔ جناب بابو نظام الدین[1]

اجلاس کانفرنس کے واسطے حسب ذیل مجلس استقبالیہ قائم ہوئی تھی۔

۱۔ شیخ غلام صادق رئیس و آنریری مجسٹریٹ صدر۔ ۲ شیخ محمد جمیل رئیس و آنریری مجسٹریٹ نائب صدر ۳۔ میر حبیب اللہ رئیس و آنریری مجسٹریٹ۔ آنریری سیکرٹری۔ ۴ بابو نظام الدین رئیس و تاجر جوائنٹ سیکرٹری ۵۔ خان بہادر خواجہ یوسف شاہ رئیس ۶۔ میاں غلام نبی رئیس و سوداگر ۷۔ جناب محکم الدین مختار ۸۔ میاں حفیظ الدین پلیڈر ۹ شیخ نور احمد ۱۰۔ شیخ حبیب اللہ ۱۱۔ بابو میراں بخش مختار عدالت و میونسپل کمشنر ۱۲۔ حافظ احمد اللہ ۱۳۔ میاں حبیب اللہ بیرسٹر ۱۴۔ شیخ محمد عمر بیرسٹر ۱۵۔ سیٹھ عبدالاحد ۱۶۔ خواجہ احمد شاہ مختار ۱۷۔ مولوی غلام محمد شاہ مختار ۱۸۔ شیخ علی احمد ۱۹۔ سردار محمد فخر الدین ۲۰۔ میاں عزیز اللہ ۲۱۔ میاں حسام الدین ٹھیکیدار ۲۲۔ میاں نظام الدین ٹھیکیدار۔

۲۶ دسمبر ۱۹۰۸ء کو گیارہ بجے کلکتہ میل سے سر خواجہ سلیم اللہ نواب بہادر ڈھاکہ صدر کانفرنس اور سر علی امام بیرسٹر ایک پارٹی کے ساتھ جس میں نواب سید سرفراز حسین خان رئیس پٹنہ۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی[2] عبداللہ المامون اور

---

[1] سیکرٹری تھے تمام تعلیمی مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور عملی امداد سے شریک رہتے تھے ہر سال دفتر کانفرنس کے حسابات کی جانچ پڑتال میں دو تین ہفتے صرف کرتے تھے۔ کالج خصوصاً کانفرنس کو مرحوم کی جدائی سے سخت صدمہ پہنچا[2] ہمارے مخدوم مولوی حسن مثنیٰ ندوی کے دادا صاحب قبلہ

صوبہ پنجاب کی ورنیکلر زبان نہیں ہے۔ نہایت زور سے اختلاف کرتی ہے اور اس کی اس تجویز سے کہ صوبہ کی ابتدائی تعلیم پنجابی کی وساطت سے ہونی چاہیئے۔ ہرگز اتفاق نہیں کرتی اور اس تجویز کو نہ صرف ناممکن العمل بلکہ تعلیمی لحاظ سے صوبہ کے حق میں سخت مضر سمجھتی ہے ؟"

میاں محمد شفیع نے مندرجہ بالا ریزولیشن پیش کرتے ہوئے فرمایا "پچھلے عرصہ میں جو طوفان اردو ، ہندی کا صوبہ جات متحدہ آگرہ اودھ میں برپا تھا اس وقت معلوم ہو گیا تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ طوفان پنجاب پر بھی حملہ آور ہوگا۔ لیکن یہ نہ معلوم تھا کہ یہاں پر یہ حملہ کس صورت میں ہوگا اور اس کا بانی کون ہوگا۔ لیکن آپ صاحبان کو معلوم ہے کہ یہ حملہ کس نے کیا۔ کسی پنجابی نے نہیں اور نہ کسی اس شخص نے جس کو پنجابی یا اردو زبان سے کوئی تعلق ہے بلکہ یہ حملہ کیا ہے ایک بنگالی (ہندو) نے (شرم) (شرم) یہ لوگ ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد اور اتفاق کے دعویدار رہیں اور کہتے ہیں۔ کہ ہم ہندو اور مسلمانوں کو ملانا چاہتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس اتحاد اور اتفاق کے ذریعہ یعنی اردو زبان کو حقیقتاً لنگڑا فرانیکا ہے مٹانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر چیٹرجی (شرم) اُردو کو ہندوستان کی لنگوا فرانکا تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ پنجاب میں پنجابی پڑھاؤ اور دوسرے صوبوں میں وہاں کی (زبان)۔

بابو چیٹرجی فرماتے ہیں :-

—— اردو زبان کی اشاعت میں مسلمان اصحاب اسی وجہ سے سرگرمی سے مدد دیتے ہیں کہ ان کے لئے وہ اسلامی عروج کی نشانی ہے ؟"

صاحبو! چیٹرجی کا یہ بیان قطعی غلط ہے۔ اردو زبان ہم کو اپنی قومیت اور عروج یاد نہیں دلاتی۔ بلکہ ہم کو یاد دلاتی ہے ہماری وہ بے تعصبی کہ ہندی اور سنسکرت الفاظ کو استعمال کرنے سے ہم نے پرہیز نہیں کیا۔ (چیرز)

حضرات! میں پنجاب چیف کورٹ میں پریکٹس کرتا ہوں اور خدا کے
فضل سے میری پریکٹس سب سے زیادہ ہے۔ اس لئے میں اپنے ذاتی تجربہ سے
کہتا ہوں کہ پنجاب کے ہر ضلع کی پنجابی مختلف ہے۔ اگر مدرسوں میں اس قسم کی
پنجابی زبان کی تعلیم دی جائیگی جو وقت کاروبار میں ہوگی۔ وہ ظاہر ہے۔
پنجاب میں برسوں سکھوں کی حکومت رہی۔ مگر انہوں نے باوجود ہر قسم کے
اقتدار کے پنجابی زبان کو مدارس میں مروج نہیں کیا (تالیاں) اب یہ آتے ہیں
مدعی سست گواہ چست۔

ڈاکٹر چیٹرجی نے اپنے ایڈریس کے آخر میں طالب علموں اور خصوصاً پنجاب

یونیورسٹی کے گریجویٹس (جن کی اکثریت ہندوا ور سکھوں پر مشتمل تھی) کو مخاطب
کرکے پنجابی کی تائید کے لئے اپیل کی ہے۔
یہ ضروری ہے کہ تم انگریزی پڑھو۔ مگر تم بخوبی جان سکتے ہو کہ علمی دنیا میں
اس زبان کے ذریعے سے تم کہاں تک شہرت حاصل کرسکتے ہو۔ اس طلب کے لئے
تم کو اپنی زبان ہی کا آسرا ڈھونڈنا پڑے گا۔
اگر یہ گری ہوئی خراب حالت میں ہے تو تمہیں اس سے ویسی ہی نفرت نہ
کرنی چاہئے جیسی تم اپنی غریب اور بدزیب ماں سے نفرت نہ کروگے۔
حضرات! ان الفاظ کے ساتھ نوجوانوں کو پنجابی کی حمایت کے لئے ابھارا
گیا تو کیا اب وہ وقت نہیں آگیا کہ ہم بھی جس طرح ممکن ہو اردو زبان کی حمایت کے
لئے کمربستہ ہوں۔ اب ہم سب پنجابیوں کو لازم ہے کہ اپنے اپنے گروہ میں پنجابی
بولنا ترک کردیں اور اس کی بجائے اردو بولیں۔ اسی طرح اردو کا دفاع ہوگا اور
اس مسئلہ پر ہماری قومی زندگی منحصر ہے۔
ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلیمی تناسب کے بارے میں صاحبزادہ آفتاب احمد
خان نے حسب ذیل اعداد و شمار پیش کئے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیم کا موازنہ

۰۷-۱۹۰۶ء - ہندو طلبا - ۲۱،۲۷ - ۹۱ فیصد مسلمان طلبا - ۲۶۹ - ۵۷ فیصد

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو آبادی کے لحاظ سے ہندو بمقابلہ مسلمانوں کی تعداد میں کم ہیں۔ لیکن پرائمری تعلیم میں (بھی) وہ ہماری قوم سے زیادہ ہیں۔ اس صوبہ میں پرائمری تعلیم کا مسئلہ توجہ کے قابل ہے۔۔۔ جو لوگ مسلمانوں کے افلاس سے واقف ہیں وہ ان کی تعلیمی عزورتوں کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں صوبہ متحدہ کے انسپکٹر صاحب نے اپنی رپورٹ میں تحریر فرمایا ہے کہ :-

"بہت سے ایسے لوگوں کے بچے جو کاشت کار پیشہ نہیں ہیں۔ ان وجہ سے تعلیم سے محروم رہتے ہیں کہ فیس ادا کرنے کی ان میں استطاعت نہیں ہے۔ (رپورٹ اجلاس کانفرنس امرتسر صفحہ ۲۶)

سیکنڈری تعلیم

ثانوی تعلیم میں مسلمان طلبا کی تعداد ہندو طلبا سے اور بھی کم ہے۔

---

[1] اعداد و شمار کے مختلف ماخذ تلاش کرنے کے بعد تھوڑا بہت اختلاف تو نظر آتا ہے لیکن مجموعی تاثر بالآخر یہی قائم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی حالت ابتر تھی مثلاً ۱۹۱۴ء کے کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں مولوی نور احمد نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا "بدنصیب قوم مسلمان باوجود اس شور و شغب کے جو تعلیم کے واسطے خود سر سید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تابعین نے کیا۔ تعلیم کی طرف آج تک ویسے متوجہ نہیں ہوئے جیسا کہ چاہیے تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے اس مشہور زندہ دل صوبہ میں جس کی مسلمان آبادی زیادہ ہوتی ہے اور جس کو پنجاب کہتے ہیں عملی مدارس میں طلبا کی اس وقت یہ کیفیت ہے"

کالج		سیکنڈری اسکول		پرائمری اسکول		مکتب/ دیہات	
ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان
۱۳۶۰	۴۳۰	۴۲۴۴	۲۱۳۳	۷۰۴۵۷	۵۰۴۴۰	۱۱۴۵۵۷	۱۱۳۰۳

ہندو طلبا — ۴۰٫۹۹۳ مسلمان طلبا — ۲۱٫۵۳۲

گویا مسلمان طلبا تعداد میں ہندوؤں سے (تقریباً) نصف ہیں - لہ

لاء کالج

ہندو ۱۸۸ - ۸۴٫۷ فیصد مسلمان ۳۴ ، ۱۵٫۳ فیصد

اورنٹیل کالج

ہندو ۴۲ - ۴۶٫۶ فیصد مسلمان ۴۸ ، ۵۳٫۲ فیصد

میڈیکل

ہندو ۲۰۰ - ۸۶٫۶ فیصد مسلمان ۳۱ - ۱۳٫۴ فیصد

مسلمان ملازمین محکمہ ہائے تعلیم

گریڈ ۳۰۰ ے ۴۰۰ کوئی مسلمان نہیں گریڈ ۳۰۰ ۴۰۰۰ ایک ہندو

کل صوبہ میں ۳۰۰ روپے کے گریڈ میں صرف ایک مسلمان ملازم تھا - ۲۵۰ روپے کے گریڈ میں دو ہندو اور کوئی مسلمان نہیں تھا. دو سو روپے کے درجہ میں دس ہندو اور صرف دو مسلمان تھے -

	ہندو	مسلمان
گریڈ درجہ اول	۱۳	۳
گریڈ درجہ دوم		
۱۶۰ - ۱۰۰	۵۵	۳۰
۶۰ - ۹۰	۹۵	۳۰
۴۵ - ۵۵	۸۴	۶۳
۳۰ - ۴۰	۱۲۷	۹۵
۱۰ - ۲۵	۱۴۸	۹۹

اسلامیہ کالج

ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب کی رپورٹ بابت ۱۹۰۶ء کے مطابق اسلامیہ کالج میں طلبا کی تعداد ۸۹ تھی جس میں ۱۶ فرسٹ ایئر، ۴۷ سیکنڈ ایئر، ۱۱ تھرڈ ایئر ۱۴- فورتھ ایئر اور ایک ایم اے پر مشتمل تھی۔[۱]

---

[۱] اسلامیہ کالج لاہور میگزین بابت ستمبر ۱۹۱۲ء میں اسلامیہ کالج میں طلبا کی تعداد میں قدرے اختلاف ہے جو درج ذیل ہے :-

۱۹۰۴ء	۱۹۰۵ء	۱۹۰۶ء	۱۹۰۷ء	۱۹۰۸ء	۱۹۰۹ء	۱۹۱۰ء	۱۹۱۱ء	۱۹۱۲ء
۶۴	۹۲	۱۰۴	۸۱	۹۸	۱۱۴	۱۳۶	۱۸۶	۲۰۰

۱۹۰۷ء تعداد طلباء کلاس وار

ایم - اے	چوتھا سال	تیسرا سال	دوسرا سال	پہلا سال	کل
۲۰	۱۵	۱۰	۲۸	۲۵	۸۰[۲]

---

[۲] صاحب رپورٹ نے دیگر اقسام کے کالجوں کی تفصیل نہیں دی ہے۔ مولوی نور احمد ہیڈ ماسٹر نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ میں وٹیرنری اور ریلوے ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ لاہور میں مسلمان طلبا کے متعلق حسب ذیل اعداد و شمار مہیا کئے تھے۔

وٹیرنری کالج		ریلوے ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ لاہور	
مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو - سکھ
۸۳	۳۵	۳۱۲	۱۲۹

لطف کی بات یہ ہے کہ ہندوؤں کا ایک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ علیحدہ بھی کام کر رہا تھا جس میں مسلمانوں کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۱۹۰۷ء کا بج امتحانات

کل تعداد طلبا انٹر.	پاس
۴۷	۱۸
کل تعداد طلبا بی ۔ اے	پاس
۱۶	۶
۱۹۰۸ء کل تعداد ایف اے	پاس
۲۷	۱۳
کل تعداد بی ۔ اے	پاس
۱۵	x

سلامیہ اسکول

سی ۔ ۔ ول کے بارے میں ڈائریکٹر تعلیمات کی رپورٹ بہت امید افزا تھی جس کا
ز ے ور ی ذیل ہے ”یہ اسکول تقریباً ہر حیثیت سے بہت عمدہ اور قابل اطمینان
ا ہے۔ بلحاظ طلبا غالباً صوبہ میں سب سے بڑا ہے۔ اس سال طلبا کی
۸ ۔ ۶۱ تھی اور ۶۰ استاد تھے ۱۰ اس اسکول سے اسال ۱۹ طلبا انٹرنس کے
سال ۔ شریک ہو ئے۔ ان میں سے ۳۲ پاس ہوتے۔ مڈل میں ۳۷ شریک ہو کر ۵۸
۔ ۔ ۔ ۔ مڈل میں ۱۳۰ شریک ہو کر ۱۰۹ پاس ہوتے۔ اس طرح پرائمری کی جماعت
۔ ۔ ے کر مڈل تک جو طلبا شریک ہوئے ان کی تعداد ۳۰۷ تھی جو پاس ہوئے
۔ کی ۔ ۲۵ ۔ ہے۔

مدرسہ حمیدیہ

اس مدرسہ میں دینیات کے علاوہ مشرقی علوم کی تعلیم ہوتی تھی اور اس کے طلباء یونیورسٹی کے امتحانات مولوی، مولوی عالم اور مولوی فاضل کے لئے تیار کئے جاتے تھے۔

انجمن حمایت اسلام کے کاموں کے علاوہ ۱۹۰۸ء میں مندرجہ ذیل مسلم ادارے ترویج تعلیم اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا فرض انجام دے رہے تھے۔

۱- اسلامیہ اسکول امرتسر ۲- اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی ۳- صاحبزادہ ہائی اسکول دہلی ۴- اینگلو ورنیکلر اسلامیہ اسکول جالندھر ۵- تعلیم الاسلام ہائی اسکول قادیان ۶- اسلامیہ اسکول دیال پور ۷- اسلامیہ اسکول قصور، ۸- اینگلو ورنیکلر ہائی اسکول راولپنڈی ۹- اینگلو ورنیکلر پرائمری اسکول گوجرانوالہ ۱۰- اسلامیہ اسکول ملتان ۱۱- اسلامیہ اسکول ڈیرہ غازی خان ۱۲- اسلامیہ اسکول چنیوٹ

انجمن اسلامیہ امرتسر ۱۸۷۲ء میں قائم ہوئی۔ اس جماعت کا ابتدائی بڑا کام اسلامیہ اسکول امرتسر کا قیام تھا۔ ۱۸۸۵ء میں اس کو ہائی اسکول کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس وقت سے تقسیم ملک تک کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔ ۱۹۰۸ء میں اس میں ۵۹۹ طلبا تھے۔ اسکول سے متعلق ایک بورڈنگ ہاؤس بھی تھا۔ میٹرک میں ۲۴ طلبا اس اسکول کے پاس ہوتے تھے۔

انجمن اسلامیہ امرتسر مندرجہ اسلامیہ ہائی اسکول کے علاوہ چار ادارے اور چلاتی تھی۔

۱- ایم۔ او ہائی اسکول

۲- مسلم ہائی اسکول امرتسر جس کے ہیڈ ماسٹر خواجہ محمد عمر خان مرحوم و مغفور تھے۔

۳۔ اسلامیہ گرلز ہائی اسکول امرتسر

۴۔ اسلامیہ ہائی اسکول کٹڑہ خزانہ (یہ اسکول اب لاہور میں قائم ہے)۔

کہا جاتا ہے کہ سر سید نے اپنی درسگاہ کے لئے علی گڑھ سے قبل امرتسر کا انتخاب کیا تھا۔ جناب نصراللہ خان نے بڑے دلآویز انداز میں اپنی یادداشت تحریر فرمائی ہے:۔

"یہ سرخ رنگ کی دو منزلہ عمارت امرتسر کے ایم اے او ہائی اسکول کی ہے۔ اس کے ایک گوشہ میں یعنی اس عمارت کی دوسری طرف ایک سُرخ رنگ کی مسجد ہے۔ یہ مسلم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مسجد کا نمونہ ہے یا اس نمونہ کو سامنے رکھ کر علی گڑھ یونیورسٹی کی مسجد بنائی گئی۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ سر سید احمد خان نے علی گڑھ میں مسلمانوں کی درسگاہ بنانے سے پہلے امرتسر کو پسند کیا تھا۔ چنانچہ امرتسر کے ایم اے او اسکول کی بنیاد سر سید نے رکھی تھی۔ پھر جانے کیا بات ہوئی۔ کہ سر سید کی نگاہِ انتخاب علی گڑھ پر پڑی۔ اس سے معلوم ہوا کہ امرتسر کا ایم اے او اسکول علی گڑھ کی درسگاہ سے زیادہ قدیم ہے۔ اس درسگاہ سے ڈاکٹر سیف الدین کچلو، شیخ صادق حسین، میر مقبول محمود، خواجہ غلام یٰسین اور امرتسر کی دیگر بڑی شخصیتیں تعلیم پاکر نکلیں"

پھر یہی ایم اے او اسکول ایم اے او کالج بن گیا۔ ایم اے او اسکول کے دیرینہ ہیڈ ماسٹر ایس مرکیڈو جو مندرجہ بالا شخصیتوں کے استاد تھے اور اپنی ذات سے ایک ادارہ تھے۔ اس کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوتے اور پھر وہ اپنی خوشی سے اس درسہ میں قریباً ۵۰ برس تک امرتسر کے مسلمانوں کی خدمت کرنے کے بعد ریٹائر ہوگئے۔ مسٹر مرکیڈو صاحب ریٹائر ہوتے تو ان کو انجمن اسلامیہ نے

بڑے بڑے اعزازات سے نوازا۔ ایم اے او کالج کی عمارت میں ایک وسیع ہال مرکینڈو صاحب کے نام سے بنایا گیا۔ ایم اے او ہائی اسکول میں بڑے نامی گرامی اساتذہ گزرے ہیں۔ جن میں سے ایک بزرگ محمد عالم آسی تھے۔ دوہرا قد، پل آنکھیں ادھ کھلی۔ گندمی رنگ۔ بھرواں ڈاڑھی۔ گردن ایک طرف جھکی ہوئی شہر میں گزرتے تو دو طرفہ نالیوں میں سے کسی ایک طرف کی نالی کے ساتھ ساتھ نظر جمائے گزرتے۔ جہاں کوئی کاغذ مل جاتا اٹھا لیتے اور پڑھتے۔ عربی کے جید عالم تھے۔ ہزاروں شاگرد تھے۔ پنجاب میں عربی زبان میں ان کے پائے کا کوئی دوسرا عالم نہ تھا۔ عربی زبان کے محقق تھے۔ ظریف الطبع۔ عربی میں شعر کہتے تھے اگر کسی شاعر پر تنقید کرنے پر آتے تو ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ آئی سی ایس کے امتحانات میں شریک ہونے والے ہر وقت ان کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے۔ ساری زندگی ایم اے او اسکول کے ہوسٹل کے ایک کمرہ میں گزاری۔ طبابت بھی کرتے۔ دوا مفت دیتے۔ رات دن مطالعہ میں غرق رہتے۔ شہرت پسند نہ تھے۔ نام و نمود سے کوسوں دور بھاگتے۔ عربی کی کئی تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔

مرکینڈو صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر تاثیر مرحوم ایم اے او کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور لاہور سے اپنی پسند کے لیکچرار لائے۔ جوانسال محنتی اور انتہائی قابل ڈاکٹر تاثیر مرحوم بہت ذہین تھے۔ انگریزی ادب کے فاضل تھے۔ فارسی اور اردو کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ جب تاثیر صاحب انگریزی ادب میں کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر کے آئے تو امرتسر کی دیواروں پر قدآدم اشتہارات لگائے گئے۔ جن میں لکھا تھا کہ ڈاکٹر تاثیر پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے کیمبرج سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کیا تھا... میں نے میٹرک پاس کر کے ایم۔ اے۔ او کالج میں داخلہ لیا تھا۔ امرتسر کا یہ زمانہ بڑا عجیب زمانہ تھا۔ صاحبزادہ محمود الظفر خان ایم اے او کالج میں وائس پرنسپل تھے۔ صاحبزادہ محمود الظفر خان نہ معلوم کس بات پر ایم اے او کالج کی ملازمت چھوڑ گئے۔ ان

کے بعد ایک صاحب ڈاکٹر آر ڈی خان یعنی رام داس خان وائس پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ وائس چانسلر ہونے سے پہلے تو مسلمان ہوتے اور ان کا نام رشید الدین خان رکھا گیا یعنی مسلمان ہو کر بھی خان آر ڈی خان رہے۔ ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال کے ہم جماعت اور بڑے گہرے دوست تھے۔[1]

انجمن اسلامیہ امرتسر کے سرپرستوں میں شیخ صادق حسن[2] کا خاندان سب سے پیش پیش تھا۔ روزنامہ حریت میں نصراللہ خان صاحب لکھتے ہیں۔

"امرتسر کی کشمیری برادری کے دولت مند افراد مرنے سے پہلے اپنی جائداد کا ایک حصہ انجمن کے نام منتقل کر جاتے تھے۔ جن لوگوں نے اپنی جائیدادوں کے حصے انجمن کر دیئے۔ ان میں سرِ فہرست خواجہ غلام صادق اور شیخ صادق حسن کے گھرانوں کے نام آتے ہیں۔ اس سستے زمانے میں سبزی منڈی کی یومیہ آمدنی ایک ہزار روپے سے کم نہ تھی۔ پھر مسجد شیخ خیر الدین مرحوم کی دو دکانوں کا کرایہ آتا تھا۔ اور دوسری جاگیروں کی آمدنی الگ تھی۔ اگرچہ شیخ صاحب انجمن کے صدر اور لائف ممبر تھے۔ لیکن وہ اسکولوں اور کالجوں کے معاملات میں کبھی

---

[1] "کچھ یادیں کچھ باتیں" از جناب نصراللہ خان مقالہ روزنامہ حریت مؤرخہ ۲۷ اگست ۱۹۷۳ء

[2] ۱۹۲۲ء میں شیخ غلام صادق کا انتقال ہوا صحیح تاریخ نہیں معلوم ہو سکی مرحوم کی تعلیمی خدمات کا اعتراف آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علیگڑھ ۱۹۲۲ء کی ایک قرارداد نمبر ایک نوٹ کی شکل میں اس طرح کیا گیا"

یہ کانفرنس شیخ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر کی وفات پر ملال پر بلحاظ ان کی

دخل نہیں دیتے تھے" لہ

صاحب رپورٹ ۱۹۰۸ء صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے انجمن اسلامیہ امرتسر کی کارگزاریوں کے بارے میں حسب ذیل تبصرہ کیا تھا۔

" انجمن مذکورہ ۱۸۷۸ء سے قائم ہے۔ منجملہ اور اہم قومی خدمات کے جو انجمن نے انجام دیں، اسلامیہ ہائی اسکول کا قائم کرنا ہے۔ جس کا شمار پنجاب کے کامیاب اسکولوں میں ہوتا ہے اور ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیمات نے بارہا اپنی رپورٹ میں خصوصیت کے ساتھ اس کی عمدہ تعلیم، مفید نتیجوں اور انتظام کی خوبی کا تعریف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اسکول کا ہیڈ ماسٹر ایک لائق یورپین ہے۔ اسکول کے ساتھ بورڈنگ بھی ہے جس کے ذریعہ پردیسی طلبار کی تربیت کی جاتی ہے۔

تعلیمی خدمات کے اظہار رنج کرتی ہے اور مرحوم کے پس ماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتی ہے۔

نوٹ: مسلمانان پنجاب خصوصًا امرتسر کی تعلیمی تحریکیں مرحوم کے خاندان سے نکلتی رہتی تھیں۔ ان سے پہلے شیخ غلام حسین اور غلام محمد صاحبان والد ماجد اور عم امجد قومی تعلیم کے شوق میں ڈوبے ہوئے تھے۔ امرتسر کا اسلامیہ اسکول خاص اسی خاندان کی فیاضی کا نتیجہ تھا۔ جب سر سید ۱۸۸۰ء کے بعد اول دفعہ پنجاب گئے اور امرتسر وارد ہوئے تھے۔ امرتسر کا اسلامیہ اسکول خاص اسی خاندان کی فیاضی کا نتیجہ تھا۔ جب سر سید ۱۸۸۰ء کے بعد اول دفعہ پنجاب گئے اور امرتسر وارد ہوتے تو ان حضرات کی قدر مجوبی اور اخلاص مندی قابل تقلید تھی۔ استقبال میں شان دکھائی جس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے اس خطہ میں مرحوم کی فیاضی کے آثار تین پشت سے موجود ہیں۔

لہ۔ بحوالہ مقالہ "کچھ یادیں کچھ باتیں" روزنامہ حریت کراچی مورخہ ۲۰ر اگست ۱۹۷۲ء

غرض انتظام اور سرپرستی کی خوبی کے لحاظ سے اسکول ایک مکمل اسکول ہے ۔
علاوہ ازیں انجمن اسلامیہ کی عملی قوت کا اندازہ اس امر سے اور ہو سکتا ہے کہ وہ مسلسل تیس ۳۰ برس سے کامیابی کے ساتھ قائم ہے اور نہ صرف قائم ہے بلکہ خاص امرتسر کے مسلمانوں کی فیاضی ان کے حسنِ انتظام کی وجہ سے انجمن کے پاس معقول سرمایہ موجود ہے۔ کارکنانِ انجمن اس سرمایہ کی روز بروز معقول آمدنی کی جائیداد خرید خرید کر کے مالی حالت مضبوط کرتی جا رہی ہے۔ انجمن کے مضبوط اور پائیدار عملی کام دوسرے کام کرنے والے مسلمانوں کے لئے عمدہ مثال ہیں [1]

اسلامیہ اسکول قصور

اس اسکول میں طلبا کی تعداد ۱۳۷ تھی اور اساتذہ ۹ تھے۔ اس ادارہ کی سرپرست جماعت "انجمن اسلامیہ قصور" کہلاتی تھی ۔

اسلامیہ ہائی اسکول قادیان

اس ادارہ میں ۱۷۶ طلباء اور ۱۸ استاد تھے۔ نتائج امتحانات درج ذیل ہیں :-

۱۹۰۴ء	۱۹۰۵ء	۱۹۰۶ء	۱۹۰۷ء	۱۹۰۸ء
۱/۴	۳/۲	۳/۵	۹/۷	۱۶/۸

مدرسہ ملحق بورڈنگ ہاؤس کا انتظام تھا۔ جس میں ۱۹۰۸ء میں ۹۲ طلب

[1] رپورٹ سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس امرتسر ۱۹۰۸ء

اقامت پذیر تھے۔ اس اسکول میں مذہبی تعلیم کا خصوصی بندوبست تھا۔ انجمن احمدیہ اس کی منتظم تھی۔

اسلامیہ دیپال پور

یہ پرائمری مدرسہ تھا۔ کل چار کلاسیں تھیں۔ طلبا کی تعداد ۳۵ تھی۔ کل ۲ استاد تھے۔ امتحانات کے نتائج صرف ۱۹۰۸ء کے درج رپورٹ ہیں۔

چہارم	سوم	دوم	اول
۲/۲	۱۲/۱۳	۱۲/۲	۹/۸

پنجابی مسلمانوں کی تعلیمی حالت اکابرین ملت کی نظر میں

قیام پاکستان سے قبل اوائل بیسویں صدی میں مسلمانوں کی سیاست تعلیم سے اس حد تک ملوث تھی۔ کہ دونوں اصناف جہد کو علیحدہ علیحدہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس دوران میں مسلمان سربرآوردہ لوگ مسلمانوں کی عوامی تعلیم میں اس قدر دلچسپی لیتے تھے کہ جس کا آج کل کے سیاست دان تصور بھی نہیں کر سکتے

اجلاس کانفرنس ۱۹۱۴ء راولپنڈی

مسلمانانِ پنجاب و سرحد کی تعلیمی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کے واسطے اکابرین علی گڑھ نے طے کیا کہ کانفرنس کا سالانہ اجلاس راولپنڈی میں منعقد ہو۔ یہ تجویز نواب ملک محمد مبارز خان رئیس اعظم شاہ پور اور قاضی سراج الدین احمد بیرسٹر نے

پیش کی۔ اس تاریخ ساز اجلاس سلسلہ میں زبردست محنت اور کوشش کی گئی ۔ اس اجلاس کا عوام و خواص نے جو پرجوش خیر مقدم کیا وہ اس بات کا مظہر تھا کہ مسلمانوں میں تعلیم سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ :-

"تعلیم کی آواز سن کر صوبے کے ہر گوشے سے جس قدر مسلمان راولپنڈی میں جمع ہوئے ان کا اجتماع اور جلسوں میں انہماک اس امر کی امید پیدا کرتا ہے کہ وہ تعلیم کے خواہش مند ہیں"

مقامی حضرات کے علاوہ پورے ملک سے چوٹی کے زعمائے ملت اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔ مثلاً صاحبزادہ عبدالقیوم (سرحد) جنرل عبدالرحمٰن بہاولپور، نواب صدر یار جنگ علی گڑھ، سر سید رضا علی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی (جن کا نام رپورٹ میں عالی جناب مسٹر محمد علی بی۔ اے آکسن لکھا ہے) مولانا شوکت علی۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولوی عبدالحق۔ خان بہادر مولوی بشیر الدین مولوی الف دین کیمبل پور۔ مولوی نثار علی انسپکٹر آف اسکولز وغیرہ۔

ملک محمد مبارز خان نے خطبہ استقبالیہ بڑے جوش و خروش اور والہانہ انداز میں پڑھا۔ آپ نے علی گڑھ کے تعلیمی مجاہدین کا استقبال ان الفاظ میں فرمایا :-

"اے صاحبان! آفتاب جب نکلتا ہے تو نہ صرف پہاڑوں اور میدانوں ہی کو روشن کرتا ہے۔ بلکہ غاروں اور خندقوں میں بھی روشنی پہنچاتا ہے اور اس دفعہ اگر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آفتاب نے اپنی پوری روشنی ڈالنے اور گرمی کا فیض پہنچانے کے لئے ہمارے اس تاریک اور سرد زمین کو منتخب کیا ہے تو ہم اس احسان کی وسعت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اس کا کافی شکریہ ادا نہیں کر سکتے"

صاحبزادہ آفتاب احمد خان (علی گڑھ) بڑے دردمند مسلمان تھے۔ انہوں نے
راولپنڈی کے اجلاس میں ایک طویل رپورٹ پورے ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت
کے بارے میں پڑھی جو ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس رپورٹ میں
پنجاب کے بارے میں بھی قیمتی معلومات مہیا کی گئی تھیں۔ ذیل کے اقتباسات اسی
سے ماخوذ ہیں:-

"سب سے اول خواندہ اور ناخواندہ کے معیار کے لحاظ سے اپنی
حالت کا موازنہ فرمائیے۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ اس صوبہ میں
مسلمانوں کی مجموعی تعداد ایک کروڑ بائیس لاکھ اور بمقابلہ
ہندوؤں کے ۵۵ فیصد ہے۔ جینی مذہب کے خواندوں کی تعداد
فی ہزار ۴۲۲ ہے۔ عیسائیوں کی ۲۳۵ سکھوں کی ۱۱۲ ہندوؤں
کی ۹۵ مسلمانوں کی صرف ۲۷ ہے۔ یعنی ایک ہزار مسلمانوں میں
صرف ۲۷ ایسے ہیں جو لکھ پڑھ سکتے ہیں۔"

سال گذشتہ (۱۹۱۳ء) ایم اے کے امتحان میں ۲۲ امیدوار پاس ہوئے۔ جن میں
۱۴ ہندو تھے اور ۸ مسلمان۔ ایم ایس سی میں ۵ پاس ہوئے جن میں ۴ ہندو تھے اور
مسلمان ایک بھی نہیں۔ بی اے میں ۱۲ پاس ہوئے۔ جن میں ۷ ہندو اور مسلمان ایک بھی
نہیں۔ ایف اے میں ۴۹۷ پاس ہوئے جن میں ۳۲۵ ہندو اور صرف ۹۴ مسلمان یعنی
تقریباً ۶۵ فیصد ہندو اور صرف ۱۹ فیصد مسلمان۔ میٹرکولیشن میں ۳ر۳۳۸ پاس ہوئے
جن میں ۱ر۹۰۸ یعنی تقریباً ۵۹ فیصد ہندو اور ۵۹۰ یعنی ۳۲ فیصد مسلمان۔ قانون
۱۲۰ پاس ہوئے۔ جن میں ۸۹ یعنی ۶۸ فیصد ہندو اور ۲۷ یعنی ۲۰ فیصد مسلمان۔
ڈاکٹری میں ۲۴ کل پاس ہوئے ہیں۔ جن میں ۱۷ یعنی ۷۰ فیصد ہندو اور ۴ یعنی ۱۶ فی صد
مسلمان۔

کئی وجوہ سے دوسرے صوبوں کے مسلمان زندہ دلان پنجاب کی طرف نگاہ لگائے

ہوئے ہیں۔ اول تو قدرت نے اس صوبہ کے باشندوں کو فطرتاً قوی اور زبردست پیدا کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے دلوں میں بمقابلہ دوسرے حصص کے بہت زیادہ جوش اور احساس ہے۔ تیسرے یہ کہ سوائے سرحد کے یہی وہ صوبہ ہے جہاں مسلمانوں کی تعداد دوسری قوموں سے زیادہ ہے۔ چوتھے یہ کہ صوبہ سرحد کے قریب ہے اور ملک کی پاسبانی کی خدمت کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ پانچویں یہ کہ سال ہا سال سے یہاں قومی تحریک جاری ہے اور بیداری کے آثار نمایاں ہیں۔ ان وجوہ سے اس صوبہ میں ایسی ناکامی اور پستی ہونا سخت دل شکن اور مایوس کرنے والی ہے۔

اول انبالہ ڈویژن پر توجہ کیجئے وہاں مسٹر اعجاز حسین صاحب اور مولوی غلام بھیک صاحب نیرنگ کی کوشش سے ہائی اسکول قائم ہو گیا ہے۔ میں نے خود اس کو دیکھا ہے۔ عمدہ عمارت تیار ہو گئی ہے اور کل حالت اُمید افزا ہے۔ لیکن سرمایہ کے لیے جس مصیبت کا سامنا اس کے پُرجوش بانیوں کو ہے اس سے وہی واقف ہیں۔ علاوہ اس کے گورنمنٹ سے اسکول کو منظور کرانے کے لئے جو مشکلات ان کو پیش آئیں وہ بھی توجہ کے قابل ہیں۔ سوائے اس اسکول کے انبالہ ڈویژن میں کوئی اور اسلامی تعلیم گاہ سوائے مکاتب یا پرائمری اسکولوں کے نہیں۔ اس کے بعد جالندھر ڈویژن پر غور کیجئے۔ جالندھر ڈویژن کی نسبت ڈائریکٹر صاحب کی رپورٹ میں جو ریمارکس درج ہیں۔ ان کا ترجمہ درج ذیل ہے:-

جالندھر میں مسلمانوں کی کوشش کچھ نمایاں نہیں رہی۔ لدھیانہ

اسلامیہ ہائی اسکول کا انتظام قابلِ اطمینان نہیں رہا اور منجملہ ۳۹ غیر منظور شدہ پرائیویٹ اسکولوں کے جو حال ہی میں قائم ہوئے صرف دو اسلامیہ اسکول ہیں۔ انسپکٹر کا بیان ہے کہ جالندھر میں محمڈن ہوسٹلوں طلبا رکھتے ہے۔ وہ قابل اطمینان حالت میں نہیں ہے۔ اس وقت جالندھر ڈویژن میں ایک لاکھ ستائیس

ہزار تین سو گیارہ مسلمان آباد تھے ۔" مجھ کو تعجب ہے کہ ڈائریکٹر
صاحب کی رپورٹ میں ہوشیار پور اسلامیہ ہائی اسکول کا ذکر
نہیں ہے ۔ یہ اسکول مولوی رحیم بخش صاحب اور مسٹر عبدالعزیز
بیرسٹر کے جوش اور اولوالعزمی کی بدولت بڑی امیدوں کے
ساتھ شروع ہوا تھا اور امید ہے کہ وہ پوری تعلیمی خدمات
انجام دے گا ۔ راولپنڈی ڈویژن میں ہمارے محترم جناب ملک
مبارز خان صاحب نے اپنے ضلع میں ہائی اسکول قائم کرنے کے
لئے جو سعی فرمائی ہے اس کا ہم سب کو علم ہے اور جو کامیابی
جناب موصوف کو ہوئی ہے ۔ اس پر ان کو ہم دل سے مبارکباد
دیتے ہیں ۔" خاص راولپنڈی میں جو ہائی اسکول ہے اس کی
نسبت ڈائریکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ وہ اچھی حالت میں نہیں
ہے ۔ لیکن اب ترقی کر رہا ہے ۔ ملتان ڈویژن میں صرف اسلامیہ
مڈل اسکول ہیں ۔ کوئی ہائی اسکول نہیں ہے ۔ حالانکہ وہاں ۸۰
فیصدی سے زیادہ مسلمان آباد ہیں ۔ لاہور کے ڈویژن میں اسلامیہ
اسکولوں کی خاص طور پر ڈائریکٹر صاحب نے تعریف کی ہے ۔ ایک
قادیان کے اسکول اور دوسرے امرتسر اسکول کی ۔ امرتسر میں خان
بہادر شیخ غلام صادق صاحب اور بابو نظام الدین صاحب کی انتظامی
قابلیت اور قومی ہمدردی مسلمہ ہے ۔

"مجھ کو حیرت ہے کہ ڈائریکٹر صاحب کی ۱۳ - ۱۹۱۲ء کی رپورٹ میں نہ اسلامیہ
کالج لاہور کا ذکر ہے اور نہ انجمن کے ہائی اسکول کا ۔۔۔ اسلامیہ ہائی اسکول لاہور
نہایت کامیابی کے ساتھ تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے ۔ تقریباً دو ہزار طالب علم
اس میں تعلیم پاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ انجمن کا کالج نہایت امید افزا ترقی کر رہا

ہے۔ ۱۹۰۹ء میں کالج میں طلبا کی تعداد صرف ۱۱۴ تھی اور ۱۹۱۳ء میں ۲۳۰ تک پہنچ گئی۔ یعنی دوگنے سے زیادہ ہوگئی۔ یونیورسٹی کے امتحانات میں بی اے کے لئے ۱۴ طلبا بھیجے گئے۔ جن میں ۱۲ پاس ہوئے۔ ایف اے میں ۹۳ میں سے ۳۲ پاس ہوئے۔

گوجرانوالہ میں عرصہ سے ایک اسلامیہ پرائمری اسکول تھا لیکن ہمارے مرحوم دوست مولوی محبوب عالم صاحب کے برقی جوش کی بدولت چند روز میں وہ ہائی اسکول کے درجے کو پہنچ گیا۔ ہماری قوم کی یہ بدقسمتی ہے کہ مولوی صاحب موصوف کا انتقال ہوگیا۔

اس صوبہ کی تعلیمی تحریک کے سلسلہ میں انجمن ترقی تعلیم امرتسر کئی سال سے نہایت مفید کام کر رہی ہے اور ہونہار اور غیر مستطیع مسلمان طالب علموں کی وظائف کے ذریعے مدد کرتی ہے۔ مسٹر محمد عمر بیرسٹر ایٹ لا اس کام کو نہایت کامیابی سے چلا رہے ہیں اور وہ ہر طرح شکریہ کے مستحق ہیں اور مقامات میں بھی مڈل اور پرائمری اسکول اور مکاتب ہیں۔ اس رپورٹ میں سب کے ذکر کے لئے وقت اور گنجائش نہیں۔

ڈاکٹر [illegible] الرحمن صدیقی

سید علی ہجویریؒ کے تعلیمی نظریات

برصغیر پاک و ہند میں اصلاحی اور تبلیغی کوششوں میں علماء اور صوفیاء کا حصہ نمایاں ہے یہ انھی بزرگوں کی دعوت کا اثر ہے کہ اس خطے میں اسلام کسی نہ کسی صورت نظر آ رہا ہے۔ برصغیر کے انھی صوفیاء میں سے ایک اہم شخصیت جسے پڑھے لکھے اور ان پڑھ تقریباً سبھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، شیخ سید ابوالحسن علی ہجویریؒ کی ذاتِ گرامی ہے آپ نے اپنے نظریات، درس و تبلیغ اور اپنے عمل کے ذریعے ان کے گمراہ کن عقائد کی بے لاگ تردید کی۔

سید علی ۔۔ ہجری میں غزنی شہر سے متصل ایک بستی ہجویر میں پیدا ہوئے۔ والد گرامی کا نام سید عثمان جلابی ہے جلاب بھی غزنی سے متصل ایک بستی کا نام ہے۔ علی ہجویریؒ محمود غزنوی کے بیٹے ناصر الدین محمود کے زمانے (۴۳۱ ہجری بمطابق ۱۰۴۰ - ۱۰۳۹ء) میں لاہور تشریف لائے اور لاہور ہی میں بعض روایات کے مطابق ۴۶۵ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کا سارا گھرانا زہد و تقویٰ کا گھرانا تھا۔ آپ خود تفسیر و حدیث اور تصوف کے عالم تھے۔

سید صاحب ایک با اثر شخصیت اور محقق بزرگ تھے۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں

ین جس سے آپ کو شہرت حاصل ہوئی۔ وہ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "کشف المحجوب" ہے۔ یہ
کتاب برصغیر میں فارسی زبان میں اسلامی تصوف پر پہلی اہم کتاب ہے اور علم تصوف پر سند کا درجہ
رکھتی ہے۔ اس کتاب کا انداز عالمانہ اور محققانہ ہے اور اس کا اہم مقصد جیسا کہ سید صاحب
نے خود تحریر فرمایا ہے یہ تھا کہ ان لوگوں کے دلوں کو صیقل کرے جو تاریکی کے پردے میں گرفتار
ہیں لیکن نورِ حق کا سرمایہ ان کے دل میں موجود ہے آپ نے مختلف مسائل اور امور کی وضاحت
میں مختلف مثالیں، حکایات اور بزرگوں کے اقوال بیان کئے ہیں تاکہ ان کا فہم آسان
ہو جائے اپنی بات کی وضاحت میں آیتِ قرآنی اور احادیث نبوی کے علاوہ اسلامی تاریخ
سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ حضرت شیخ نظام الدین
اولیاء کے اس قول سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جو مرشد کی تلاش میں ہو اسے "کشف المحجوب"
کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

اگرچہ سید صاحب نے کسی ماہر تعلیم کی طرح "تعلیم" کے عنوان سے کوئی باضابطہ کتاب
تو نہیں لکھی اور نہ کسی خاص کتاب میں تسلسل سے اپنے تعلیمی نظریات بیان کئے ہیں تاہم "کشف
المحجوب" میں جا بجا ان کے تعلیمی فلسفے اور علمی نظریات کا اظہار ملتا ہے۔ ہر چند کہ "کشف المحجوب"
کے علاوہ آپ کی بعض اور تصانیف بھی ہیں مثلاً "منہاج الدین"، "کتاب الفناء والبقاء"، "الرعایة
بحقوق اللہ"، "اسرار الخرق والمؤنات"، "بحر القلوب" اور "کتاب البیان لاہل العیان" لیکن
ان کے تعلیمی نظریات کے بارے میں زیادہ تر انحصار "کشف المحجوب" ہی پر کیا جاسکتا ہے۔

ذیل میں سید صاحب کے فلسفۂ تعلیم پر انتہائی اختصار سے مختلف ذیلی موضوعات
کے تحت ایک مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ان کے مجموعی تاثر سے ایک نظریہ قائم
کیا جا سکے۔

اس سلسلے میں سید صاحب کا ایک واضح نقطۂ نظر ہے۔ ان کے نزدیک اس عالم وجود
کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی حکمت پوشیدہ ہے اور وہی اس کا پورا نظام چلا رہا ہے اللہ تعالیٰ ہی قادر
مطلق اور خالقِ کائنات ہے بندہ کا فرض ہے کہ وہ خالق کے احکام کی تکمیل کرے۔ انہوں نے یہ

وضاحت بھی کی ہے کہ حمد درحقیقت اس پروردگار کو زیبا ہے جس نے اپنی کبریائی کی تجلیات
سے نوعِ انسانی کے مردہ دلوں کو زندہ کیا ہے مومن کی یہ امتیازی شان ہے کہ وہ اپنے تمام امور
کو قضائے الٰہی اور مشیت ایزدی کے سپرد کرے اور قدم بہ قدم اسی سے اعانت چاہے۔
علامہ اقبالؒ کے نزدیک بھی تصور حقیقت کی بنیاد "عشق" ہے اور سید ہجویریؒ کا بھی یہی نظریہ ہے
فرق صرف یہ ہے کہ "عشق" کی جگہ سید صاحب نے "مجاہدہ اور کشف" کی اصطلاحیں استعمال
کی ہیں۔

مصنفوں نے خدا کے بارے میں تین طرح کے نظریات پر بحث کی ہے۔ یہ نظریات
ان اصطلاحوں سے مشہور ہیں۔

(۱) عقیدہ کثیر الٰہیہ (۲) عقیدت ثنویت (۳) عقیدہ توحید،

عقیدہ کثیر الٰہیہ یا کثرت پرستی میں متعدد خداؤں پر یقین اور عقیدہ ہوتا ہے یہ خدا ایک
دوسرے سے مختلف بھی ہوتے ہیں اور منفرد بھی۔ یہ دراصل مشرکین کا عقیدہ ہے۔ عقیدہ ثنویت
یا دو پرستی میں دو خداؤں کا تصور ہے یہ بھی مشرکین کے ایک گروہ کا فلسفہ ہے۔ عقیدۂ توحید یا
وحدت پرستی ایک خدا پر یقین اور ایمان کا نام ہے اسلام میں اس فلسفہ پر وضاحت کے ساتھ یقین
رکھا جاتا ہے کہ خدا ایک ہے اور وہی اصل حقیقت ہے علی ہجویری اس نقطۂ نظر سے موحد
تھے۔ انھوں نے اپنی توحید کی بنیاد قرآن و سنت پر استوار کی۔ ان کے نزدیک خدا کی معرفت کے
سلسلے میں سب سے اہم اور بنیادی چیز اس کی توحید کا صحیح علم ہے۔ توحید کے بغیر کوئی عمل بھی
مقبول نہیں ہے خدا کی معرفت اور اس کی توحید کا علم حاصل ہونے کے باوجود جو چیز خدا کی راہ پر چلنے
میں انسان کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے وہ ایمان کا موجود نہ ہونا اس کا ناقص اور کمزور
ہونا ہے۔

سید صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا فانی ہے اسے بالآخر فنا ہونا ہے اس سوال
کے بارے میں کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی۔ علی ہجویریؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ۔ یہ کائنات
اللہ تعالیٰ کی منشا کے مطابق تخلیق ہوئی۔ اس کی بقا کا سارا دارومدار خدا کی مرضی پر ہے اللہ تعالیٰ

نہ ہرو بنا ہے ۔ ور مخلوق میں کوئی اس کا شریک نہیں طالب حق کو چاہیئے کہ سب اعمال طیبہ سے انجام دے ۔ گویا خدا اسے اور اس کے افعال کو دیکھ رہا ہے کیونکہ خدا سے کوئی شے بھی پوشیدہ نہیں ۔

انسان کو خدا نے پیدا کیا ہے ۔ لہذا بندہ کا یہ فرض ہے کہ وہ خالق کے احکام ادا کرے ۔ انسان کا صحیح علم حق تعالیٰ کے احکام اور اس کی ذات و صفات کی معرفت ہے ۔ علی ہجویری کے نزدیک انسانی علم کا اصل کمال یہی ہے کہ وہ یہ جان لے کہ فی الحقیقت وہ کچھ نہیں جانتا ۔ ہر وہ کام جس میں انسان کے پیش نظر حق تعالیٰ کی خوشنودی نہ ہو ۔ وہ اغراض انسان کے تحت آتا ہے اور جس کام میں نفسانی غرض شامل ہو جاتی ہے اس میں سے برکت اٹھ جاتی ہے ۔ اور آدمی کا دل اسی سے منحرف ہو جاتا ہے ۔ جن چیزوں کے بارے میں آدمی خود جانتا ہے کہ خدا کی نافرمانی کے کام ہیں ان کو ترک کر دے اور جو خداوند کے عائد کردہ فرائض اور پسندیدہ کام ہیں ان کے لئے کمربستہ ہو ۔ بندے کے لئے ایمان کی شرائط ضروری ہیں ۔ ایمان کے بعد طہارت بندے کے لئے فرض ہو جاتی ہے ہر قسم کی نجاست سے پاکیزگی ایک لازمی شرط ہے سید صاحب کے نزدیک طہارت کی بھی دو قسمیں ہیں ۔ ایک طہارت ظاہری اور دوسری طہارت باطنی اور یہ دونوں یکساں ضروری ہیں ۔ سید صاحب کی رائے میں دنیا کا کوئی جائز اور حلال کام بھی انسان کے مرتبہ سے فروتر نہیں ہے انسان اور انسانیت کے مرتبہ سے اگر کوئی شے فروتر ہے تو وہ یہ کہ وہ معصیت اور خدا کی نافرمانی کے کسی کام کا ارتکاب کرے ۔ فی الحقیقت انسان کو چاہیئے کہ وہ کسی کام میں نفس کی خواہش کو کوئی دخل نہ دے بلکہ محض حق تعالیٰ کی رضا کی خاطر کامل تندہی سے ہر کام کو سرانجام دے ۔

تصور علم کے سلسلے میں سید علی ہجویریؒ قرآن حکیم سے متاثر ہیں ۔ کیونکہ اس میں علم کی عظمت کا ذکر ہے ۔ سید صاحب کی رائے میں زندگی کی طلب کے لئے پہلا قدم صحیح اور قابل اعتماد علم کا حصول ہے کیونکہ صحیح علم کے بغیر نہ آدمی صحیح راہ پا سکتا ہے اور نہ اس پر چل سکتا ہے ۔ دین میں جس علم کے حصول کو فرض قرار دیا گیا ہے اس سے مراد دنیا جہان کے ہر علم کا حصول نہیں کیونکہ دنیا میں تو علوم بے شمار ہیں ۔ صرف اللہ تعالیٰ کی شریعت اور خصوصاً اس کے فرائض اور واجبات کا علم

حصول ہی فرض عین ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم کا اس حد تک حصول جس حد تک شریعت الٰہی
کے احکام اور ان کے مختلف پہلو سمجھنے کے لئے درکار ہوں، وہ خود بخود ضروری ہوجاتا ہے۔ تمام علوم کا سیکھنا
انسان پر فرض نہیں کیونکہ علوم بہت ہیں اور انسان کی عمر تھوڑی ہے۔ مثلاً فلکیات، حساب، طب اور طبیعیات
کی تمام شاخیں بدائع وغیرہ کا پڑھنا ضروری نہیں البتہ فلکیات کا سیکھنا اس قدر ضروری ہے جس سے رات میں اوقات
نماز معلوم ہوسکیں۔ اسی طرح بیماری سے بچنے کے لئے طب، وراثت کے مسائل سمجھنے کے لئے علم میراث
اور علم فقہ، غرضیکہ علم سیکھنا اس قدر فرض ہے جس سے عمل درست ہو۔ غیر مفید علم نہیں سیکھنا چاہیئے تو
جو لوگ علم سے مرتبہ اور دنیاوی عزت طلب کرتے ہیں وہ عالم نہیں ہوتے، کیونکہ مرتبہ اور دنیاوی عزت
کی طلب جہالت کے لوازم میں سے ہیں۔ سید صاحب کے نزدیک علم ایک صفت ہے جس سے جاہل
عالم ہوجاتا ہے علم کی نفی جہالت ہے اور علم کا ترک کرنا جہالت۔ جاہل بہر صورت قابل ملامت
ہوگا اور جہالت کفر اور باطل کی علامت ہوگی۔ کیونکہ امر حق کا امر باطل سے کوئی تعلق نہیں

اور یہ جہالت اور ترک علم تمام مشائخ و صوفیاء کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ انسان کا صحیح علم حق تعالیٰ کے
احکام اور اس کی ذات و صفات کی معرفت ہے دراصل حقیقی فہم و فراست، خلوص کے ساتھ احکام الٰہی
کی پیروی ہے اور جو ایسا نہیں ہوتا وہ بے شعور ہے۔

جہاں تک علم کی اقسام کا تعلق ہے۔ سید علی ہجویریؒ نے اسکی دو قسمیں بیان کی ہیں۔
ایک خداوند تعالیٰ کا علم اور دوسرا مخلوق کا علم خداوند تعالیٰ کا علم اس کا اپنا اور اس کی ذاتی صفت ہے
اور اس کے ساتھ قائم ہے اس کے علم کی نہ کوئی حد ہے اور نہ انتہا۔ اس سے کوئی شے پوشیدہ
نہیں۔ وہ تمام موجودات کو بھی جانتا ہے اور تمام معلومات کو بھی۔ اس کے برعکس مخلوق کا علم سب کا
سب خدا کا عطا کردہ ہے اور اس کی ایک حد اور انتہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی جاتی ہے
یہ حاصل بھی ہوتا ہے اور ضائع بھی۔

جن علوم کا سیکھنا انسان کے لئے فرض ہے اس کے دو حصے ہیں ایک علم حقیقت اور
دوسرا علم شریعت۔ علم حقیقت کے تین ارکان ہیں۔

(۱) خدا کی ذات اور اس کی توحید اور شرک کی حدود کا علم،

(۲) خدا کی صفات اور اس کے احکام اور فرامین کا علم۔

(۳) خدا کے افعال اور ان کی حکمتوں کا علم ،

علم شریعت :- اس کے بھی تین ارکان ہیں۔(۱) رسول صلعم کی سنت (۲) خدا کی کتاب ،
(۳) اجماع امت

سید صاحب نے علم کے ساتھ فکر کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے کیونکہ تدبر اور فکر کے بغیر نہ تو آدمی کے اندر صحیح فہم پیدا ہوتا ہے اور نہ اس کے بغیر علم آدمی کی زندگی پر کوئی گہرا اور دیرپا نقش ڈال سکتا ہے۔ تدبر اور تفکر اور رجوع الی اللہ جیسی چیزیں مجاہدوں کی کثرت (یعنی پیہم کوشش اور جدوجہد) کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

علم اور عمل لازم و ملزوم ہیں عمل وہ ہے جس کی بنیاد علم پر ہو۔ عمل کے بغیر علم نافع ہے نہ علم کے بغیر عمل نفع بخش ہے۔ جس علم کی پشت پر عمل موجود نہ ہو وہ علم جہل ہی کے زمرے میں شامل ہے جہاں ایک طرف علم سے صحیح عمل کی راہ کھلتی ہے اور آدمی کو جائز اور ناجائز بھلے اور برے میں تمیز حاصل ہوتی ہے وہاں دوسری طرف معلوم پر عمل پیرا ہونے ہی سے علم سے نفع اور فیض حاصل ہوتا ہے اور مزید علم کی راہ کھلتی ہے۔ عوام الناس کے دو طبقے ہیں ایک طبقہ وہ ہے جو علم کو عمل پر فضیلت دیتا ہے اور دوسرا طبقہ عمل کو علم پر۔ لیکن سید صاحب کے نزدیک دونوں امر باطل ہیں۔ اس لئے کہ علم کے بغیر عمل نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ عمل اسی وقت ہوتا ہے جب علم اس کے ساتھ شامل ہو۔ عمل درحقیقت علم ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ سید صاحب نے اپنے نظریہ کی وضاحت میں امام ابوحنیفہ کا قول نقل کیا ہے کہ علم عمل کے بغیر ایسے ہے جیسے جسم روح کے بغیر جس نے عمل نہ کیا تو گویا اس کے پاس علم ہی نہیں سید صاحب نے علم کے باب میں یہ وضاحت بھی کی ہے محض علم ہی ہدایت کے لئے کافی نہیں اگرچہ حقیقت اور شریعت کے علوم ہدایت کا ذریعہ ہیں۔ طلب ہدایت کے لئے ان علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے مگر ہدایت اللہ تعالے کی عنایت اور عطا سے حاصل ہوتی ہے۔ سید علی ہجویریؒ نے اکثر جگہ اسی بات پر زور دیا ہے کہ کوئی عالم ہو یا صوفی یا فقیر، شریعت کا علم سب کے لئے لازم ہے آپ فرماتے ہیں کہ علم پر عمل بھی کرتا ہو۔ آپ کے نزدیک ظاہر بغیر باطن کے منافقت ہے اور باطن بغیر ظاہر کے زندقہ۔ علم باطن حقیقت اور علم ظاہر شریعت ہے۔ ان کے نزدیک شریعت نام ہے قرآن

کریم، سنت رسول ﷺ اور اجماع امت کا۔ مزید فرماتے ہیں۔ کہ جس شخص کو خدا کا علم یعنی علم حقیقت نہیں اس کا دل جہالت کے سبب مردہ ہے۔ اور جسے اس کا عنایت کیا ہوا علم شریعت حاصل نہیں اس کا دل نادانی کے مرض میں مبتلا ہے۔ گویا آپ نے دونوں علموں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔

خدا کی معرفت اور اس کے متعلق صحیح علم رکھنے کے بارے میں بزرگوں میں اختلاف ہے معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت عقل سے حاصل ہوتی ہے اور سوائے عقل مند کے اس کی معرفت کسی کو روا نہیں۔ لیکن سید صاحب کے نزدیک یہ قول باطل ہے اللہ تعالیٰ کی معرفت صرف اللہ کی عنایت اور مشیت الٰہی ہی وجہ سے ہے اللہ کی عنایت و رہنمائی کے بغیر محض دلیل سے استدلال کرنا اور اس پر غور کرنا بھی خطا ہے۔ عقل کی اہمیت صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ اسلامی حدود اور ضوابط کے تحت ہو۔ اقبالؒ کے نزدیک ذرائع علم دو ہیں۔ وہ عقل اور الہام دونوں کو ایک خاص انداز سے تسلیم کرتے ہیں، لیکن زیادہ اہمیت اور فضیلت الہام اور عشق ہی کو دیتے ہیں۔ کیونکہ اسی سے حقیقت کا مکمل ادراک ہوتا ہے۔ ذرائع علم کے بارے میں علی ہجویریؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حقیقت کو پانے کے لئے صرف وجدان و الہام ہی ایک واحد ذریعہ ہے ابن العربیؒ اور خواجہ معین الدین چشتیؒ کا بھی یہی نظریہ ہے یہ دونوں بھی وجدانی علم (INTUTIVE — KNOWLEDGE) کے قائل ہیں۔ الغزالیؒ کا بھی یہی نظریہ ہے ہرچند کہ وہ عقل کو بھی ذریعہ علم سمجھتے ہیں لیکن حقیقت (REALITY) کو پانے کے لئے وہ بھی وجدان و الہام ہی کو صحیح ذریعہ تسلیم تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق وجدان و الہام کو عقل اور دلیل سے پرکھا نہیں جا سکتا۔

سید علی ہجویریؒ نے غور و فکر اور تحقیق و تدبر کی اہمیت پر خاصا زور دیا ہے۔ بقول ان کے جب اہل علم تحقیق کا راستہ چھوڑ کر تقلید میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو تحقیق ان سے منہ چھپا لیتی ہے ان کے نزدیک راہ ہدایت اور راہ راست کی طلب کے لئے ضروری ہے کہ انتہائی قابل اعتماد اور مستند علم حاصل کیا جائے اور یہ قابل اعتماد اور مستند علم تحقیق اور جستجو ہی سے حاصل ہو سکتا ہے انہوں نے مزید فرمایا کہ معرفت الٰہی اسی بندے کو حاصل ہوتی ہے جس پر خدا کی عنایت ہو۔ وہی دل کو کشادہ کرتا ہے۔ اور عبرت لگاتا ہے عقل

دلیل معرفت کا سبب ہو سکتی ہے مگر علت نہیں۔ علت معرفت اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے اس بارے میں تو سید صاحب نے ملحدوں سے اور بالخصوص سوفسطائیوں سے خبردار کیا ہے جن کے نزدیک کوئی شے شک و شبہ سے بالاتر نہیں۔ اور جن کا یہ مذہب ہے کہ صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ اپنی ذات کا بھی صحیح علم کسی کو نہیں۔ سید صاحب کی نظر میں ایک مسلمان محقق کے لئے ضروری ہے کہ ان ہی ذرائع علم پر یقین رکھے جو قرآن و حدیث کی تعلیمات کے مطابق ہوں۔ ان کی رائے میں اللہ کے عنایت کے بغیر علم، عقل اور کسی دوسرے کی طرف سے سمجھانے کی کوشش سب بے کار ہیں۔ خدا کی راہ اختیار کرنے اور اس کے تقرب کے راستے کی پہلی رکاوٹ (حجاب) کو دور کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ سے ناواقفیت ہی پہلا حجاب ہے۔ اس کا علاج اللہ تعالیٰ کے بارے میں صحیح علم سے ہو سکتا ہے اس کا تحقیقی ذریعہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلعم کی تعلیمات ہیں۔ ان کے سوا خدا کی صحیح معرفت کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔

معرفت الٰہی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علمی اور دوسری حالی۔ علمی معرفت یہ ہے کہ خداوند کریم کے بارے میں انسان کا صحیح علم ہو۔ اس میں کوئی ٹیڑھ اور مغالطہ نہ ہو۔ حالی معرفت یہ ہے کہ بندے کا حال (اس کی عملی زندگی) اس کی علمی معرفت کی آئینہ دار و ترجمان ہو۔ حالی معرفت علمی معرفت پر فضیلت رکھتی ہے اور یہی مطلوب و مقصود ہے علم حال کے بغیر ہو سکتا ہے لیکن حال، علم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ عارف جاہل نہیں ہو سکتا اور جاہل عارف نہیں ہو سکتا۔ سید صاحب کے نزدیک خدا کی صحیح معرفت کا ذریعہ خدا کی مقدس کتاب قرآن حکیم اور رسول صلعم کی تعلیمات ہیں۔ قرآن و حدیث کی تعلیم و تفہیم کے بغیر اللہ کی معرفت ممکن نہیں۔

سید صاحب نے علم کے حصول کے ساتھ ساتھ اطاعت حق، مجاہدہ، تزکیۂ نفس، فقر و استغنا، جود و سخا اور ایثار پر بھی خاصا زور دیا ہے۔ الغزالیؒ نے بھی طلبہ میں معلومات کی فراہمی کے ساتھ خالق اور دوسرا مخلوق کے ساتھ اخلاق پر زور دیا ہے۔ خالق کے ساتھ اخلاق یہ ہے کہ بندہ اس کی قضا پر راضی ہو۔ اس کا ہر فیصلہ اسے بسر و چشم قبول ہو۔ مخلوق کے ساتھ اخلاق یہ ہے کہ خدا کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لئے انہیں ادا کرے اس کام میں کوئی غرض اس کے سامنے

نہ ہو۔ شیطان اور خواہشات نفسانی کی پیروی ہرگز نہ کرے اپنے بزرگوں کے ساتھ عزت بھلا سے شفقت اور اپنے ہم مرتبہ لوگوں کے ساتھ برابری اور مساوات کا برتاؤ کرے شریعت ملا میں سب سے پسندیدہ اعتدال کی راہ ہے۔

سید صاحب کے نزدیک تعلیم کے اہم مقاصد درج ذیل ہے۔

(۱) عرفان الٰہی (۲) تعمیر سیرت اور کردار سازی (۳) حق تعالیٰ کی رضا (۴) اتفاق اتحاد بذرہ (دین اور جسم کی اصلاح کے سلسلے (۵) احکام الٰہی اور سیرت نبوی کی پیروی (۶) حق و صداقت اور مساوات (۷) تصور آخرت کا جامع مفہوم اور اس پر کامل عقیدہ

سید صاحب نے نصاب تعلیم کا مرکز و محور قرآن حکیم اور شریعت رسول صلعم کو گردانا ہے وہ نصاب کے رہبانی نظریہ کے خلاف تھے۔ ان کے نزدیک ہر مسلمان کے لئے اس قدر اور اس قسم کا علم حاصل کرنا ضروری ہے جس سے اس کا عمل درست ہو سکے۔ اس کے علاوہ نصاب کی تشکیل تکمیل کے سلسلے میں جو بھی علم بروئے کار لایا جائے وہ لازماً قرآن و حدیث کے تابع ہونا چاہیئے۔

طلبہ کی تعلیم و تربیت میں معلم کی اپنی شخصیت اور اس کے ذاتی اوصاف کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے طلبہ شعوری یا لاشعوری طور پر ان سے برابر متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ سید صاحب اپنے اساتذہ کا بیحد احترام کرتے تھے۔ "کشف المحجوب" میں انہوں نے اپنے کئی اساتذہ کا ذکر انتہائی فخر کے ساتھ کیا ہے چنانچہ ان کی اپنے اساتذہ کے بارے میں بیان کردہ خوبیوں کو اگر سامنے رکھا جائے تو سید صاحب کے نزدیک ایک اچھے استاد میں درج ذیل خصوصیات کا ہونا قابل تعریف ہے اور ایسا انسان ہی سید صاحب کی رائے میں مطلوب معلم ہے۔

(۱) وہ علوم و فنون میں ماہر ہو (۲) عالم باعمل ہو (۳) علم سیکھنے کا عمل جاری رکھے اور اس میں کمال حاصل کرے (۴) شریعت اسلامی کا پابند ہو (۵) فصیح البیان ہو (۶) محققانہ تصنیفی کام کرتا ہو (۷) طالبان حق کا اس پر اعتماد ہو (۸) شاگردوں سے محبت اور شفقت رکھتا ہو (۹) طلبہ کی بات وہ بہت توجہ سے سنتا ہو اور طلبہ اس کی بات توجہ سے سنتے ہوں (۱۰) بیکار بحث و گفتگو اور لغو باتوں سے اجتناب کرتا ہو (۱۱) نیک خوش اخلاق اور ملنسار ہو (۱۲) اس کا کلام مہذب ہو اور اشارات لطیف رکھتا ہو

ان کے علاوہ اگر معلم میں مزید یہ اوصاف ہوں یا ان کے لئے کوشاں ہو تو وہ اہل علم و فضل کے حلقے میں اتفاقی افضل استاد شمار ہوگا۔

(۱) جود و سخا (۲) صدق و وفا (۳) کشف و مجاہدہ (۴) فراست و اصابت (۵) حق کی بے باک ترجمانی (۶) تسلیم و رضا۔

سید صاحب نے حارث بن اسدؒ کا یہ ارشاد بھی نقل فرمایا ہے کہ "زندہ رہتا ہے تو حق کہتے ہوئے، ورنہ مظلوم ہو کر" اور یہی ایک اچھے معلم اور ایک اچھے مسلمان کی خصوصیت ہے۔ اسی طرح ایک جگہ معروف بن فیروز کرخیؒ کا یہ قول بیان کیا ہے کہ جوانمردی کی تین نشانیاں ہیں (۱) وفا جس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ (۲) کسی طمع و لالچ کے بغیر مستحق تعریف کی تعریف (۳) غریب اور مستحق افراد کی، ان کے سوال کے بغیر اعانت ان اوصاف کے مالک استاد کا مقام یقیناً دین و دنیا دونوں میں بہت ہی اعلیٰ و ارفع ہوگا۔

غلام سید سس

سرسیّد کے تعلیمی نظریات

سرسید یوں تو سبھی کچھ تھے مگر ان کو ماہر تعلیم کہنا زیادہ موزوں ہے۔ مسلمانوں میں بہت کم مفکرین ایسے گزرے ہیں جنہوں نے تعلیم کے بارے میں اپنے نظریات پیش کئے ہوں۔ مسلمانانِ ہند میں گنتی کے مسلمان ماہرین تعلیم گزرے ہیں۔ ان میں محسن الملک شبلی، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ وغیرہ بھی بہت مشہور ہوئے۔ مگر یہ سب سرسید کے شاگرد ولی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرسید بنیادی طور پر سوشل ریفارمر تھے اور قومی اصلاح کے لئے وہ تعلیم کو سب سے اہم حربہ خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم ہر قومی مرض کا علاج اور ہر زہر کا تریاق ہے۔ اس ایک عمل سے ہزاروں روگ ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم و تربیت سے آراستہ قومیں نہ صرف زندہ رہتی ہیں۔ بلکہ ہر درپیش چیلنج کا مقابلہ کر کے ترقی کے منازل طے کرتی چلی جاتی ہیں اور جو قومیں تعلیم سے منہ موڑ لیتی ہیں جہالت انہیں تباہی کے گڑھوں میں دھکیل دیتی ہے۔ مغربی اقوام کی کامیابی کا راز صرف اور صرف تعلیم ہے۔

سرسید نے بچشم خود انگلستان کے نظام تعلیم مشاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے اعتراف کیا

ہے۔ انگلستان والوں کی عظمت کا راز لامحالہ تعلیم ہے۔ انہوں نے اپنی کم مائیگی
، ہمت ماتم کیا مگر کمرہمت باندھ کر مسلمانوں کے لئے تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست
یا۔ گویا اہمیت کے لحاظ سے سرسید نے تعلیم کو اولیت دی۔

سرسید نے تعلیم کے مقاصد کی وضاحت یوں کی ہے :۔

" میں اپنی قوم کو آسمان کی مانند کرنا چاہتا ہوں جو رات کے وقت ہم کو دکھائی دیتا ہے۔ جب میں رات کو آسمان دیکھتا ہوں تو میں اس کے اس حصہ کو جو نیلا نیلا سیاہ اور ڈراؤنا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جن کے سبب سے اس تمام سیاہ رو آسمان کو بھی عجیب و غریب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے "

" اے صاحبو! کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر قوم کو معزز اور باعزت بنا سکتے ہو "

تعلیم کی مقصدیت کے بارے میں سرسید کے الفاظ روز روشن کی طرح واضح ہیں وہ اپنی قوم کو اقوام مغرب کے مقابلے میں مہذب، شائستہ اور باوقار بنانا چاہتے تھے انہیں مسلمانوں کی جہالت سخت ناگوار تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بہترین سائنس دان ادیب، صحافی، شاعر، فلسفی، موجد، ڈاکٹر، انجینئر، جنرل، پروفیسر، سکالر اور بیرسٹر ہوں۔ انہیں لوگوں کے دل جیت لینا آتے ہوں۔ وہ آداب جہاں بانی سے واقف ہوں۔ دنیا والے ان پر رشک کریں۔ سب سے بڑھ کر ان کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو اس قابل بنانا تھا کہ وہ ہندوؤں سے اپنے حقوق نہ صرف طلب کریں بلکہ حاصل کریں۔ اور ان کی حفاظت کے اہل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو ابتدا میں سیاست سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اصل میں وہ تعلیم سے مزین کرنے کے بعد سیاست

میں مسدس لینے کے حق میں تھے تاکہ ہندوؤں کی چالوں کو نہ صرف سمجھ سکیں بلکہ ان کا جواب بھی دے سکیں۔ وہ کسی خاص قسم کی تعلیم کے حق میں نہ تھے۔ بلکہ ایک ایسی متوازن تعلیم چاہتے تھے جو بقول ان کے "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لاالٰہ الا اللہ کا تاج سر پہ"

سرسید سے پہلے ہندوستان میں زیادہ تر پرائیویٹ تعلیم کا رواج تھا مسجدوں کے مولوی حضرات بچوں کو عربی، فارسی زبان اور دینی معلومات فراہم کرتے تھے کوئی ایسا ادارہ نہ تھا جو امتحان لیتا یا ڈگری دیتا۔ ملازمتیں بھی صلاحیت کی بنیاد پر ملتی تھیں۔ عموماً والدین ہی بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔

تعلیم میں زبان، حساب، منطق، فلسفہ، طب اور مذہبی معلومات شامل تھیں اس کے علاوہ کوئی موضوع نہیں تھا۔ البتہ خوش خطی کو بہت اہم سمجھا جاتا تھا۔ ہر چیز کو زبانی یاد کرنا مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید حفظ کرنا بہت بڑا کارنامہ خیال کیا جاتا تھا۔ باقاعدہ مدارس نہیں تھے نہ ہی باقاعدہ استاد و طلبہ تھے غیر نصابی سرگرمیوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔

سرسید نے اس طریقۂ تعلیم کو فرسودہ اور بیکار قرار دیا۔ کیونکہ یہ طریقہ جدید تقاضے پورے نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ سرسید نے خود بھی تعلیم اسی طریقہ سے حاصل کی۔ بعد میں کچھ عرصہ دہلی کالج میں پڑھے۔ مگر سرسید اس طریقۂ تعلیم کو انتہائی ناکافی خیال کرتے تھے۔ پرانے وقتوں میں پھر بھی اس کی کچھ اہمیت تھی۔ لیکن انگریزوں کے آنے کے بعد یہ اپنی اہمیت کھو بیٹھا تھا۔

جدید طریقۂ تعلیم سے مراد اہل برطانیہ کا طریقۂ تعلیم تھا۔ جس کے مطابق تعلیم باقاعدہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جاتی تھی۔ یہ تعلیم ہمہ گیر تھی۔ اس میں زبان، ادب، تاریخ، سیاست، معاشیات، حساب، ادیان، فلسفہ منطق، صحافت، فزکس کیمسٹری، قانون، طب، انجینئرنگ غرض تمام شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں ایسی تعلیم دی جاتی تھی۔ جو نہ صرف انسان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی تھی۔ بلکہ تحقیق اور

جس سے نئی نئی ایجادات وجود میں لا کر بنی نوعِ انسان کی تہذیب و ثقافت کو چار چاند
لگا رہی تھی۔

سرسید نے دونوں طریقہ ہائے تعلیم کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ دونوں میں موازنہ
کیا تو دونوں ہی کسی حد تک مفید اور کسی حد تک نقائص سے پُر تھے۔ مثلاً قدیم طریقہ
تعلیم سوائے معمولی معلومات کے اور کچھ نہ دیتا تھا تعلیم حاصل کرنے والا دقیانوسی
قدامت پرست اور لکیر کا فقیر بن جاتا تھا۔ نئی نئی اشیاء اور نئے نئے تجربات
سے خائف تھا۔ بلکہ نئی ایجادات کو کفر سمجھتا تھا۔ اس سے انسان توہم پرست اور
مافوق العادت باتوں کا قائل ہو جاتا تھا۔ اس میں انقلابی روح پیدا نہیں تھی۔
جبکہ جدید طریقہ تعلیم انسان کو دہریت کی طرف لے جا رہا تھا۔ تہذیب و ثقافت تو
ترقی کر رہی تھیں۔ مگر اخلاق و آداب کو گھن لگتا جا رہا تھا۔ آزاد خیالی، فحاشی
عیش، بے حیائی، عریانی اور لادینیت اس کا طرۂ امتیاز تھیں۔

سرسید نے دونوں کو نقصان دہ کہا ہے۔ وہ دراصل قدیم و جدید کو اس طرح
ضم کرنا چاہتے تھے کہ ان کے نقائص سے بچا جائے۔ اور فوائد سے بہرہ ور ہوا جائے۔
وہ مذہبی اور سائنسی تعلیم دونوں کو ضروری خیال کرتے تھے اسی لئے ایک ہاتھ میں
فلسفہ دوسرے میں سائنس اور سر پر لا الہ کا تاج رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک
مذہبی تعلیم انسان کے کردار کو بناتی ہے اور دنیوی تعلیم اسے ہنر مند بنا کر دنیا میں
زندگی آسان کر دیتی ہے۔ اگر کسی ایک کو چھوڑ دیا جائے تو اعتدال نہیں رہتا۔

اب ہم سرسید کے تعلیمی نظریات کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔ سرسید کے
نزدیک تعلیم کے لئے مندرجہ ذیل لوازمات ضروری ہیں:۔

۱۔ واضح مقصد۔ یعنی تعلیم بامقصد ہو۔ بلا ضرورت اور بے مقصد تعلیم
فضول ہے۔

ب منصوبہ بندی۔ مدارج۔ رجحان۔ معیار اور حاصل

ج ۔ محاسبہ ۔ نتائج ۔ جانچ ۔ تشخیص ۔ تدارک ۔ تبدیلی ۔ انہوں نے تعلیم کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل انتظامات کی نشاندہی کی ہے ۔

ا ۔ استاد ب ۔ طالب علم ج ۔ درس گاہ د ۔ تربیت وماحول
ہ ۔ ذریعہ تعلیم ی ۔ اقسام ے ۔ طریقہ ہائے تدریس ۔

سرسید کے نزدیک تعلیم میں سب سے اہم کردار استاد کا ہے ۔ استاد دراصل نئی نسل کے لئے ایک نمونہ ہونا چاہیئے ۔ کیونکہ بچے میں عادات نقل کرنے کی قدرتی صلاحیت موجود ہوتی ہے ۔ وہ استاد کو کردار کے لحاظ سے اپنا آیئڈیل خیال کرتا ہے ۔ اگر استاد کا ذاتی کردار اعلیٰ ہو تو شاگرد خود بخود اس کے مطابق ڈھلتے جائیں گے ۔

اگر استاد کا کردار اچھا نہ ہو تو طلبا کو نہ صرف استاد سے نفرت ہوتی ہے ۔ بلکہ تعلیم سے بھی متنفر ہو جاتا ہے ۔ بعض دفعہ استاد کی بری عادت بچہ اس لئے اپنا لیتا ہے کہ اسے منع کرنے والا کوئی نہیں ہوتا

سرسید کے نزدیک استاد کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیئے ۔ مثلاً خود سگریٹ پیئے اور طلبا کو سگریٹ پینے سے منع کرے ۔ ان کا کہنا ہے کہ طلبا کے سامنے اعلیٰ شخصیت اور کردار کا نمونہ ہونا چاہیئے ۔

سرسید نے استاد کے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہو اور جانتا ہو کہ اس کے علم سے کس طرح دوسرے مستفید ہو سکتے ہیں ۔ سرسید استاد کو بہت بڑا علامہ نہیں دیکھنا چاہتے ۔ صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ بچوں کو ضرورت اور معیار کے مطابق زیادہ سے زیادہ علم دے سکے ۔

استاد کا کام صرف پڑھا دینا ہی نہیں بلکہ شاگرد کے کردار کو اجاگر کرنا اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو تلاش کرنا ۔ اس کی حوصلہ افزائی کرنا ۔ اسے بچوں جیسا پیار دینا تاکہ طالب علم استاد کو اپنا ہمدرد اور شفیق خیال کرے ۔ مگر شاگرد دل سے

بہت زیادہ بے تکلف ہونا بھی درست نہیں۔ حجاب کی ایک ہلکی سی دیوار درمیان میں حائل رہنا دونوں کے مفاد میں ہے۔ کیونکہ استاد کا رعب، دبدبہ اور عظمت کا تصور شاگرد کے ذہن میں رہنا ضروری ہے۔ وہاں استاد کا ہلکا سا خوف بھی شاگرد کے دل میں رہنا ضروری ہے۔

سرسید استاد کو ماورائی نہیں سمجھتے اس لئے اس سے وہی کچھ توقع کرتے ہیں جو ایک دنیادار سے ہو سکتی ہے۔ ان کے نزدیک استاد کو ایثار کے جذبہ سے مزین ہونا چاہیئے۔ معاوضے کے لالچ میں استاد بننا درست نہیں۔ البتہ استاد کو تنخواہ معقول ملنی چاہیئے تاکہ وہ دنیا کے جھمیلوں سے آزاد ہو کر کردار سازی قوم میں مصروف رہے۔ استاد کی تعلیم و تربیت پر خاصی توجہ دینی چاہیئے۔

سرسید کے نزدیک طالب علم کو تعلیم کے عمل میں مرکزی کردار حاصل ہے۔ یہی وہ اصل جوہر ہے جس کی خاطر سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ استاد ہے تو اس کی خاطر عمارت ہے تو اس کے لئے۔ رقم خرچ کی جا رہی ہے تو اس کے لئے۔ وقت صرف ہو رہا ہے تو اس کے لئے۔ غرض تعلیمی عمل کی روح رواں اور نصب العین طالب علم ہے سرسید نے طالب علم کی جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے وہ اگرچہ عملی زندگی میں کم ہی پائی جاتی ہیں۔ مگر طالب علم کا جو آئیڈیل ان کے تصور میں تھا۔ اگر کسی نے وہ حاصل کر لیا ہے تو وہ دنیا میں آفتاب بن کر چمکا ہے۔

سرسید کے نزدیک طالب علم کو اپنے مقصدِ تعلیم سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ اس کے سامنے واضح نصب العین ہونا ضروری ہے جس کے لئے وہ سب کچھ کر رہا ہے۔ طالب علم کی ذہانت کو ایک قدرتی عطیہ خیال کرتے ہیں۔ مگر محنت کو وہ اکتسابی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ذہانت کے ساتھ ساتھ محنت، لگن، توجہ اور دلچسپی بھی ضروری ہے وہ طالب علم کو صحت مند، چاق و چوبند دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے علی گڑھ میں کھیلوں وغیرہ کا معقول انتظام کیا ان کے نزدیک ورزش جسم کے

لئے ہی نہیں ذہن کے لئے بھی صحت کا پیغام ہے۔

وہ طالب علم کی جہاں آزادی کے قائل تھے وہ ان کی ہمہ وقت نگرانی بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اقامتی اداروں پر زیادہ زور دیا ہے تاکہ طلبا پر ہمہ وقت نگرانی ہوتی رہے اور ان کی زندگی منضبط ہو جائے۔

وہ طالب کو چپ چاپ کم سم اور ان سوشل نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں پھسپھسے شاگردوں سے شکوہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ طالب علم کو آل راؤنڈ ہونا چاہئے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے طلبا سے انہیں بہت انس تھا۔ وہ چاہتے تھے۔ کہ طلبا دوران تعلیم سب کچھ حاصل کریں۔ یہاں سے فارغ ہو کر نکلیں تو ہر لحاظ سے کامیاب زندگی بسر کریں۔

وہ طلبا میں مقابلے کی سپرٹ پیدا کر کے ان کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لینا بہتر سمجھتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے انعامات اور وظائف کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

وہ طلبا کو معاشی مسائل سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے نادار طلبا کو ہر لحاظ سے خود کفیل کر دیا تھا۔ کمیٹی ہی ان کے تمام اخراجات برداشت کرتی تھی۔

سر سید کے نزدیک تعلیمی عمل میں تیسرا رکن درس گاہ ہے۔ درس گاہ دراصل ایک فیکٹری کا کام دیتی ہے۔ جہاں صنعت کے لئے ہر قسم کا سامان یعنی مشینری۔ انجینئر میٹریل وغیرہ مہیا کر کے مصنوعات بنائی جاتی ہیں۔ اس کے بغیر صنعت کا عمل ناممکن ہوتا ہے۔ وہ درس گاہ کو صرف ضروری ہی خیال نہیں کرتے بلکہ ایسے خوب صورت کشادہ ہر قسم کے سامان سے پُر موسم کی شدت سے تحفظ کے عین مطابق۔ بلند و بالا عالی شان عمارت کے اندر خوبصورت اور شایان شان فرنیچر دیواروں پر بہترین رنگ و روغن سامنے کشادہ تختہ سیاہ۔ ہوادار کھڑکیاں غرض سر سید کا خیال تھا کہ درس گاہ کی عمارت پر جتنا خرچ کیا جا سکے کرنا چاہئے۔ اس کی پر شکوہ شکل و صورت طلبا کے اذہان

ذہنوں پر بہت اچھا اثر ڈالتی ہے۔

وہ عمارت کو آبادی سے نہ زیادہ دور رکھنا چاہتے تھے۔ نہ زیادہ قریب۔ دور اس لئے نہیں کہ آمد و رفت میں آسانی ہو اور قریب اس لئے نہیں کہ شور و غوغا سے بچا جاسکے۔ شہر کا ماحول درس گاہ پر غالب نہ آجائے۔ وہ عمارت سے ملحق ہوسٹل اور اسٹاف کے لئے رہائش گاہیں بنانا مفید خیال کرتے تھے تاکہ اساتذہ کو دور سے آنا نہ پڑے اس طرح وقت اور پیسہ کی بچت ہوتی ہے۔ دوسرے طلبا کی ہمہ وقت نگرانی ہوتی رہتی ہے۔

عمارت کے علاوہ کھیل کے میدان، بہت بڑا ہال۔ کامن روم، ریڈنگ روم کی ضرورت پر بھی زور دیتے تھے عمارت کے علاوہ باغ باغیچے، ہرے بھرے لان پھولوں سے بھری ہوئی کیاریاں۔ خوبصورت روشیں۔ بیل بوٹے۔ فوارے غرض وہ درس گاہ کو انتہائی خوبصورت دلہن کی مانند سجی ہوئی دیکھنا چاہتے تھے۔

انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کی عالی شان عمارت کا نقشہ اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا تھا اور اسی نمونہ پر علی گڑھ میں عمارت کی تعمیر کا آغاز کیا تو لوگوں نے انہیں دیوانہ قرار دیا۔ مگر وہ دھن کے پکے تھے۔ اپنے کام میں مگن رہے۔ اللہ کا نام لے کر ایک بلند و بالا، صاف ستھری اور پر وقار عمارت بنانے میں کامیاب ہوگئے۔

ان کے نزدیک عمارت کی خستہ حالی، گندگی، تنگی اور کم مائیگی طلباء کے کردار پر اچھا اثر نہیں کرتی۔ اس لئے عمارت کو عالی شان ہونا چاہیئے۔

سر سید نے تعلیم کے لئے تعلیمی ماحول کی موجودگی ضروری قرار دی۔ کیونکہ ماحول کا اثر اذہان پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ تعلیمی ماحول سے مراد ان کی یہ ہے کہ ہر شخص تعلیم کے بارے میں سنجیدہ ہو۔ ہر طالب علم اپنے آپ کو تعلیمی ماحول میں ضم کرے۔ استاد ہمہ وقت تحقیق و تدریس میں مصروف رہیں۔ سوائے تعلیمی کام کے کسی اور طرف توجہ نہ ہو۔ اگر ماحول غیر تعلیمی ہو تو تعلیم کا اثر زائل ہو جاتا ہے

پڑھا لکھا چند روز جہلا کی محفل میں بیٹھے تو اچھا خاصا جاہل بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سر سید طلبا کو باقی معاشرے سے کاٹ کر ایک خالص تعلیمی معاشرے سے وابستہ کرنا چاہتے تھے تاکہ باہر کے اثرات طلبا پر اثر انداز نہ ہوں اور یہاں کے ماحول کا اثر زائل نہ ہو۔

ان کے نزدیک ہمہ وقت کیڑے کی طرح کتابوں میں گھسے رہنا بھی ایک غیر صحت مند سرگرمی سے کم نہیں۔ وہ زندگی کو متوازن دیکھنا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ پروگرام مرتب کیا تھا۔ جس میں کھیل کے وقت کھیل۔ آرام کے وقت آرام۔ پڑھائی کے وقت پڑھائی۔ غیر نصابی سرگرمیوں کے وقت غیر نصابی سرگرمیاں۔ اس طرح انہوں نے ایک جامع ماحول تخلیق کیا تھا۔ جس میں طلباء کی شخصیت کے ہر گوشے کو اجاگر کیا جا رہا تھا۔ طلباء ادبی کام بھی کرتے تھے۔ بحث مباحثے، مشاعرے، ڈرامے بلکہ موسیقی کی محفلیں تک منعقد ہوتی تھیں۔ سیر و سیاحت بھی ہوتی تھی۔ طلبا کو نئی نئی چیزیں بنانے کے مواقع بھی میسر تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ طلباء باقاعدہ نماز باجماعت پڑھتے تھے۔ رمضان کے مہینے میں روزے رکھتے تھے۔ مذہبی تہوار مناتے تھے۔

سر سید لباس کی سادگی اور صفائی پر زور دیتے تھے۔ وہ لباس کے بارے میں بہت زیادہ قدامت پسند نہیں تھے۔ شلوار، کرتہ، شیروانی کے علاوہ اگر کسی نے سوٹ نکٹائی پہن لی تو اسے بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ خود انگریزی لباس پہنتے تھے اور اس معاملہ میں وہ بالکل آزاد خیال تھے البتہ فیشن پرستی کے خلاف تھے۔ وہ طلبا میں سادگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔

پڑھائی کے اوقات میں وہ خاص طور پر ماحول، نظم و ضبط، خاموشی اور توجہ پر پوری طرح دھیان رکھتے تھے۔ استادوں اور طالب علموں سے اکثر ملاقات کرتے اور ان کے مسائل و مشکلات دریافت کرتے رہتے تھے۔

صلاح الدین احمد نے حیات جاوید کے آغاز میں سرسید پر ایک نظر کے عنوان سے جو مقالہ لکھا ہے۔ اس میں ماحول کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"سرسید کی رہبری کا یہ پہلو لیڈرشپ کی تاریخ میں بے مثال ہے وہ قوم کے ہر فرد کو جو علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتا اپنے حلقۂ اثر میں ڈھال کر ایک آئیڈیل انسان بنانا چاہتے تھے۔ مدرسہ کے ماحول میں شرافت، ضبطِ نفس، ایثار، اتحاد، یک جہتی اور سب سے بڑھ کر روشن خیالی جسے برل ازم کا نام دیا جاتا ہے بڑی تیزی سے پھیلتی پھولتی اور نوجوانوں کے طبائع پر اپنا رنگ جاتی تھی۔ پھر جب یہ نوجوان تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے اپنے دیار و امصار میں جاتے تھے۔ تو روشنی کا چلتا پھرتا مینار بن جاتے تھے۔ حسن خیال اور حسن عمل ان کی زندگی کا اسلوب قرار پاتا تھا۔ ان میں ہر فرد اسلامی اخوت کا نمونہ کشادہ دلی کا مرقع اور ہمدردی کا مجسمہ ہوتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جس میدان عمل میں وارد ہوتا اسے اہلیت تنظیم اور سخت کوشی سے گل و گلزار بنا دیتا۔ سرسید کے نزدیک اسلامیان ہند کا مستقبل اسی نوع کی لیڈرشپ پر منحصر تھا اور اسی لئے انہوں نے اس کی تخلیق کو اپنے تعلیمی منصوبے کا محور قرار دیا۔

میری دانست میں سرسید کا یہ مشن اور ملت کی نشاۃ الثانیہ کا جو خواب سرسید نے دیکھا تھا۔ اقبال کے تخیل، جناح کے تدبر اور محمد علی جوہر کی جرأت کے رنگ میں پورا ہوا۔ آج ہم ایک آزاد اور باوقار مملکت کے وارث ہیں۔ اس میں خوش حال پر وقار اور بامعنی زندگی بسر کرنا ہمارا پیدائشی حق ہے۔ لیکن یاد رکھیئے سرسید اگر قومی وحدت اور قومی وجود کی بنیاد نہ رکھتے۔ علی گڑھ کالج میں قومی احساس

وتشخص اور روشن خیالی کی شمع فروزاں نہ کرتے تو ہم ظلمستان
ہند میں اسی طرح بھٹکتے پھرتے جس طرح وحشی قبائل وسطی ہند
میں اب بھی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں"

سرسید کے نزدیک تعلیم کو تربیت میں بدل دینا ضروری ہے۔ صرف معلومات حاصل کر لینا مقصد نہیں بلکہ ان معلومات کو عملی طور پر اپنانا ضروری خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تعلیم سے زیادہ تربیت پر زور دیتے ہیں۔

وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے ایسے افراد کی ضرورت نہیں جو کہنے کو تو علامہ ہوں مگر اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کر سکتے ہوں" وہ علم سے زیادہ عمل پر زور دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فن شناس نہیں بلکہ فن کار پیدا کرنے پر زور دیا ہے وہ طلبا سے عملی کام کرانا پسند کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ایسا علم بے کار ہے جو انسان کو بہتر زندگی گزارنے کے ہنر نہ سکھائے۔ اسی نظریہ کے پیش نظر انہوں نے ہر طالب علم کو کئی کئی ہنر سکھانے پر زور دیا تھا تاکہ عملی زندگی میں ان کے کام آئیں۔

قدیم طریقہ تعلیم صرف مسجدوں کے امام پیدا کر سکتا تھا۔ سائنس دان، انجنیئر ڈاکٹر، سیاست دان وغیرہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ انگریز کا مقصد صرف کلرک پیدا کرنا تھا۔ اس لئے دونوں کے طریقے بے کار تھے۔ اسی لئے سرسید نے ایک تیسری راہ نکالی۔ جو کسی قوم کے شایان شان ہوتی ہے۔ انہوں نے فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ تحقیق اور جستجو کو اولیت دیتے تھے۔ جس طالب علم نے کوئی نئی بات، نیا ہنر، نئی راہ نکالی اسے بہت نوازا۔

انہوں نے صحافت اور ادب کی تربیت کے لئے "تہذیب الاخلاق علی گڑھ گزٹ" اور "علی گڑھ میگزین" وغیرہ کا بندوبست کیا تھا۔ جن میں طلبا کے مضامین چھپتے تھے۔

سرسید نے ہنر سکھانے کا پورا پورا بندوبست کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کالج کے ہر طالب علم کو کوئی نہ کوئی ملازمت ضرور ملی ہے۔ کسی بھی طالب علم نے بیروزگاری کا شکوہ نہیں کیا۔ وہ جہاں بھی گئے ہیں دوسروں سے نمایاں رہے ہیں۔ آج بھی جس دفتر میں یا اسکول میں یا کالج میں کسی علیگ کا وجود ہے۔ وہاں کچھ اور ہی رنگ نظر آتا ہے۔

سرسید لیڈرشپ کے لئے تربیت ضروری خیال کرتے تھے۔ ہر مفکر کا اپنا پروگرام ہوتا ہے۔ کوئی سیاسی ترقی پر زور دیتا ہے کوئی سماجی ترقی پر لیکن سرسید اپنے پروگرام کو زندہ رکھنے کے لئے فن شناس نہیں فن کار پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جو آنے والے حالات کے خاکے میں رنگ بھرتے چلے جائیں۔

علم حاصل کرنے کے لئے زبان کا سہارا درکار ہے۔ جب تک کسی ایسی زبان پر عبور حاصل نہ ہو جس میں وہ علم تحریر ہے۔ اس وقت تک علم کا حصول ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس سلسلہ میں دنیا بھر کے مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ مادری زبان ہی وہ زبان ہے جس پر ایک انسان مکمل عبور حاصل کر سکتا ہے اگر اس زبان میں علم پڑھایا جائے تو طالب علم جلد سمجھ لیتا ہے جلد ما فی الضمیر کا اظہار کر سکتا ہے۔ یہ سب ٹھیک ہے۔ مگر سرسید اس پر ایک شرط عائد کرتے ہیں کہ وہ مادری زبان ترقی یافتہ ہو اس کا سرمایہ الفاظ و ادب بے پایاں ہو۔ اس میں ہر قسم کے خیالات الفاظ کا جامہ پہن سکتے ہوں اور علوم بھی اس زبان میں لکھے جا چکے ہوں۔

اگر کوئی غیر ترقی یافتہ مادری زبان ہو تو اس میں علم کا حصول بہت مشکل ہو جاتا ہے خاص طور پر اگر علم کسی دوسری زبان میں ہو تو پھر اسے مادری زبان میں منتقل کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کا ترجمہ پڑھنے میں تو آسان ہو جاتا ہے مگر اس کی اصل روح ترجمہ میں نہیں سما سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ علم جس

زبان میں ہو اسی زبان کو پڑھ کر علم حاصل کیا جائے۔ ورنہ اس علم پر دوہری محنت درکار ہوگی۔ مثلاً کیمسٹری کا بیشتر علم انگریزی زبان میں ہے۔ مگر مقامی زبان اردو یا فارسی ہے۔ اب یا تو انگریزی سیکھ کر وہ علم حاصل کیا جائے گا یا کیمسٹری کو اردو فارسی میں ترجمہ کر کے علم حاصل کیا جائے گا

سر سید کے نزدیک دوسری صورت مشکل بھی ہے اور غیر مفید بھی۔ ان کا خیال ہے کہ جو علم جس زبان میں ہو اسی زبان میں حاصل کرنا بہتر ہے۔ اس طرح ایک نئی زبان بھی آجائے گی اور علم بھی حاصل ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں کافی دقت اٹھانی پڑے گی۔

سر سید نے انگریزی زبان میں تعلیم کو مفید اور جائز قرار دیا ہے۔ ان کا خیال مدلل ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر بحر اوقیانوس میں لعل و جواہر موجود ہوں تو نکالنے کے لئے وہیں جانا پڑے گا۔ بحر ہند کی تلاش بے کار ہوگی۔

سر سید نے تعلیم کے دو مدارج مناسب قرار دیئے ہیں۔ اسکول کی تعلیم اور یونیورسٹی کی تعلیم۔ یعنی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم۔ ان کے نزدیک پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک بنیادی تعلیم ہے۔ جو ہر فرد کے لئے لازمی ہونی چاہیئے۔ اس درجہ میں کسی ایک یا دو زبانوں پر پورا پورا عبور حاصل کرنا ضروری ہے۔ معمولی روزمرہ کا حساب کتاب جغرافیہ، تاریخ اور دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی پیشہ کی تعلیم ضروری ہے۔ جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے۔ یہ سب کے لئے ضروری نہیں صرف ذہین اور اہل طلباء کا حق ہے۔ بنیادی تعلیم تک استادوں اور خود طالب علموں کو اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیئے کہ کون سا طالب علم علم کے کس شعبے کے لئے موزوں ہے۔ افتادِ طبع اور رجحان کے مطابق اعلیٰ تعلیم ضروری ہے۔

سر سید تعلیم میں تخصیص کے قائل ہیں۔ کیونکہ ایک ہی فرد ہر قسم کی تعلیم نہ تو حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے بنیادی تعلیم کے بعد طالب علم

واستادوں کے مشورے سے ایسے علوم حاصل کرنا چاہئیں۔ جن کے ساتھ اسے
ذہنی لگاؤ ہو جس بھی مضمون کو مطالعہ کے لئے منتخب کیا جائے۔ اس میں کمال حاصل
کیا جائے۔

سرسید تعلیم کے سلسلے میں توازن کے قائل ہیں۔ ابتدائی درجہ میں عام تعلیم کے
ساتھ ساتھ مذہبی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم ضروری ہے تاکہ طالب علم تعلیم کو صرف
حصول معاش ہی کا ذریعہ نہ سمجھ لے بلکہ زندگی کے ہر عمل میں اخلاقی اور مذہبی اقدار
کو پیش نظر رکھے۔ دوسری طرف دنیوی علوم سے بھی صرف نظر نہ کرے بلکہ انہیں حاصل
کرنے میں پوری تندہی سے کام لے۔

ان کے نزدیک تعلیم ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہونی چاہیئے۔ ایسا نہ
نہ ہو کہ وقت محنت اور رقم برباد ہو۔ اس سلسلے میں ضرورت اور کھپت کو بھی نظر رکھنا
چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ ملک کو ایک ہزار ڈاکٹروں کی ضرورت ہو اور پیدا وار ایک لاکھ ہو
اس طرح تعلیم میں کساد بازاری اور نفرت پیدا ہوگی۔

ان کے نزدیک تعلیم ایک فن ہے۔ جس میں تحقیق اور جستجو ہوتی رہے تاکہ
تدریس کے نئے نئے طریقے سامنے آتے رہیں۔ وہ نفسیات پر بہت زور دیتے تھے
کیونکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس لئے نفسیات کو جاننا
ماہر تعلیم کے لئے ضروری ہے۔

سرسید نے طبی، فنی، زرعی، سائنسی اور معاشرتی قسم کی تعلیم کا ذکر کیا
ہے۔ دوسری طرف ادب، فلسفہ، منطق آرٹ جسمانی تعلیم وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے
سرسید کے نزدیک ہر قسم کی تعلیم و تدریس کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ اسی
سلسلے میں وہ قدیم طریقوں کو بھی بیکار نہیں سمجھتے اور جدید طریقوں سے بھی

انحراف نہیں کرتے، ان کے نزدیک براہ راست تعلیم کا طریقہ زیادہ کارگر ہے۔ ٹرانسلیشن
میتھڈ کو انہوں نے مشکل اور طویل کہا ہے۔

وہ تدریس کے نظریاتی پہلو کی بجائے عملی پہلو پر زیادہ زور دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سمعی، بصری اعانتوں پر زیادہ زور دیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک تعلیم کا اصل مقصد کردار سازی ہے رکھانا مقصد نہیں۔ وہ تعلیم کو عملی زندگی سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے

ان کے نزدیک کوئی مخصوص طریقہ بہتر نہیں تھا بلکہ وہ استاد اور مضمون کی نوعیت اور طلبار کی صلاحیت کے مطابق ڈھل جانے والے طریقے کو بہتر سمجھتے تھے کیونکہ اصل مقصد طالب علم کو سمجھانا ہوتا وہ چاہے جس بھی طریقہ سے اچھی طرح سمجھے ویسا ہی طریقہ بہتر خیال کرتے تھے۔

سرسید نصاب کے خیال کے بارے میں ---------- اس بات کے قائل تھے کہ وہ عام فہم مگر جامع ہو۔ نہ تو اس قدر طویل ہو کہ طالب علم اکتا جائے۔ اور نہ ہی اس قدر مختصر ہو کہ کچھ پلے نہ پڑے۔ وہ رٹے کے سخت خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ طالب علم کچھ جانے صرف نگلے نہیں اور پھر اُگلے نہیں بلکہ دوبارہ اسے ظاہر و تحریر کر سکے۔ وہ نصاب کو محدود کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ بلکہ اسے عام زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے حق میں تھے۔

سرسید کے نزدیک صرف تحریری امتحان طالب علم کی قابلیت جانچنے کیلئے ناکافی ہے۔ وہ عملی امتحان کے قائل تھے۔ اس لئے وہ تحریری کے ساتھ زبانی اور عملی امتحان لیتے تھے۔ جہاں تک یونیورسٹیوں کا تعلق تھا۔ وہ ان سے سخت نالاں تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں۔ ان کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں جو ٹکڑا علم کا وہ دیتی ہیں۔ اس کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔"

سرسید تعلیم کی آزادی کے قائل تھے۔ ایسی تعلیم جو حکومت کے زیر اثر ہو اسے بے اثر

اور بیکار سمجھتے تھے۔ کیونکہ تعلیم وہ معاشرتی ضرورت ہے جس کا معاشرے کو خود بندوبست کرنا چاہئے۔ حکومت ہمیشہ سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر تعلیم کا بندوبست کرتی ہے۔ دوسرے تعلیم کا وسیع بندوبست حکومت کے بس کی بات نہیں۔ ملازم پڑھاتے عوام کو ہیں اور تنخواہ حکومت سے لیتے ہیں۔ لڑکے بھی سرکاری تعلیم گویا امر مجبوری حاصل کرتے ہیں۔ شوق سے نہیں۔ ایسی تعلیم میں مقصد واضح نہیں ہوتا۔ بلکہ تعلیم برائے تعلیم جو صرف حکومت کی ضروریات پوری کر سکے پیش نظر ہوتا ہے۔ احتساب اور معائنہ کا طریقہ بھی بے کار ہے۔ اس طرح استاد حکومت کے خوف کے تحت پڑھاتے ہیں۔ اپنا فرض سمجھ کر نہیں پڑھاتے۔ تعلیمی کام کو استاد اور طلبا صرف بیگار سمجھتے ہیں۔

اس کے خلاف تعلیم اگر پرائیوٹ ہو قوم کے درد مند افراد اس میں فرض سمجھ کر حصہ لیں۔ اپنے وسائل اپنا طریقہ اور اپنی ضرورت کے پیش نظر اپنی مدد آپ کے تحت یہ کار خیر انجام دیں تو بہتر ہے۔ ایجوکیشنل کمیشن کے سامنے فرمایا ہے:۔

جب تک لوگ اپنی تعلیم کا تمام اہتمام اپنے ہاتھ میں نہیں لیں گے اس وقت تک تعلیم کا مناسب ہونا مشکل ہے۔ پس ملک اور قوم کے لئے یہ مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام تر اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود دست اندازی سے بالکل علیٰحدہ ہو جائے۔"

وہ حکومت پر تعلیمی اداروں کے قیام کا فرض عائد کرتے ہیں۔ مستحق طلبا کے وظائف قابلیت کی بنیاد پر اور غربت کی بنیاد پر حکومت کا فرض ہے۔ اداروں کو مالی گرانٹ اور ان کا احتساب بھی حکومت اپنے ذمے لے۔"

سر سید تعلیم کو حکومت کی گرفت سے آزاد رکھنا چاہتے تھے۔ سر سید کے یہ نظریات آج ہر کسی نے تسلیم کر لئے ہیں اور تعلیمی معاملات میں حکومتوں کی دخل اندازی سے جو نقصانات ہوتے ہیں۔ روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ وہ تعلیم کو قوم کا ذاتی مسئلہ قرار دیتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے نمونہ کا ایک تعلیمی ادارہ بنایا

جہاں اپنی مرضی سے نصاب امتحان۔ نصابی و غیر نصابی سرگرمیاں ادبی و ثقافتی تقاریب۔ کھیل وغیرہ سب کچھ ضرورت کے عین مطابق ترتیب دیا اور نتائج دنیا کے سامنے ہیں ۔

[illegible]

اقبال کا نظریۂ تعلیم

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ کسی قوم کے سنورنے اور زوال پذیر ہونے میں تعلیم کا گہرا عمل دخل ہوتا ہے۔ مزید برآں ملک کی خوشحالی اور ترقی کا راز بھی اس ملک کے طریقۂ ہائے تعلیم میں مضمر ہوتا ہے۔ تاریخ میں اس حقیقت کی واضح مثالیں موجود ہیں کہ جب کبھی جابر حکمران کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ملک کی آبادی کو اپنے تابع اور مطیع کر سکتا ہے تو اس نے بجائے جبر و تشدد کا راستہ اختیار کرنے کے اس کی آئندہ نسلوں کو مفلوج کیا تاکہ ان میں وطن پرستی اور حب الوطنی کے جذبات کی بیخ کنی کر دی جائے اس مقصد کے حصول کے لئے نصاب تعلیم کو ان خطوط پر استوار کیا جن سے یہ مقصد حاصل کیا جا سکے۔ انگریز نے جس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوا تھا اس نظریہ کو رہنما اصول بنایا اور اسے خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔ برصغیر پاک و ہند میں لارڈ میکالے نے برطانوی سامراج کی گرفت کو مضبوط کرنے کے لئے نصاب تعلیم میں تبدیلیاں کیں۔ اس نے ایسا نصاب تعلیم مرتب کیا جس کی بدولت مسلمانوں کی نئی نسل رفتہ رفتہ

اپنی ثقافت اور تہذیب و تمدن سے بے بہرہ ہو گئی ہے ؎

آہ مکتب کا جوان گرم خوں

ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

برطانوی اربابِ بست و کشاد نے تاریخ کی کتابوں میں مسلمانوں کے مشاہیر کی ایسی بھدی تصاویر پیش کیں کہ مسلمانوں کی نئی پود نے اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنے کی بجائے ان سے بیزاری کا اظہار شروع کر دیا۔ سراج الدولہ حیدر علی، ٹیپو سلطان، محمود غزنوی اور اورنگ زیب کو انہوں نے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔

انگریز معاشی طور پر بھی مسلمانوں کو پس ماندہ رکھنا چاہتا تھا کیونکہ اپنی سلطنت کی جڑوں کو گہرا کرنے کے لئے ایسا کرنا ازبس ضروری تھا۔ چنانچہ نئی نسل کو فنی اور سائنسی تعلیم سے دور رکھنے کے لئے لارڈ میکالے نے نصاب تعلیم میں خاص اہتمام کیا۔ علامہ اقبال نے جو فطرتاً سے ایک حساس دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ جب اس خلار کو محسوس کیا اور نصاب تعلیم کے زہریلے اثر کا اندازہ لگایا تو بے چین ہو گئے۔ انہوں نے خوابیدہ قوم کو منزل کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے

سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

اقبال نے کئی ایک مواقع پر تعلیم جدید کی مخالفت کی ہے۔ اقبال ایک ایسے نظام تعلیم کے متمنی تھے جو اچھے باکردار اور بلند نگاہ طالب علم پیدا کرے۔ اقبال جیسے مفکر کے نظریات کو سمجھنے کے لئے قدرے تجزیئے کی ضرورت ہے۔ اقبال کا عقیدہ تو یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ محض عقل کامل نہیں بلکہ اس کے حصول کے لیے ایمان اور وجدان کی بھی ضرورت ہے۔ علم کی غرض و غایت محض مادی زندگی کے فوائد حاصل کرنا نہیں۔ بلکہ مادی زندگی کی آرائش کے علاوہ داخلی زندگی کی اصلاح اور تربیت بھی ہے۔ اقبال اپنے نظریۂ تعلیم میں خودی کی تربیت کو محور بناتے ہیں۔

وہ ایک ایسے نظام پر زور دیتے ہیں جو عقل کی تربیت کے ساتھ ساتھ وجدان اور جذبے کی تربیت کی ضمانت بھی فراہم کرے ۔

آہ یہ اصل کلیسا کا نظام تعلیم!
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال کے نزدیک وہ علم جو حواس ظاہری اور عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور وہ علم جو باطنی قوت کے ذریعے حاصل کیا جائے دونوں کے درمیان گہرا ربط قائم ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ مکمل تعلیم وہی ہو سکتی ہے جس میں دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے ۔ اقبال دینی علوم کے حصول کو خودی کی تربیت کے لئے ضروری تصور کرتے ہیں ۔ دین ایک مکمل ضابطہ حیات ہے چنانچہ وہ دین میں دنیا کو بھی شامل تصور کرتے ہیں ۔ جبکہ جدید طریق تعلیم دین اور دنیا کو دو الگ چیزیں سمجھتا ہے ۔ اقبال روایات کی تعلیم بہت اہم سمجھتے ہیں ۔ انکے نزدیک جو قومیں اپنے ماضی کو فراموش کر دیتی ہیں وہ اپنی قومی حیثیت کو کھو بیٹھتی ہیں ۔ اقبال ایسے نظام تعلیم کے خواہاں ہیں جو نئی پود میں آفاقی روح پیدا کرے اور ان میں نور بصیرت بھر دے ۔ وہ نوجوانوں میں ایسی صلاحیتوں کو اجاگر کرے جن کی بدولت تسخیر کائنات ممکن ہو ۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اقبال ایسا نظام چاہتے ہیں جس سے نظر میں بے باکی پیدا ہو ۔ علامہ چاہتے ہیں کہ ان شاہین بچوں کو ایسے طریقے سے تعلیم دی جائے جس سے ان کے پوشیدہ جوہر اجاگر ہوں اور ان میں جذبۂ عمل پیدا ہو ۔ اقبال کے نزدیک خداوندانِ مکتب پر بہت ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔ وہ ایسے معلم پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں جو بلند نگاہ ہوں اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ہوں ۔ اقبال خود بھی کچھ عرصہ تک معلم کی حیثیت سے اس فرض کو انجام دیتے رہے ۔ اقبال

۱۹۱۵ء میں بمبئی میں مسلم سٹوڈنٹس یونین کے افتتاح کے موقع پر قائد کا پیغام تھا کہ:

"آپس میں تنظیم پیدا کرو تاکہ ایسوسی ایشن اور اس کے آئندہ
زندگی لوگوں کے لئے بھی مفید بن سکے۔ خود اعتمادی کی کوشش
کرو تاکہ زندگی مستحکم بنیادوں پر تعمیر کی جا سکے۔"

اپنے دورۂ لندن ۱۹۱۳ء کے دوران قائد نے وہاں اپنے طالب علموں میں انتشار اور باہمی صف آرائی کو بڑے دکھ سے محسوس کیا اور اپنی کاوشوں سے انہیں متحد کرنے کی کوشش کی تھی۔ قائد ڈسپلن کے زبردست حامی تھے۔ DISCIPLINE اپنی ساری معنویت کے ساتھ طالب علم کا لازمہ ہے۔ خود حصول علم طالب علم کا ڈسپلن ہے اور ضابطۂ اخلاق کو تربیت دینے والا عمل۔ ۱۹۲۰ء میں کانگریس نے تعلیمی مقاطعہ کا اعلان کیا اور کالج اسکول بند کرنے شروع کئے۔ اس سلسلہ میں جب علی گڑھ یونیورسٹی پر کانگریسی طلبا نے دھاوا بولا تو قائد نے کانگریس کا رکن ہونے کے باوجود اس عمل کے خلاف آواز بلند کی۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بمبئی والے اجلاس ۱۹۲۴ء کو قائد نے بڑی دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا۔ مسلمان طلبا کی اس تنظیم میں اس سال منعقد ہونے والے جلسے نے ایک اور ہی روح پھونک دی۔ جس کے بعد سے یہ تحریک خاصی فعال ہو گئی۔ مسلمان طلبا مسلمان نوجوانوں کے تناسب میں نہ صرف بے حد کم تعداد تھے بلکہ ان کی باہمی تناتنی اور مناقشت نے ان کی آواز کو منتشر کر کے ان کو طلبا برادری کا انتہائی حقیر حصہ بنا دیا تھا۔ قائد ان حوالوں سے مسلمان طلبا کے متحد پلیٹ فارم کو ان کی پہلی ضرورت سمجھتے تھے۔ نوجوانوں سے ان کی دلچسپی مذہبی قیود میں محصور نہ تھی۔ خود کانگریس کی ذیلی تنظیم طلبا جب آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے قائم ہوئی اور ان لوگوں نے اسے طلبا کی کل ہند تحریک بتایا تو قائد نے اس کے اجلاس کی صدارت قبول کی۔ اس کے منتظمین میں مسلمان طلبا بھی تھے جنہیں بعد میں یہاں بھی مایوسی ہوئی اور اس تحریک کے کل ہند روپ کا پول کھل گیا۔

جامعہ ملیہ اس وقت مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی حلیف نہ تھی۔ جب تعلیمی برادری کے
لئے سے قائد نے ان کے جلسے میں شرکت بھی قبول کر لی تھی۔ یہ قائد کی ایسی ہی
دوربینہ پیش قدمی سے ممکن ہو سکا کہ جامعہ ملیہ بعد میں ان کی حامی بن گئی

جولائی ۱۹۳۵ء کو آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس سے خطاب کرنا
انہوں نے محض اس لئے قبول کر لیا کہ اس کے کارکنوں میں مسلمان طلبا بھی شامل تھے۔
ورنہ یہ اجلاس جس قائد کے کٹر مخالف پنڈت جواہر لعل نہرو صدارت کر رہے
تھے اس سے خطاب کرنا قائد کو کبھی قبول نہ ہوتا۔

ہندو طلبا کے اس قسم کے سلوک کے نتیجہ میں بنگالی طلبا، مسلمان طالب علموں
کی ایک تحریک قائم کرنا چاہتے تھے۔ محمد نعمان نامی طالب علم اس کا آغاز علی گڑھ
سے کرنا چاہتے تھے مگر یہ ممکن نہ ہوا۔ سو جنوری ۱۹۳۷ء میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن
کا ابتدائی اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ دوسرا جلسہ کلکتہ میں اور بعد میں پٹنہ علی گڑھ
اور بالآخر دہلی میں اجلاس ہوئے۔ یہ عمل طلبا کی سطح پر باہمی اتحاد اور شخصی اور
اجتماعی ڈسپلن پیدا کرنے کا عمل تھا۔ جیسا کہ انہوں نے ۱۹۳۹ء کے پیغام عید کے
موقع پر کہا تھا کہ :-

"مجھ سے نوجوان پوچھتے ہیں کہ ہم قوم کی خدمت کس طرح کریں؟
میرا جواب ہے کہ ہم میں سے اگر ہر شخص اپنی شخصیت ہی
کی تنظیم کر لے تو یہی ملک کی خدمت ہوگی۔"

طلبا کے محاذ کی تربیت اور ترتیب کو جانچ سکنے والی آنکھ مسلمانوں کے
لئے آنے والے زمانوں میں کسی بھی فتح مبین کی پیش گوئی کر سکتی تھی۔ قائد نے ان
نوجوانوں کو جس طرح صاحب نطق و کردار بنا دیا۔ پھر ان کی صفوں میں
جس طرح اتحاد پیدا کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف ان کی زبردست تنظیمی صلاحیتوں کا
ثبوت بلکہ ان کی مقناطیسی شخصیت کا پہلا سیاسی ثبوت بھی تھا۔ مسلم طلبا کا
اتحاد قیام پاکستان سے ٹھیک دس سال پہلے تخلیق کر کے ملی بنیادوں میں

وہ بھاری پتھر چن دیا تھا جس پر بعد میں بڑی سے بڑی اور نئی سے نئی تعمیر کا ڈول ڈالا جا سکے۔ جب مسلم اکثریت کے صوبوں میں یہ حال تھا کہ نہ وہاں مسلم لیگ قدم جما سکی تھی نہ وہ کسی متحدہ لیڈر شپ پر متفق ہو سکے تھے۔ طلبا نے اس وقت قائداعظم کے پیچھے اپنی صفیں سیدھی کر لی تھیں۔ یہ وہ حالات تھے کہ ابھی صرف ملی تنظیم ہی ایک سوال تھی۔ اقبال کا بنایا ہوا تصور پاکستان ابھی ہماری سیاست کے مطالبوں سے دور تھا۔ قائداعظم علیہ الرحمتہ نے اول و آخر طلبا کو سیاسی محاذ آرائی سے دور رکھنا چاہا اور قیام پاکستان سے قبل اور مابعد بھی انہیں یہی درس دیا۔ اس میں استثناء کے صرف دو موقعے آئے اور دونوں موقعے وہ تھے جو کانگرس اور اس کی ذیلی طلبہ تنظیموں کے پیدا کئے ہوئے چیلنج کے طور پر ظہور میں آئے۔ ان میں ایک لمحہ گرمیوں کی ان تعطیلات میں آیا۔ جب طلبا تحریک پاکستان کے ہراول بن کر آنے والے انتخابات کے لئے قائداعظم کا پیغام لے کر گلی گلی گاؤں گاؤں ہر مسلمان کے دروازے پر پہنچے۔

عمران افضل صاحب نے اپنے ایک مضمون " قائداعظم اور طلبا " میں بجا طور پر فرمایا کہ قائد طلبا کو عملی سیاست سے دور رکھنے کی کوشش کرتے رہنے کے ساتھ ساتھ اس کا ضرور خیال رکھتے تھے کہ طلبا سیاست کے بارے میں بے خبر نہ رہیں۔ اسی لئے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے وہ معاشی، سیاسی اور اقتصادی صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالتے۔ مسٹر یحییٰ ہال علی گڑھ میں ۱۹۴۴ء کے ایک جلسے میں قائد نے طلبا سے کہا کہ:۔

"سیاست اور اقتصادیات کے مسائل پر آپ کا مطالعہ جتنا وسیع ہو سکے۔ اتنا ہی بہتر ہے۔ خود ان مسائل پر گفتگو، بحث مباحثہ اور تبادلۂ خیال جس قدر زیادہ ہو آپ کے لئے مفید ہوگا "

اس جلسے میں آپ نے فرمایا کہ:۔

" طلبا کو سائنس، صنعت و حرفت اور تجارت کے مضامین

کی طرف بھی رخ کرنا چاہیئے "

بے مقصد اور بے ترتیب ڈگریوں کے حصول کی بجائے با مقصد، پیشہ ورانہ، ٹیکنیکل اور تخصیصی تعلیم کی اہمیت قائد کی نگاہ میں بے حد اہم تھی۔ مذکورہ بیان اسی حوالے کا ایک مطالعہ ہے۔

قائد طلبار کو عملی سیاست سے دور رکھتے ہوئے ایک بہت بڑا ایثار کر رہے تھے۔ باوجودیکہ ان کے واحد قابلِ اعتماد سپاہی نوجوان لوگ ہی تھے۔ جبکہ پریس یڈیو اخبارات، سیاسی جماعتیں، علمار کی اکثریت، دولت، حکومت سب یا توان کے تصورِ پاکستان کے مخالفوں کے ساتھ تھے یا کم از کم ان سے علیحدہ تھے۔ ان سب کے باوجود قائد نے طلبار سے تعلیم کی قربانی کی قیمت پر قومی خدمت طلب نہ کی۔ ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو آپ نے طلبا سے جس تعاون کی اپیل کی وہ صرف اس قدر تھا :۔

"اب وقت آگیا ہے کہ تم ایک تعمیری لائحہ عمل کے لئے خود کو وقف کردو۔ اپنی چھٹیوں کو تعمیری کاموں پر صرف کرو۔ اپنے عوام میں تعلیم کی اشاعت اور معاشرے کی اصلاح کا عمل جاری کرو۔ اقتصادی ترقی، برتر سیاسی شعور اور تنظیم کو وسیع کردو "

قراردادِ پاکستان قبول کر چکنے کے ایک سال بعد تک سوائے تعمیری اور مثبت شراکت کے قائد طلبار سے اور کوئی سیاسی اشتراک نہیں مانگتے۔ حالانکہ مادی اسباب کے عدم حصول کے باعث وہ اس وقت سخت ترین آزمائشوں میں گھرے ہوئے تھے۔

۱۹۴۱ء میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے "پاکستان کانفرنس" منعقد کی۔ جس نے قراردادِ پاکستان کی توثیق کی۔ یکم مارچ ۱۹۴۱ء کے اس اجلاس میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا جا چکنے کے بعد قائد مائک پر آئے اور کہا کہ " اپنی بات کہنے سے پہلے میں نوجوانوں کے خیالات جاننا چاہتا ہوں "؟ جس پر نوجوان طلبا نے اپنی تقاریر میں

انہیں اپنی خدمات پیش کیں۔ قائد اس وقت طلباء کے ممنون بھی تھے کہ انہوں نے اس لمحے میں تحریکِ پاکستان کی ترویج کی۔ جب اپنے لوگ بھی اسے "مجذوب کی بڑ" اور "دیوانے کا خواب" کہہ کر تمسخر اڑا رہے تھے۔ پھر یہ جلسہ صرف طلباء ہی کا تھا۔ جنہیں کوئی بھی سیاسی لیڈر خوش کئے بغیر سٹیج سے نہ اترتا۔ مگر قائد کی حق گوئی اور طلباء کو بخشے ہوئے تصورِ تنظیم [illegible] کا یہ نتیجہ تھا کہ طلباء نے اس عقیدت سے قائد کی یہ رائے سُنی (جب انہوں نے کہا) کہ :-

"میں نے نوجوانوں کی تقریریں سُنیں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نوجوان نوجوان ہی ہوتے ہیں۔ ان سے بزرگوں کے سے تدبر کی توقع کرنا غلط ہوتا ہے۔"

طالب علموں کے ساتھ بھی قائدِ اعظم کا رویہ اسی مزاج کا حامل تھا جو قائد کے خصوصی شخصی کردار کی شناخت تھی۔ ورنہ دوسرے لیڈر اسی زمانے میں طلباء کے قدموں میں بیٹھ کر مقبول ہونے کی کوششیں کیا کرتے تھے۔ مگر قائد کا رویہ اس گہرے اعتماد کی پیداوار ہے جو طالب علموں کے دل و جان جیت لینے کے بعد ہی کسی شخصیت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اصولوں کے بارے میں طلباء کو رعایت نہ دینے والے قائدِ اعظم اپنی مہربانیوں اور خصوصی دلچسپی کی صورت عنایتیں جس طبقے پر نچھاور کر دیتے تھے وہ صرف طالب علموں ہی کا گروہ ہوا کرتا تھا۔ قائد خود نوجوانوں کی طرف سے تنقید اور اختلافی آواز سن کر خوش ہوتے۔ ایک جلسے میں کسی طالب علم نے قائدِ اعظم کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا تو مسرت سے کہنے لگے : "مجھے تم جیسوں کی ضرورت ہے۔" جس زمانے میں شدید مصروفیات کے باعث لیاقت علی خان جیسے لوگ قائد سے ملنے کے لئے گھنٹوں انتظار میں رہا کرتے تھے ان دنوں بھی ایک طالب علم ایک چھوٹی سی چٹ بھیج کر ان سے فوراً مل سکتا تھا۔ یہ عالم بعد میں نئی مملکت کی ساری تکلیف دہ ذمہ داریوں کے ہجوم اور بے پناہ مصروفیت کے زمانوں میں بھی قائم رہا۔

طلبا بھی قائد سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ مارچ ۱۹۴۱ء میں مسلم فیڈریشن
آف سٹوڈنٹس کے اجلاس لاہور ہی کی بات ہے۔ جب ایک نوجوان محمد اشرف اپنے
جذباتِ عقیدت پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے آگے بڑھ کر قائد کا منہ چوم لیا۔
سو قائد کی ٹوپی گرتے گرتے بچی۔ یہ ایک انتہائی عجیب اور ناقابلِ یقین منظر تھا
مگر قائد نے اس نوجوان کے گال شفقت سے تھپتھپائے اور آگے بڑھ گئے۔ دوسرے
ایک موقعہ پر جب اسی طالب علم نے قائد کے اس لطف و کرم کے تشکر کے طور پر ان
کے آگے رکوع کی حد تک گردن جھکا دی تو قائد کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آپ نے
سختی کے ساتھ اسے کوٹ کے کالر سے کھینچ کر سیدھا کھڑا کرتے ہوئے متنبہ کیا کہ
خبردار انسان صرف خدا کے آگے جھک سکتا ہے اور تم مسلمان بھی ہو۔ اسی یادگار
جلسے کے سلسلہ میں قائد کے استقبال کے موقع پر جب ایک طالب علم نے قائد کے
ہاتھ کو بوسہ دینا چاہا تو آپ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا کہ مجھے معبود نہ بناؤ۔
ان کا کہنا تھا کہ اظہارِ محبت میں بھی ہم مسلمان بعض حدود و قواعد رکھتے ہیں۔

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک جلسے کی صدارت ایک نوجوان طالب علم کر
رہا تھا۔ کسی موقعہ پر قائد نے جو شریکِ اجلاس تھے۔ کھڑے ہو کر بات
کرنے کی اجازت چاہی۔ مگر صدرِ مجلس نے قائد کو بحث کی اجازت نہ دی اور
قائداعظم بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد نوجوان صدر نے قائد کو تقریر کرنے کو کہا۔ جس پر
قائداعظم اٹھے اور اپنی بات کی۔ اجلاس کے بعد قائد نے مذکورہ نوجوان سے پوچھا
کہ یہ کیسا فیصلہ تھا؟ تو اس نے کہا کہ میں صرف اپنا حق صدارت استعمال کر رہا
تھا۔ اس پر قائد نے اسے کہا "میں نے اپنے صدر کی تعظیم کی مگر کیا تم نے
اس سے ڈسپلن کا سبق سیکھا یا نہیں؟

شروع میں ذکر ہوا تھا کہ قائد علی گڑھ یونیورسٹی کو نہ صرف عطیات دیتے
رہتے تھے بلکہ اس کے سالانہ اور دیگر جلسوں کے انتہائی محترم مہمان ہونے کا
شرف بھی رکھتے تھے اس کے علاوہ انہیں یونیورسٹی کی قانونی کمیٹی کے سب سے سینئر

آپ نے تنبیہہ کی کہ

"اگر تم کسی سیاسی پارٹی کے آلۂ کار بن گئے تو یہ تم لوگوں کی سب سے بڑی بھول ہوگی۔"

افسوس اس کا ہے کہ ہم قائد کے سب سے بڑے درث ثابت ہوئے جنہوں نے صرف تعلیمی منصوبہ بندی میں قائد کے رو تیوں سے روگردانی کی بلکہ طلبا کے ساتھ سلوک میں بھی قائد کے مزاج داں نہ نکلے۔ یہی نہیں بلکہ ہم نے قائد کے مشوروں کے برعکس راہ اختیار کر کے تعلیم جیسے ادارہ کو بے حیثیت عالمی کرنا اہلوں کے سپرد بھی کیا اور اجنبیوں کی تحویل میں اپنے بچوں کا مستقبل دے کر انہیں اپنی قومی حسیات سے دور تر کر دیا۔ داخلی طور پر منصوبہ بندی کرتے ہوئے ہم نے ان لوگوں کی پالیسیوں پر تکیہ کیا۔ جن کے سینے میں علم نے روشنی پیدا ہی نہ کی تھی طالبعلم تک ہماری حسیات نہ پہنچ سکنے کا یہ خمیازہ ہے کہ وہ ملک جس کے ہراول میں طالب تھے اس کے نصف غالب کو بنگال کے نوجوان طالب علموں نے ۲۴ سال کے اندر کا کر علیحدہ کر دیا قائد کے بعد کی یہ ساری کہانی ہماری قائد سے روگردانی کی تاریخ بھی ہے اور قومی فیصلوں میں بے عملی اور جہالت کے دور دورہ کی داستان بھی۔

محمد اشرف چوہدری

برطانیہ کا نظام تعلیم

برطانیہ میں اٹھارویں صدی تک تعلیم کا کوئی باقاعدہ نظام نہ تھا۔ چند اسکول تھے، وہ بھی مذہبی تنظیموں کے تحت۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں صرف ان لوگوں کو داخلہ مل سکتا تھا جو چرچ آف انگلینڈ کے عقیدت مند ہونے کا ثبوت پیش کرتے تھے۔ عام لوگوں نے کافی ہاؤسوں کو تعلیمی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہوا تھا۔ ۱۸۸۶ء میں لندن یونیورسٹی قائم ہوئی تو پہلی بار تعلیم مذہبی تسلط سے آزاد ہوئی۔ جمہوریت کے استحکام کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے نظام تعلیم میں بھی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ بیسویں صدی میں برطانیہ کا نظام تعلیم اس کی نوآبادیوں میں بھی رائج ہوا۔ خود برطانیہ میں اس مسئلہ پر مسلسل توجہ دی جاتی رہی اور اسے بہتر بنانے کی راہیں تلاش کی جاتی رہیں۔

آج کے برطانیہ میں تعلیم پر ہونے والے اخراجات کو INVESTMENT IN FUTURE کہا جاتا ہے۔ ۷۶-۱۹۷۵ء تک تعلیم پر اخراجات کل اخراجات کا گیارہ فیصد تھے اور ۸۰-۱۹۷۹ء کا ۱۴٪ ۔

تقریباً تمام طلباء ۶ سال سے لے کر ۱۶ سال تک اسکول جانے کے قانونی تابع ہیں۔ انیسویں صدی تک برطانیہ میں تعلیم مخصوص مذہبی طبقوں کے قائم کردہ چرچوں کے تحت تھی۔ جو کچھ اسکول تھے۔ وہ کلی طور پر اسکول کے بورڈ اور پرنسپل کی خاص طور پر ماتحتی میں تھے۔ مرکزی حکومت کا دخل بہت کم تھا۔ اختیارات کی تقسیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ ۱۹۴۴ء کے ایکٹ سے برطانوی نظام تعلیم میں مرکزی حکومت اور لوکل اتھارٹیز کے درمیان جو نیا رشتہ ابھرا ہے۔ اس کے تحت تعلیم میں DECENTRALIZATION کچھ اس طرح آگئی۔ ہے کہ اب LOCAL AUTHORITIES اپنے طور پر زیادہ با اختیار ہو گئی ہیں۔

بنیادی طور پر اصل THREE TIES تعلیمی نظام ' لوکل اتھارٹیز چلا رہی ہیں جس میں پرائمری (بشمول مڈل) سیکنڈری اور اعلیٰ تعلیم' تین درجے شامل ہیں ۱۹۶۴ء سے تعلیمی میدان میں سائنس کا محکمہ اعلیٰ بنا دیا گیا۔ اب مرکزی سطح پر ایک تعلیمی وزیر جس کے ماتحت دو نائب ہوتے ہیں۔ ان میں ایک آرٹس اور دوسرا سائنس کی تعلیم کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اسکولوں کی درجہ بندی اگرچہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ مگر اب بھی قائم ہے۔

۱۔ گرامر اسکول یا INDEPENDENT اسکولز

۲۔ ت اے ڈرم اسکولز

۳۔ لوکل اتھارٹی کے تحت قائم شدہ اسکولز

پہلی قسم کے وہ اسکولز ہیں جو کہ برطانیہ کے روایتی اور مخصوص قسم کے ذہن پیدا کرنے والے ادارے ہیں۔ یہ ادارے حکومت سے گرانٹ قبول نہیں کرتے۔ یہ ایسے تعلیمی ادارے ہیں جہاں صرف امراء کے بچے تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ یہاں تعلیم مہنگی مگر کوالٹی کی ہوتی ہے۔ داخلہ دولت اور لیاقت دونوں کی بنا پر ہوتا ہے۔ ایسے اسکول آج کل بھی اپنا تشخص قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اور وہ ایک خاص کلاس کے لوگ پیدا کرتے ہیں۔

دوسری قسم کے پبلک اسکول وہ ہیں جہاں حکومت کی گرانٹس بھی ملتی ہیں اور
وقوں کے قائم کردہ ٹرسٹ بھی پیسہ مہیا کرتے ہیں۔ ایسے اسکولوں میں حکومت کی
پالیسی کا عملاً دخل تو ہوتا ہے مگر کم۔ طلبا تقریباً ۷۵ x ۷۷ قابلیت کے لئے جاتے
ہیں۔ تعلیم کا سٹینڈرڈ پہلی طرح کے اسکولوں سے بہرحال کم ہوتا ہے۔

• تیسری قسم کے اسکول وہ ہیں جو دوسرے الفاظ میں سرکاری اسکول کہلاتے
ہیں۔ یہاں ہر طالب علم کو بغیر کسی قسم کی قابلیت یا اہلیت کے داخل ہونا پڑتا ہے
اور ۶ سال سے ۱۶ سال تک بغیر امتحان پاس کئے، عمر کے لحاظ سے وہ اعلیٰ درجے کے
اسکولوں میں ترقی پاتا رہتا ہے۔ پہلا پبلک امتحان ۱۶ سال کی عمر میں لے دینا
پڑتا ہے۔ عموماً ایسے اداروں میں ورکرز اور پار سمندر کی دوسری قوموں کے بچے
پڑھتے ہیں۔ ان کا مقدر کارخانوں میں مزدوروں یا دفتروں اور سٹورز میں چھوٹے
درجے کے کام کرنے سے وابستہ ہوتا ہے۔

سلیبس کے سلسلے میں برطانیہ میں پرائمری تعلیم پر مخصوص توجہ دی جاتی ہے
کھیل اور سیکھنے کے عمل کو کتابوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ O لیول یا A لیول بھی
(میٹرک اور انٹر) کے امتحان کے سلسلہ میں طالب علم کی اپنی لیاقت اور قابلیت
پر منحصر ہے۔ وہ کم سے کم مضامین بھی پڑھ سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ بھی۔
گریڈز A یا E ہوتے ہیں اور ان کی اہمیت بھی اسی طرح ہے۔

چونکہ پہلا پبلک امتحان ۱۶ سال کی عمر میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو پاس کرنا
اور یونیورسٹی میں داخلہ ملنے کا انحصار طالب علم کے حاصل کردہ گریڈز پر ہوتا ہے آجکل
COMPREHENSIVE اسکولز قائم کئے گئے ہیں جو کہ اصل میں اس طبقاتی
درجہ بندی کو ختم کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ جو کہ یہ تین قسم کے اسکول پیدا کرتے رہے
ہیں۔ دوسری اور تیسری قسم کے اسکولز کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ داخلہ کے سلسلے
میں تقریباً قاعدہ وہی ہے۔ جو ہمارے یہاں میڈیکل اور انجنیئرنگ کے کالجوں
میں داخلے کے لئے صوبائی حکومتوں نے قائم کر رکھا ہے۔ والدین تمام درخواستیں

لوکل انتظامیہ کے دفتر میں دیتے ہیں۔ وہ طلبا کو شہر کے مختلف اداروں میں اس طرح تقسیم کرتے ہیں کہ ہر ادارہ تقریباً MIXED قابلیت کے طلبا حاصل کرلیتا ہے۔

پہلی قسم کے ادارے بہرحال اب بھی اس سے مبرا ہیں۔

COMPREHENSIVE سسٹم میں طلبا کے لئے بہت سے مضامین کا CHOICE ہوتا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ نئی مہارت بھی حاصل کرتے رہتے ہیں اور ۱۶ سال کے بعد جب وہ ادارے سے بغیر کسی قسم کا امتحان پاس کئے بھی نکلتے ہیں تو وہ ملک کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے اپنی مرضی کے فن کے مضامین پڑھ کر ان ... میں دسترس حاصل کرلی ہوتی ہے۔

مذہبی تعلیم ہی ایک ایسا مضمون ہے جو کہ COMPULSORY لازمی ہے۔ مگر مذہب ہی کا نام وہاں موجود نہیں ہے۔

اقدار جو کہ سب کے لئے اور معاشرے کے لئے قابل قبول ہو، پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً امتحان میں نقل ایک جرم ہے۔ طلبا کا تعلیمی شیڈول مقرر ہوتا ہے، وہ کسی طور پر بھی DISTURB نہیں ہو سکتا۔ طلبا کو مشاہدے جستجو اور تحقیق کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم مخصوص ہے۔ اسے صرف وہی حاصل کر سکتے ہیں جو اس کے اہل ہیں۔

امتحانات کا طریقہ جو کہ ۱۶+ اور ۱۸+ کے امتحانات میں رائج ہے۔ اس میں تعلیمی بورڈ ہر اسکول میں اپنا نمائندہ بھیج کر امتحانات منعقد کرواتے ہیں۔ اور پرچوں کی پڑتال اس ادارے کے اساتذہ کرتے ہیں۔

گریڈز کے ساتھ ساتھ طالب علم کے کردار کے چند پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے۔

ہر ہائی اسکول تقریباً آٹھویں جماعت سے بارھویں جماعت تک ہوتا ہے۔ ان طلبا کے لئے جو تعلیمی عمل میں خلل پیدا کرتے ہیں سزائیں اس طرح موجود ہیں کہ پرنسپل

ود سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ لڑکے کو کلاس سے ہٹا کر اپنے دفتر میں بھی بٹھا دیتا ہے
یادہ ہونے کی صورت میں طالب علم کا کیس ڈائریکٹر کو بھیج دیا جاتا ہے۔ وہ طالب علم کو
دوسرے ادارے یا دوسرے شہر میں بھیج دیتا ہے۔ ثانوی طور پر والد کو بھی ڈائریکٹر
س سلسلے میں ملوث کر سکتا ہے۔

کسی زمانے میں انگلستان میں صرف دو یونیورسٹیاں تھیں یعنی آکسفورڈ اور
کیمبرج بعد میں صنعتی انقلاب کے تحت جوں جوں شہر بڑھے تو وہاں پہلے اسکول
قائم ہوئے جو کہ بعد میں بڑھتے بڑھتے یونیورسٹیاں بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں بعض
شہروں میں ایک سے زیادہ یونیورسٹیاں ہیں۔ مگر ان کی حیثیت ان کے قائم شدہ تعلیمی
معیار کے مطابق طے شدہ ہے۔

آجکل تقریباً ۵۰ الوکل اتھارٹیاں سرکاری اسکول چلا رہی ہیں۔ تعلیم کے عمل
کو نافذ بنانے کے لئے ہائی اسکول میں پرنسپل دو نائب رکھتا ہے۔ ایک انتظامی اور
ڈسپلن کے امور کا نگران اور دوسرا سلیبس اور ACADEMIC کا۔ ان کے تحت
ہیڈز آف ڈیپارٹمنٹ ہیں۔

پرنسپل مجموعی طور پر اسکول کی تمام کارکردگی کا ذمہ دار ہے ہر استاد اپنی جگہ
ہم اور ذمہ دار ہے۔ والدین تعلیمی عمل میں براہ راست ملوث ہوتے رہتے ہیں۔
گویا وہاں تعلیم ملک کے دفاع کی طرح ایک نہایت اہم شعبہ ہے۔

افتخار حسین نعیم پیرزادہ

امریکہ کا تعلیمی نظام

امریکہ جو دنیائے جدید کے عظیم ترین ممالک میں صفِ اول کا ملک اور مادی ترقی کے لحاظ سے دنیا میں ممتاز و منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ دو پونے دو سو سال قبل ایک ادنیٰ کالونی کی حیثیت سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ آج یہ عالم ہے کہ امریکہ کو چھینک آنے پر دنیا بھر کو زکام ہو جاتا ہے۔ کسی ملک کی عظمت و ترقی اس کے نظامِ تعلیم پہ منحصر ہوتی ہے۔ آیئے ہم امریکی نظامِ تعلیم پر ایک نظر ڈالیں۔

کسی بھی تعلیمی ڈھانچے میں استاد ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ امریکہ بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ امریکہ میں استاد کی ذمہ داری میں کمرۂ جماعت میں تعلیم دینے کے علاوہ عام رہنمائی، سٹاف میں کام کاج، معاشرتی ذمہ داریاں اور پیشہ ورانہ سرگرمیاں شامل ہیں۔ اس کی ذمہ داریوں کی حدود متعین نہیں ہیں۔ برعکس برصغیر کے ممالک میں تعلیمی اداروں کے جہاں استاد کا ایک بات بھی محدود اور متعین سلیبس سے ہٹ کر کہنا بسا اوقات ناقابلِ معافی گناہ بن جاتا ہے، امریکی استاد، تعلیم و تدریس کے پورے عمل کا معیار بذاتِ خود ہے۔

امریکی ریاستیں اساتذہ کے تربیتی اداروں کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اول ایسے کورسز جن کا تعلق تعلیم کے پس منظر سے ہوتا ہے۔ دوسرے وہ مواد جو اساتذہ نے پڑھانا ہوتا ہے اور تیسرے پیشہ ورانہ کورسز جو معلمی کے پیشے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ریاستوں میں ایسی انجمنیں بنائی گئی ہیں جو کہ اساتذہ کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ تدریس کے اعلیٰ معیار کے لئے بھی کوشاں رہتی ہیں۔ یہ انجمنیں مقامی اور ریاستی حکومتوں پر اپنا اثر و نفوذ استعمال کرتی ہیں

اساتذہ کا مقام و معیار بہت بلند ہے۔ حکومت اور معاشرت کی طرف سے اساتذہ کو ہر قسم کا تحفظ اور احترام میسر ہے۔ تنخواہوں کا معیار خاص طور پر اہم ہے۔ اسی لئے امریکہ میں یہ تصور موجود ہے کہ اگر اساتذہ کو از سر نو کسی ملازمت میں شامل ہونے کا چانس دیا جائے تو وہ یقیناً معلمی کے پیشے کو منتخب کریں گے۔ امریکہ کا استاد ایک منفرد شخصیت کا مالک اور منفرد فلسفے کا حامل ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی فلسفے اور شخصیت سے تعلیم کے مقاصد، مضامین کی افادیت، طریقۂ تدریس اور معاشرے سے تعلقات کا تعین کرتا ہے۔

امریکی نظام تعلیم میں تین طرح کے ادارے ہیں۔ لوکل پبلک اسکولز، سٹیٹ پبلک اسکولز اور نان پبلک اسکولز۔ لوکل پبلک اسکول ایسے ادارے ہیں جو کہ مختلف مقامات خصوصاً دیہی علاقوں میں تعلیم و تعلم کا کام انجام دے رہے ہیں۔ امریکہ میں اسکول ڈسٹرکٹ ہیں جن کے اندر لوکل پبلک اسکول کام کرتے ہیں۔ ان اسکولوں کی کارکردگی میں مقامی لوگوں کو کافی عمل دخل ہوتا ہے۔ ان میں تعلیمی تجربات اور نمونہ ہائے تعلیم کا تنوع ہے۔ مقامی معاشرے کے مفاد کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ تعلیمی بورڈز قائم ہیں۔ جن کے ذریعے مقامی رہنما ان اسکولوں پر اپنا عمل دخل استعمال کرتے ہیں۔ لیکن کوئی ایک ادارہ یا ایجنسی مکمل طور پر ان اسکولوں کی حکمت عملی وضع کرنے اور ان پر مکمل کنٹرول کا اختیار نہیں رکھتی۔ لوکل پبلک اسکول اسکیم امریکہ میں ہر دلعزیز ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ آئندہ سالوں میں یہ اسکیم امریکہ کی تمام

تعلیمی اسکیموں پر حاوی ہو جائے گی۔

دوسری طرز کے اسکول، سٹیٹ پبلک اسکولز ہیں۔ امریکی ریاستیں قانونی طور پر ایسے اسکولوں کی تنظیم و ترتیب کی اپنے اپنے علاقوں میں مجاز ہیں۔ ہر ریاست کی مقننہ اپنے لئے تعلیمی منصوبہ بندی کرتی ہے جس کی وجہ سے ریاستوں کی تعلیم متنوع ہے۔ ان اسکولوں کے اخراجات کا ۴۰ فیصد متعلقہ ریاست، چار فیصد وفاقی حکومت اور ۵۶ فیصد مقامی وسائل سے پورا کیا جاتا ہے۔

امریکہ میں تعلیم اگرچہ مقامیت سے متصف ہے۔ ریاست بھی تعلیم کے انتظام و انصرام کی ایک اکائی ہے۔ تاہم مرکز بھی تعلیم کے عمل میں اہم کردار ادا کرتا ہے وفاقی حکومت اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لئے فنڈز مہیا کرتی ہے اور ان شرائط کا تعین کرتی ہے جن کے تحت یہ فنڈز استعمال کئے جا سکتے ہیں ۔ مثلاً ضرورت مند طلباء کی امداد وغیرہ تاکہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ مگر ان اداروں کے پروگراموں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ وفاقی حکومت اسکولوں میں دوپہر کے کھانے کا انتظام بھی کرتی ہے۔ ۱۹۴۶ء سے ایک قانون کے ذریعے دوپہر کا کھانا، وفاقی حکومت کی طرف سے اسکولوں میں باقاعدہ طور پر دیا جاتا ہے۔ اس قانون کا مقصد قوم کے بچوں کی صحت و خوشحالی کا خیال رکھنے کے ساتھ زرعی پیداوار کا اندرونِ ملک استعمال ہے۔ اس قانون کے تحت وفاقی حکومت اپنے ریاستوں کے ذریعے اسکولوں کو فاضل اناج اور رقوم مہیا کرتی ہے تاکہ انہیں اسکولوں کے کھانے کے کمروں میں استعمال کیا جائے۔ اس وفاقی امداد سے پبلک اسکول اپنے طلباء کو نہایت معمولی قیمت پر دوپہر کا کھانا مہیا کرتے ہیں۔

اس طرح ۱۹۵۸ء میں قومی دفاع کا تعلیمی قانون پاس ہوا۔ اس کی رو سے وفاقی حکومت تمام اعلیٰ تعلیمی اداروں کو خواہ وہ پبلک ادارے ہوں یا غیر پبلک، قومی سلامتی کے کچھ پروگراموں کے ساتھ امداد مہیا کرتی ہے۔ یہ امداد طلباء کو قرض، وظائف اور دیگر مالی سہولیات کی صورت میں دی جاتی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں وفاقی حکومت نے

ریاستوں کو تقریباً سات کروڑ ڈالر طلباء کو قرض دینے کے لئے مہیا کئے۔
اس میں تعلیمی ضروریات کا سازوسامان خریدنے کے لئے تقریباً چار کروڑ ۳۰ لاکھ
ڈالر ریاستوں کو دیئے۔

امریکہ میں بہت سے تعلیمی ادارے ایسے ہیں جنھیں نان پبلک اسکولز کہتے ہیں۔
اسکولوں کے اس گروپ میں کئی قسم کے تعلیمی ادارے آتے ہیں جن کے اخراجات
پرائیویٹ فنڈز سے پورے کئے جاتے ہیں۔ ان کا کنٹرول پرائیویٹ رنگ یا نان پبلک
نہیں کرتی ہیں۔ اگرچہ ریاستوں کو قانونی طور پر نان پبلک اداروں پر اختیار حاصل
ہوتا ہے۔ مگر عملی طور پر ریاستیں شاذ ہی کبھی ایسے اختیارات استعمال کرتی ہیں۔ وہ
زیادہ سے زیادہ اساتذہ کے لئے ضروری قابلیت کے معاملات تک ہی محدود رہتی
ہیں۔

امریکی نظام تعلیم میں اسکولوں کی کئی اکائیاں ہیں جو نرسری اسکول، کنڈرگارٹن
ابتدائی اسکول، جونیئر ہائی اسکول، سینیئر ہائی اسکول، جونیئر کالج اور ریاست کی یونیورسٹی
پر مشتمل ہیں۔

نرسری اسکولوں کو اگرچہ امریکی ریاستوں کی مقننہ کی طرف سے قانونی حیثیت حاصل
نہیں ہوئی۔ مگر یہ امریکہ میں پبلک اور نان پبلک ہر دو حیثیات میں موجود ہیں اور بہت
ہر دلعزیز ہیں۔ ۱۹۳۹ء تک پندرہ سو ایسے اسکول تھے اور تقریباً تین لاکھ بچے ان میں زیر تعلیم
تھے۔ ۱۹۴۶ء میں وفاقی حکومت نے ان اداروں کی امداد ختم کر دی۔ وجہ یہ نہ تھی کہ ان
اسکولوں کی افادیت ختم ہو گئی ہے بلکہ روایتی طور پر تعلیم مقامی حکومت اور ریاستی
حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ نرسری اسکول کا مقصد یہ ہے کہ گھروں کی محدود تعلیمی فضا سے
بچے کو نرسری اسکول کے عظیم تر تعلیمی و معاشرتی ماحول میں لایا جائے۔ تین سے ۵ سال
کے بچے اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں۔ ایسے اسکول یونیورسٹیوں، چرچوں اور گھروں
میں پبلک اسکول سسٹم کے تحت چلائے جاتے ہیں۔ نرسری اسکولوں میں سازوسامان کا زیادہ
خیال رکھا جاتا ہے کھیل کے میدان اور ان کا سازوسامان خاص انداز کا ہوتا ہے یہاں

میں پینے کے پانی کے فوارے، نل، ٹائیلٹ، غسل خانے، کچن کا سامان، موسیقی کا ر
آرام کرنے کے لئے پلنگ وغیرہ شامل ہیں۔ اسکول میں ہر روز نرس معائنے کے لئے
آتی ہے۔ طبی معائنہ اور دانتوں کی دیکھ بھال کا خصوصی انتظام ہے۔ مزید یہ
نرسری اسکول میں باقاعدہ حاضری چنداں ضروری نہیں۔

تمام بڑے شہروں میں کنڈرگارٹن اسکول موجود ہیں۔ ان میں حاضری نہ
ہے۔ ان میں ۵۰ فیصد بچے پانچ سال کی عمر کے ہوتے ہیں۔ باقی چار سے چھ سال
عمروں کے ہوتے ہیں۔

ابتدائی اسکول میں گریڈ چھ تک تعلیم دی جاتی ہے۔ ان اسکولوں میں عام تعلیم
انتظام ہوتا ہے۔ بعض میں زبان دانی اور معاشرتی علوم کا انتظام ہے۔ نصاب
کے لئے محض مشورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ استاد اس میں ترمیم اور اضافہ کا اختیار ر
ہے۔ وہ طلبا کی ضرورت کے پیش نظر تبدیلیاں کر لیتا ہے۔

جونیئر ہائی اسکول میں گریڈ سات، آٹھ اور نو میں بچے کو داخل کیا جاتا ہے۔
اس میں ۱۲، ۱۳ اور ۱۴ سال کی عمر کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یہاں
بچوں کو اپنی دلچسپی اور رجحان کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کی سہولیات مہیا کرتے ہیں
اساتذہ بچوں کی دلچسپیوں، رجحانات اور صلاحیتوں پر نظر رکھ کر ان کے مطابق بچوں کی
کرتے ہیں۔

سینئر ہائی اسکول میں بچوں کو گریڈ دس، گیارہ اور بارہ میں داخل کیا جاتا
اسکول کے بارہ سال مکمل کرنے کے بعد بچے کو ایک ڈپلومہ دیا جاتا ہے۔ ۱۴ سے ۱۸
کی عمر کے بچے ان میں تعلیم پاتے ہیں۔ یہاں بچہ ایسے مضامین منتخب کرتا ہے۔ جن
بدولت وہ آئندہ اپنے پسندیدہ عملی میدان میں داخل ہو سکے۔

امریکہ میں جونیئر کالج میں طلبا کو دو سال کی مزید تعلیم دی جاتی ہے۔
عام تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم ہوتی ہے۔ ان کالجوں میں ایسی مخصوص تعلیم دی جا
جس سے طلبا یونیورسٹی تعلیم کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ جونیئر کالجوں میں بالغوں کو

شام کی نشست میں تعلیم دی جاتی ہے ۔ ایسے طلبا جو کسی ہائی اسکول سے گریجوایشن کر چکے ہیں جونیئر کالجوں میں داخلے کے مجاز ہوتے ہیں ۔

ریاست کی یونیورسٹی میں چار سال کا بی اے تعلیم ہوتی ہے جس کے بعد طلبا کو بی اے کی گریجوایشن کے بعد تین یا زائد سالوں کی تعلیم اور ریسرچ مکمل کرنے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی جاتی ہے ۔ یونیورسٹی میں پڑھانے والے اساتذہ اعلیٰ تعلیم سے آراستہ، انتہائی تربیت یافتہ اور اپنے مخصوص میدان کے زبردست ماہر ہوتے ہیں ۔ تمام یونیورسٹیوں میں نشستوں کی خاصی بڑی تعداد ہے ۔ ۱۹۶۱/۶۲ میں کیلی فورنیا یونیورسٹی میں ۴۸۴۷۵ طلبا تھے ۔ اسی دوران نیویارک یونیورسٹی میں ۵۷۰۴۴ طلبا تھے ۔ بعض ریاستوں میں یونیورسٹیاں تعلیم پھیلانے کے لئے تحریری مواد تقسیم کرتی ہیں ۔ لائبریریاں مستعار دیتی ہیں، سیمینار کراتی ہیں ۔ لیکچرز کا انتظام کرتی ہیں اور کانفرنسیں منعقد کرتی ہیں ۔

سید منصور حسن

روس اور چین کا تعلیمی نظام

کسی ملک کا نظام تعلیم اس کے پیداواری رشتوں اور ثقافتی روایتوں سے جنم لیتا ہے۔ جب ملک میں کوئی بڑی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس کا اثر اداروں پر بھی پڑتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ تبدیلی محض خارجی سطح پر ہوئی ہے یا پورے سسٹم کے حوالے سے روس اور چین دو ایسے ملک ہیں۔ جہاں انقلاب نے پورے نظام کو تبدیل کیا ہے۔ اس لئے ان ملکوں کے نظام تعلیم میں بھی بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ انقلاب سے پہلے روس میں تعلیم محدود تھی۔ اور صرف طبقۂ امرا ہی کو اس کی سہولتیں حاصل تھیں۔ ادب و سائنس پر گفتگو بھی اسی طبقہ تک تھی۔ تعلیمی اداروں کی تعداد بھی برائے نام تھی۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے روس کو نئی نظریاتی بنیادیں عطا کیں۔ جن کا مقصد محنت کشوں کو ان کے حقوق دلانے کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت بھی تھی۔ سو انقلاب کے بعد روس کا نظام تعلیم نئے سرے سے استوار کیا گیا۔ حکومت نے ابتدائی تعلیم کے اخراجات اپنے ذمے لئے۔ بالغوں کے لئے کم از کم ثانوی درجہ تک تعلیم لازمی قرار دی اور اس

مقصد کے لئے سینما، ریڈیو اور ٹی وی کو بھی استعمال کیا گیا۔ اس تعلیمی فلسفہ کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ تعلیم کا مقصد محض لکھائی پڑھائی نہیں بلکہ عملی زندگی میں ایک تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ لینن نے کہا "ہم ایسی تعلیم و تربیت اور لکھائی پڑھائی کے قائل نہیں ہو سکتے جو صرف اسکولوں تک محدود ہو اور عملی زندگی سے بے تعلق ہو۔" اس فلسفہ کو عملی سطح پر رائج کرنے کے لئے حکومت کو مرکزی طور پر تعلیم کا نظام اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ نصاب اور طریقۂ تدریس کا تعین کرنے کے لئے مرکزی ادارہ قائم کیا گیا۔ اسکولوں کا قیام، منظوری اور تعلیمی مقاصد پر عمل بھی اسی ادارے کی ذمہ داری ہے۔

روس میں تعلیم کا آغاز تین سال کی عمر سے ہوتا ہے اور سات سال تک جاری رہتا ہے۔ لازمی ابتدائی تعلیم آٹھویں سال سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں مضمون کی مضمون وار تدریس نہیں ہوتی بلکہ مختلف موضوعات کے مسائل کو اکٹھا کر کے آہستہ آہستہ بچے کو ان کی اہمیت سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ ثانوی تعلیم کے لئے تین سال کی مزید ضرورت پڑتی ہے۔ یہ تعلیم عملی فنون پر مشتمل ہوتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ فنی ادارے بہت بڑی تعداد میں قائم کئے گئے ہیں۔ ان میں تعلیم کا عرصہ چار سے چھ سال ہے۔

انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے تعلیم بالغاں کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ہر علاقہ کی پارٹی کے ذمہ اپنے علاقہ کے لوگوں کی تعلیمی استعداد بڑھانا بھی شامل ہے۔ تاکہ نظریے کی سطح پر لوگ اپنے مسائل سے آگاہ ہو سکیں اور اس کی اہمیت کو سمجھیں۔ روس میں ریسرچ کے کام کے لئے عمدہ انتظامات کئے گئے ہیں۔ اس میں زبانوں کے شعبے بھی قائم ہیں۔ ماسکو کی لومبا یونیورسٹی میں دنیا بھر کی زبانوں پر تحقیقاتی مقالے لکھے جاتے ہیں۔

چین میں انقلاب سے پہلے ہی تعلیم کا وسیع میدان موجود تھا۔ چین کی تعلیمی تاریخ طویل عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن انقلاب کے بعد نئے خطوط پر اس کی بنیاد رکھی گئی

مگر اس کا بنیادی خاکہ روسی نظام تعلیم ہی سے اخذ کیا گیا۔ چین کے نظام تعلیم میں دو بنیادی اصول وضع کئے گئے۔

۱۔ بچوں کے ذہن میں نظریاتی وابستگی کا احساس پیدا کرنا۔

۲۔ فنی ماہرین تیار کرنا تاکہ اقتصادی ترقی نمایاں ہو۔

انقلاب سے پہلے بھی چین میں یونیورسٹیاں اور کالج موجود تھے۔ مگر ان میں سے اکثر کو غیر ملکی افراد چلاتے تھے۔ انقلاب کے بعد ان کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا اور بے شمار نئے تعلیمی ادارے کھولے گئے۔ مثلاً ماہرین کی یونیورسٹیاں، شارٹ کورس اسکول اور موسم سرما کے اسکول، ان اداروں میں زیادہ تر مزدور اور کسان تعلیم حاصل کرتے ہیں یہ ادارے کسی حد تک بالغوں کے تعلیمی ادارے بھی ہیں علاقائی پارٹی کا بیورو بھی اپنے اپنے علاقہ میں تعلیمی اجلاس منعقد کرتا ہے۔ ان اجلاسوں کا مقصد خواندگی کی شرح کو بڑھانا ہے چین میں یہ تحریک اس قدر منظم طور پر چلائی گئی کہ ۱۹۶۰ء تک چین کے تمام لوگ خواندگی کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ خواندگی کا معیار چین میں الفاظ یاد کرنے کی رفتار اور تعداد پر ہے۔ ابتدائی اسکولوں کے طلباء کے لئے چار ہزار، شہریوں کے لئے دو ہزار اور دیہاتیوں کے لئے بارہ سو الفاظ یاد کرنا ضروری ہیں۔

چینی نظام تعلیم کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ تعلیم کے شعبہ میں تبدیلی کرنے سے قوم کے افکار کو بدلا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے اساتذہ کی عمدہ تربیت اور معیار کے علاوہ ان کی علمی استعداد کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ ماؤزے تنگ کا خیال ہے " سو آدمیوں کے ایک اسکول کو یقیناً اس وقت تک اچھی طرح نہیں چلایا جا سکتا۔ جب تک اس میں کئی افراد یا اس سے زیادہ افراد کی کوئی ایسی سرکردہ جماعت نہ ہو جس کی تشکیل مصنوعی انداز میں نہیں بلکہ حقیقی حالات کے مطابق کی گئی ہو اور جو انتہائی سرگرم، راست باز اور ہوشیار اساتذہ، دوسرے عملے اور طلباء پر مشتمل ہو" اس کا مطلب یہ ہے کہ چین میں ایک تعلیمی ادارے کی بنیادی ضروریات کو اولیت دی جاتی ہے۔ روس کی طرح چین میں بھی مرکزی تعلیمی وزارت قائم ہے۔ ابتداء میں

س کے پانچ شعبے تھے ۔

۱- ابتدائی تعلیم
۲- ثانوی تعلیم
۳- اعلیٰ تعلیم
۴- سماجی تعلیم
۵- نگران اعلیٰ

بعد میں اعلیٰ تعلیم کا شعبہ الگ کر دیا گیا ۔ شروع میں سارے اسکول اور کالج حکومت کے پاس تھے ۔ مگر آہستہ آہستہ ان کو مقامی آبادی اور صنعتی تنظیموں کے سپرد کر دیا گیا ۔ ملک کے تمام تعلیمی اداروں کو حکومت نوے فیصد رقم مہیا کرتی ہے ۔ مگر بعد میں خود کفیل اسکول وجود میں آئے ۔ جہاں بچے آدھے وقت پڑھتے اور آدھے وقت فارم یا کارخانوں میں کام کرتے ہیں ۔

ابتدائی تعلیم تین سے چھ سال تک جاری رہتی ہے ۔ سات سال سے گیارہ سال تک پرائمری تعلیم کا عرصہ ہے ۔ ۱۹۵۸ء میں ابتدائی تعلیمی اداروں کی تعداد چین میں ۱۴ لاکھ ۷۰ ہزار سے زیادہ تھی ۔

ثانوی تعلیم کا عرصہ چھ سال ہے اس کے دو درجے ہیں ۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے کئی ادارے موجود ہیں ۔ ان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے ۔

چین میں تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی تربیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ یونیورسٹی کی سطح تک کے طلبا نصابی تعلیم کے علاوہ عملی تربیت کے لئے کھیتوں یا کارخانوں میں کام کرتے ہیں ۔ فنی اداروں کے لئے بھی پیشہ ضروری ہے ۔ لیکن چین کے تعلیمی نظام کی اصل روح ایک عام آدمی کو ذہنی اور فکری سطح پر تعلیم یافتہ کرنا ہے ۔

غلام عباس

پاکستان کا تعلیمی نظام

تقسیم کے بعد تعلیمی نظام ہمیں انگریزوں سے ورثہ میں ملا۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ یہی نظام تعلیم رائج رہا۔ اس وقت تعلیمی اداروں کی صورت یہ تھی

۱۔ سرکاری تعلیمی ادارے

۲۔ بلدیاتی تعلیمی ادارے

۳۔ قومی انجمنوں کے تحت چلنے والے ادارے

۴۔ صنعتی اداروں میں کام کرنے والے ملازمین کے بچوں کے لیے تعلیمی ادارے

۵۔ عوام کے قائم کردہ نجی ادارے۔

۶۔ مشنری تعلیمی ادارے۔

تقسیم کے بعد چونکہ مسائل کی بھرمار تھی اس لئے تعلیم پر فوری توجہ نہ دی جاسکی۔ مگر قائداعظم کے ذہن میں تعلیمی نظام کی اصلاح کا بہت شدید احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں یوں اظہار کیا:۔

تعلیم اور صحیح قسم کی تعلیم کی اہمیت سب پر واضح ہے۔ ایک صدی
سے زائد عرصہ تک غیر ملکی تسلط کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ ہمارے لوگوں
کی تعلیم پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ اگر ہمیں حقیقی تیز رفتار اور نتیجہ خیز
ترقی کرنا ہے تو ہمیں تعلیم کے مسئلہ پر خصوصی توجہ دینی پڑے گی۔ تعلیمی
پالیسی اور پروگرام کو ایسے خطوط پر چلانا ہوگا جو ہمارے لوگوں کے مزاج
کے مطابق ہو۔ جو ہماری تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہو جو دنیا میں
ہونے والی وسیع ترقیوں اور جدید تقاضوں کے مطابق ہو۔

قائد اعظم کی تقریر سے تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات واضح ہیں۔ مگر موت
نے انہیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اس طرف توجہ دے سکتے۔ ان کے بعد سیاسی استحکام
کا فقدان رہا۔ البتہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں تعلیم کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے
اور اسلامیات لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ ۱۹۵۶ء
کے تحت بننے والی حکومت بھی زیادہ دیر نہ چل سکی۔ ۱۹۵۸ء میں مارشل لا نافذ
ہوگیا۔ ۱۹۶۲ء میں نیا آئین بنا تو تعلیم پر کماحقہ توجہ دی گئی۔ ۱۹۶۹ء میں پھر
نئی تعلیمی پالیسی بنائی گئی جس کے تحت تعلیمی نظام میں کئی تبدیلیاں لائی گئیں۔
۱۹۷۲ء میں پھر ایک تعلیمی پالیسی بنائی گئی جس کا بنیادی مقصد تعلیم کو قومیانا تھا۔
اب تک تین تعلیمی پالیسیاں بنائی گئی ہیں جن کے بنیادی مقاصد یہ تھے۔

نمبر ۱: پہلی تعلیمی پالیسی کا مقصد

نئے تعلیمی ادارے کھولنا۔ تعلیم کو با مقصد بنانا۔ اسلامی طریقۂ تعلیم اور اسلامی
تعلیم کی طرف توجہ دینا۔ گریجویٹ کورس کو دو کی بجائے تین سال پر مشتمل کرنا۔ امتحانات
کا طریقہ کار تبدیل کرنا، نصاب میں اصلاح وغیرہ۔

نمبر ۲: دوسری تعلیمی پالیسی کا مقصد قومی زبان میں تعلیم دینا، نئی یونیورسٹیاں
کھولنا، اساتذہ کی حالت بہتر بنانا، تعلیمی اداروں کو زیادہ سے زیادہ خود کفیل بنانا،
نصاب اور طریقہ امتحانات کی اصلاح وغیرہ۔

نمبر۳ : تیسری تعلیمی پالیسی کا مقصد

تیسری تعلیمی پالیسی کا بنیادی مقصد تعلیمی اداروں کو قومیانا تھا۔ باقی مقاصد ثانوی تھے۔ مثلاً میٹرک تک مفت لازمی تعلیم دینا۔ انگریزی کی جگہ ذریعہ تعلیم اردو بنانا۔ اساتذہ کے گریڈ بہتر بنانا۔ انہیں معاشرے میں اعلیٰ مقام دلانا تھا۔

پاکستان میں مختلف ادوار میں جو تعلیمی پالیسیاں تشکیل دی گئیں۔ سب ایک دوسرے کے تسلسل میں ہیں۔

۱۹۷۲ء میں سوائے مشنری اداروں کے باقی تمام اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ ۱۹۷۹ء سے تمام تعلیمی اداروں میں اردو ذریعہ تعلیم رائج کر دیا گیا۔

اس وقت پاکستان میں تعلیمی نظم و نسق صوبائی حکومتوں کے ذمہ ہے۔ مرکزی وزارتِ تعلیم ان کو مجموعی طور پر کنٹرول کرتی ہے البتہ مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں اور کنٹونمنٹ علاقوں میں تعلیمی ادارے مرکز کے بلاواسطہ زیر انتظام ہیں اور اسلام آباد میں ایک فیڈرل بورڈ بھی مرکز کے ماتحت قائم ہے اور انٹرمیڈیٹ تک امتحان لیتا ہے۔

پاکستان میں اگرچہ تعلیم کو بہتر بنانے کی بہت کوشش کی گئی ہے۔ مگر تاحال خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے۔ ابھی نظام تعلیم کو مزید بہتر بنانے اور قومی ضروریات کے مطابق بنانے کی ضرورت موجود ہے۔ قائداعظم بھی اس قسم کی تبدیلی کے خواہاں تھے۔

"پرانے طرز تعلیم اور طرز حکومت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اچھے پڑھے لکھے کلرک پیدا کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کلرک ذرا اونچے اٹھ گئے اور ایک بلند مقام پر فائز ہو گئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقصد اچھے کلرک حاصل کرنا ہی تھا۔"

قائداعظم کی یہ رائے اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ وہ پاکستان کے نظام تعلیم میں ایک بنیادی تبدیلی چاہتے تھے۔ لیکن یہ بنیادی تبدیلی فوری طور پر عمل میں

نہ لائی جا سکی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی استبدادی نظام پاکستان میں بھی
جاری رہا اور اس کے نتائج بھی کم و بیش وہی نکلے، جیسے برطانوی عہد میں نکلے
تھے۔ پاکستان کی تینوں تعلیمی پالیسیاں اس نظام کو بدلنے کے لئے بنائی گئیں۔
پاکستان کا موجودہ تعلیمی مسئلہ خواندگی کی شرح بڑھانا ہے۔ اس لئے
بالغوں کی تعلیم کے لئے کام ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کا مقصد بھی
یہی ہے۔ نصاب کو یکساں کرنے کے سلسلے میں بھی اقدامات کئے جا رہے ہیں۔
اسی طرح امتحانات کے معیار اور شیڈول میں بھی وحدت پیدا کرنے کی کوشش کی
گئی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

تعلیم بالعمل

تعلیم کسی مجلسی جماعت کی ایک ایسی پر مقصد کوشش کا نام ہے۔ جو وہ اپنے آپ کو برقرار رکھنے اور بہتر بنانے کے لئے کرتی ہے۔ یہ جماعت اپنے افراد کی تکمیل کے ذریعے سے پوری جماعت کی ترقی اور استقلال کی امید رکھتی ہے لیکن جماعت کے اجزا ممکانی تکمیل تک کس طرح پہنچتے ہیں؟ یقیناً سب کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنے سے نہیں۔ معاشرہ نوجوان کے اردگرد مختلف قسم کا تمدنی سامان بکھیر دیتا ہے۔ تعلیمی اور سیاسی اداروں سے مجلسی رسوم، اخلاقی پابندیوں، مذہبی عقائد، عظیم شخصیتوں، آرٹ، سائنس وغیرہ سے اسے گھیر لیتا ہے۔ ہر فرد اس تمدنی مواد میں سے صرف ان چیزوں سے خوراک حاصل کرتا ہے۔ جن کی ساخت اس کی ذہنی ساخت سے ملتی جلتی ہے۔ کیونکہ تمدنی اشیاء تمام کی تمام انفرادی یا ذہنی کوشش کا نتیجہ ہوتی ہیں اور جس دماغ نے انہیں بنایا ہے اس کا پرتو ان پر موجود ہوتا ہے۔ کوئی دماغ صرف اسی تمدنی شے سے نشوونما اور تکمیل حاصل کرسکتا ہے

سی ساخت اس کی ذہنی قوت سے تطابق کرتی ہے۔ تعلیم حقیقت میں ظاہری تدبیر کو ذاتی زندگی بخشتی ہے یعنی خاموش، معقولی قوت کو محرک ذاتی قوت میں تبدیل کرنا۔

تو کیا ہم اپنے مدرسوں کو جو بالکل ہی بے حرکت جگہیں ہیں۔ تعلیم گاہیں کہہ سکتے ہیں؟ اگر ہم اس کا جواب اثبات میں دیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہو گا کہ طریق تعلیم سے ہم بالکل بے خبر ہیں۔ ہر قسم کی سائنٹیفک تحقیق اور روزمرہ کے مشاہدات بغیر کسی شک کے ثابت کرتے ہیں۔ کہ تین سال سے چودہ سال کی عمر تک کے بچے رجحانات اوساطوار میں زیادہ تر عملی اور فعال ہوتے ہیں۔ وہ ہاتھوں کے ذریعے سے سوچتے ہیں اور عمل کرنے سے پڑھتے ہیں۔ ان میں انسانی نسل کی صدائے بازگشت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ذہنی کام دستی کام ہی سے نکلا ہے جو صرف تمام فنون ہی کی نہیں بلکہ سائنس کی بھی بنیاد ہے۔ ہمیشہ عملی دلچسپیوں ہی سے اچھی اصولی دلچسپیاں نکلی ہیں۔ پھر کوئی عجیب نہیں کہ بچوں میں ہمیشہ دستی کام کی طبعی تحریکات ہی غالب ہوتی ہیں۔ ان زندگی سے لبریز اور عمل سے بھرے ہوتے بچوں پر خاموش ومتین صورت کتابی کیڑے بچوں کو ترجیح دینا جو دوسروں کی عنایت سے تعلیم یافتہ بن رہے ہیں۔ جب انہیں عمل اور کوشش سے علم دریافت کرنا تھا۔ ان کے دماغوں کے اصلی تمدن کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔

ماہرین تعلیم جو بچوں سے انصاف کرنا چاہتے ہیں۔ اب یہ محسوس کر رہے ہیں لیکن ان میں سے اکثر اپنے خیالات کتابوں سے حاصل کرنے کے عادی ہیں جو ہمیشہ سحب یکھنا یہ بردے کا کام دیتی ہیں اور صرف نصف سچائیاں بتاتی ہیں۔

. ے ذ ی ، سوں میں دستی کام کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی بچے بیٹھنا چھوڑ . ‍ ون سے کام کرنے لگتے ہیں۔ ورکشاپ، سبزیوں کے باغ۔ باورچی خانے . . جہاں بچے کچھ کر سکیں۔ یقیناً کتابی مدرسے سے زیادہ مسرت خیز جگہ ہے

لیکن یہ صرف اسی وجہ سے اچھی درس گاہ نہیں ہوتی کہ سارا دستی کام بھی تعمیر دینے والا نہیں ہوتا۔ اگر یہ صرف ایک بے مقصد کھیل ہی ہے تو اس کی تعلیمی قدر زندگی کے شروع ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔

اگر یہ کل کی طرح کسی حاصل کردہ مشق کا بار بار دہرانا ہے جس میں مزید ذہنی حرکت کی ضرورت نہیں تو گویا اس کی تعلیمی قیمت ختم ہو گئی ہے۔ کاریگر نہیں بلکہ کاریگر بننے کا طریقہ تعلیم دیتا ہے۔ کسی روز افزوں مقصد کے لیے کام ہی دماغ ایسی خوراک حاصل کر سکتا ہے جس سے وہ نشوونما حاصل کرتا ہے یعنی دماغ دماغ ہی سے بڑھتا ہے۔ جس طرح اخلاقی نتیجے پر پہنچنے یا سائنس کے کسی مسئلے کے لئے دماغی حرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی ٹیکنیکل مشکل کو سلجھانے کے لئے بھی دماغی حرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر مدرسے کو صحیح طور سے تعلیم بالعمل اختیار کرنا ہے تو ضروری ہے کہ وہ ذہنی قوتوں کو صرف دستی کام ہی پر نہیں بلکہ دماغی کام پر بھی لگائے۔ جس طرح ایک عام کاریگرانہ مشق کوئی تعلیمی قیمت نہیں رکھتی۔ اسی طرح وہ علم جو بے حرکت خاموش بیٹھ کر حاصل کیا جائے۔ فضول ہوتا ہے اور اس سے دل و دماغ کی نشوونما اور تکمیل میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

ایک اچھا مدرسہ بچوں کے عملی رجحانات کے مطابق دستی کام کے خاصے مواقع ہی بہم نہیں پہنچاتا۔ بلکہ اسے یہ بھی دیکھنا ہے کہ جو تعلیم وہ دینا چاہتا ہے۔ وہ عملی ذہنی کوشش سے حاصل کی جائے۔

اس غالب عملی رنگ کے ساتھ ساتھ مدرسے کو کسی کاریگرانہ مشق اور خاموش علم کے حصول کے مواقع بھی بہم پہنچانے ہیں۔ صحیح مدرسہ اس نے صرف دستی کام ہی

کی جگہ نہیں بلکہ ذہنی کام اور کچھ حد تک میکینیکل کام کی بھی ہے۔

لیکن کیا تمام کام حتیٰ کہ ذہنی بھی تعلیم دینے والا ہوتا ہے؟ دنیا ایسے

[illegible] جہان دستکاروں اور قابلِ نفرت عالموں سے بھری پڑی ہے۔ جنہوں [illegible] ہاتھ اور دماغ کی قابلیت کام سے حاصل کی ہے۔ اس لئے ہم اس کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتے۔ صرف کام خواہ وہ دستی ہو یا ذہنی مدرسے [illegible] درس گاہ نہیں بنا سکتا۔ ہر کام تعلیم دینے والا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے یہ [illegible] کرنے دو اور پڑھنے دو کی بے ساختہ حرکات کے تعلیمی اظہار کے پرجوش [illegible] حامیوں کے لئے تکلیف دہ ہو۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ صرف وہی حرکت تعلیم دینے والی ہوتی ہے۔ جس کے سامنے کوئی مقصد ہوتا ہے۔ ساری تعلیمی حرکت کا مرکز کوئی مقصد ہونا چاہئے۔ جو حرکت محض کھیل ہو اور جس [illegible] مقصد اس کے اندر پوشیدہ ہو تعلیمی لحاظ سے کوئی حرکت نہیں۔ ذہنی [illegible] نشو ونما میں کھیل کا بھی حصہ ہے لیکن مدرسہ محض بچپن کے کھیل اور تعلیمی کام [illegible] حل بنتا ہے۔ عملی مدرسہ کی یہ سب سے بڑی صفت ہے کہ وہ مقصد کے مطابق امتحان اور تنقید کرنے کا موقع بہم پہنچائے۔ بچوں کو اپنے مقصد [illegible] کام کے امتحانات کرنے کا موقع ہونا چاہیئے۔ چونکہ عملی ٹیکنیکل [illegible] تنقید آسان اور واضح ہوتی ہے۔ اس لئے مدرسے میں تعلیم دینے [illegible] بہت [illegible] ہے۔ لیکن یہ اصول دیگر تمام حرکات کے [illegible]

[illegible]

گرچہ ہر [illegible] حرکت زیادہ مشق، زیادہ قابلیت اور [illegible] [illegible] زیادہ یقین پیدا کرنے میں مدد کرتی ہے۔ پھر بھی خود یہ چیزیں [illegible] تعلیمی قیمت نہیں رکھتیں۔ یہ ان مقاصد کے حاصل کرنے میں بھی استعمال کی جا سکتی ہیں۔ جن کے ساتھ تعلیم یافتہ آدمی کبھی اتفاق نہ کرے گا۔ تو مشق اور قابلیت، خواہ دستی ہو یا ذہنی صرف اسی وقت تعلیمی قیمت رکھتی ہے۔

جب یہ دائمی قدروں کی خدمت کرے۔ ان قدروں کا قبول ہر صحیح تعلیم کا

امتحان ہے جس کی تعریف یوں کی گئی ہے۔ تمدنی اشیاء کا پیدا کیا ہوا ۔
قدروں کا انفرادی منظم احساس ۔ اپنے آپ پر تنقید کرتا ہوا بچہ اپنی
ذات سے صرف یہی نہ پوچھے کہ کیا میں نے وہ سب کچھ کر لیا ہے جو کچھ
میں کرنے نکلا تھا اور کیا میرے دوستوں کا انتخاب صحیح تھا بلکہ اسے اپنے
آپ سے یہ بھی پوچھنا چاہیئے کہ میں نے یہ کیوں کیا ہے؟ کیا یہ کسی ذاتی خواہش
رجحان یا فائدہ کے لئے ہے یا کسی ایسے مقصد کے لئے جس کی کوئی مستقل
دائمی قیمت ہے۔ وہ اسی وقت تعلیم یافتہ آدمی کہلا سکتا ہے جب وہ اپنے
دوسرے سوال کا جواب اثبات میں پائے گا۔ صحیح عملی مدرسے کا تعلق دوسرے
ہی سوال سے ہے۔ چونکہ دائمی قدروں کا وعظ کرنا ہی کافی نہیں کہا جا سکتا
بلکہ ان کے لئے زندگی بسر کرنا اور تجربہ ضروری ہے۔ اس لئے اچھا مدرسہ
اپنے طالب علموں کے عمل کو دائمی مقاصد والی قدروں کی خدمت کے لئے
حاصل کرتا ہے۔ بچے وہاں اپنا عمل سماجی بہبود کے لئے کرتے ہیں۔ صحیح
تقسیم کار اور تعاون سے وہ مدرسہ اپنے مستقبل کی طرف ذمہ داری کا جذبہ
پیدا کرتا ہے جس کا فرد ایک حصہ ہے اور ایسی نزاکت احساس پیدا کرتا ہے
جو کسی عام فائدہ کے لئے اپنے جیسوں کے ساتھ کام کرنے سے حاصل
ہوتی ہے۔ وہ سماجی انانیت کے پیدا ہونے سے بھی بچاتا ہے۔ کیونکہ
یہ انفرادی خود غرضی سے بھی زیادہ خطرناک ہے ۔

ماہرین تعلیم صحیح مدرسے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں کینشٹینر
(KENSI° INSTEINER) کے الفاظ میں درسگاہوں کو انفرادی
خود غرضی کی جستجوؤں کی بجائے سماجی مقصدوں کے حصول کی جولانگاہیں
بنانا اور اصولی، ذہنی طرف داری کو عملی انسانی غیر طرف داری میں
تبدیل کرنا ہے۔ صرف علم حاصل کرنے کے مرکزوں کی بجائے علم کے صحیح
استعمال کے مرکز بنانا ہے ۔

ڈاکٹر ڈولف فیر

تعلیم کی نئی بنیاد

مدرسۂ عمل کی اصطلاح ۱۹۱۸ء میں بالکل نامعلوم تھی لیکن ۱۹۲۰ء سے عام ہو چکی ہے۔ ایسی قسمت بہت کم اصطلاحات کو نصیب ہوئی ہے۔ یہ ایک جھنڈے کی طرح ہے۔ اس کے حامی اور مخالف دونوں گروہ موجود ہیں۔ لیکن مخالفین کا گروہ زیادہ نہیں کیونکہ جس چیز کو سائنس، ترقی اور مستقبل کی تائید حاصل ہو۔ اس کی مخالفت کون کر سکتا ہے؟

سب سے پہلے جس نے یہ اصطلاح استعمال کی میرے دوست ایم پیری بوٹ (M. PIERRE BOVET) ہے۔ جے روسو انسٹیٹیوٹ (J. J. ROUSSEAU INSTITUTE) کے ڈائریکٹر اور جنیوا کی یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔ میں نے ۱۹۱۴ء میں اپنی ایک ابتدائی کتاب میں ایسے اسکولوں کا نام جرمنوں کی طرح "کام والا اسکول" رکھا تھا۔ لیکن مجھے احساس تھا کہ یہ نام ٹھیک نہیں۔

میں نے ۱۹۱۴ء میں لکھا تھا کہ کام والا اسکول، اصطلاح کچھ مبہم سی ہے کیونکہ یہ تمام ان اسکولوں پر حاوی نہیں جہاں کام کیا جاتا ہے۔ مثلاً پیشہ ورانہ

اسکول اور دستکاری سکھلانے والے اسکول۔ علاوہ بریں کاموں میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً مشینی کام اور تخلیقی کام۔ کام سے میری مراد تخلیقی کام ہے۔

صحیح کام ایک قسم کا بیساختہ اور عاقلانہ عمل ہوتا ہے جو خود بخود اندر سے باہر کو ظاہر ہوتا ہے۔ کام خواہ اپنی مرضی سے چنا ہوا نہ ہو اور خواہ کسی مجبوری ہی سے اختیار کیا گیا ہو۔ لیکن وہ اسی حد تک صحیح کام کہلانے کا مستحق ہے۔ جہاں تک اس میں ہم اپنی کوشش، دوربینی اور ہمت صرف کریں۔ جس نے بچپن ہی سے میرے عقیدے کے مطابق کام کرنے کی عادت ڈالی ہو، وہ اچھی طرح سمجھ لے گا کہ کس طرح کام کرنا ہے۔ خواہ وہ کام غیر دلچسپ ہی ہو۔ وہ ہمارے موجودہ مدرسوں کے زبانی جمع خرچ سے خوب بچاؤ کر سکے۔

ہمارا تعلق موجودہ اسکول، اس کے زبانی جمع خرچ، لفظی تعلیم، زندگی سے دوری اور بچے کی فطرت کی روح کو سمجھنے میں ناکامی کے ردِ عمل سے ہے۔ مدرسۂ عمل کا تعلق ذہنی ترقی سے بھی اسی قدر ہے جس قدر احساسات اور قوتِ عمل سے ہے۔ کیونکہ احساسات اور قوتِ عمل ہمارے چال چلن کا بہت بڑا حصہ ہیں۔ چال چلن کی تعریف ہم ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ یہ ان عادات کا مجموعہ ہوتا ہے جو بچے میں اپنے ماحول کے ردِ عمل سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ مذہبی، فلسفیانہ، سماجی اور اخلاقی مسائل کے سامنے انسان کا نقطۂ نظر خیالات کی نسبت عادات پر زیادہ انحصار رکھتا ہے۔ انسان کے لئے زندگی میں سوچ بچار کرنا ضروری ہے۔ اگر زندگی بغیر غور و فکر کے بے سود ہے تو غور و فکر بغیر زندگی کے معنی ہی کچھ نہیں رکھتا۔ مدرسۂ عمل وسائل کو انجام کے ماتحت سمجھتا ہے۔ آرٹ کو آرٹ کے لئے، کلچر کو کلچر کے لئے اور ورزش کو ورزش کی خاطر نہیں اختیار کرتا۔ یہ دل و دماغ کی قوتوں میں توسیع کرنا چاہتا ہے اور زندگی کی تمام دوسری قدروں کو اس سے نیچے سمجھتا ہے۔ مدرسۂ عمل کے لئے اقتصادی کاروبار دماغی مشاغل سے بلند درجہ

نہیں رکھتے۔ عقل کو ارادے کا غلام نہیں بنایا جاتا اور اگر تنظیم دیئے ہوئے اور مرتب اور بچار سے کئے ہوئے مشاغل کو سب سے اونچا درجہ دیا جائے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ بہترین کام بھی سوچ اور بچار ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ عقل کو کبھی ارادے کا حکم نہ ماننا چاہیئے۔ جب کہ ارادہ دماغ کے تحت صحیح راستہ پر نہ ہو۔
بے ساختہ، انفرادی اور تخلیقی عمل۔ یہ ہے مدرسہ عمل کا مطمح نظر۔ یہ کوئی نیا مطمح نظر نہیں۔ یہ مان ٹین (MON TAIGNE) لاک (LOCKE) روسو (ROUSSEAU) پسٹالوزی (PESTALOZZI) فخٹے (FICHTE) اور فروبل (FRIEBLE) کا مطمح نظر ہے اور ان کے تعلیمی نظام میں مرکزی درجہ رکھتا ہے۔ غرض تمام گذشتہ استادوں کا یہی مطمح نظر ہے۔ وہ لوگ پیش رو تھے۔ مگر ان میں ایک کمزوری تھی۔ انہوں نے بچپن کو سمجھ تو لیا۔ لیکن اسے ہمارے زمانے کے سائنٹیفک طریقہ پہ نہ جان سکے۔ تجرباتی نفسیات سے پہلے ہم صرف پیش گوئی کر سکتے تھے۔ آج کل ہم جانتے ہیں اور آئندہ اس سے بھی زیادہ جانتے ہوں گے۔ آج کل ہم کیا جانتے ہیں؟ یہ کہ بچہ اپنے فطری قوانین کے مطابق ایک پودے کی طرح بڑھتا ہے اور صرف اسی چیز کا مالک ہوتا ہے۔ جو وہ خود حاصل کرتا ہے۔ اگر چند دوائیں رگڑ کر ایک درخت کے تنے پر مل دیں تو کیا اسے کوئی فائدہ پہنچے گا۔ یقیناً نہیں بلکہ نقصان ہوگا۔ اگر درخت کی پھوٹتی ہوئی شاخیں یہ جمایا ہوا خول توڑ کر باہر نہ نکل سکیں تو درخت سوکھ جائے گا۔

ہمارے روایتی مدرسے اسی قسم کا عمل بچوں پر کر دیتے ہیں۔ ہمارے مدرسے کو یہ جاننا چاہیئے کہ کھاد درخت کی جڑوں میں ڈالنی چاہیئے تاکہ وہ اس کے ریشوں میں جا سکے اور درخت اچھی طرح پھل پھول سکے۔

بچے کی نفسیات کا مطالعہ ہم نے کر لیا ہے اور اس کی نشو و نما کے قوانین بھی ہم نے معلوم کر لئے ہیں۔ اس لئے ہمارے پاس ہمارے گذشتہ عالموں سے زیادہ علم ہے۔ جو غیر محسوس اور نامعلوم تھا وہ اب محسوس اور معلوم ہو چکا ہے۔

اب مدرسۂ عمل کی ایک اور خصوصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ کوئی مقصد حاصل کرنے کے لئے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں تک انسان کے جسم یا دماغ کا تعلق ہے یہ وسائل عادت یا بار بار کرنے سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ ہمارا دماغ آزاد نہیں اور کسی مشکل کام کے لئے تیار نہیں اور جب تک پہلے راسخ شدہ نقوش مٹائے نہ جائیں کسی نئے پُرپیچ عمل کے قابل نہیں۔

تو کیا پھر یہ ہمیشہ ضروری ہوتا ہے کہ فرد ایک زندہ قوت سے مشینی قوت کے درجہ میں چلا جائے اور دماغ ایک بے کار سی شے ہو کر رہ جائے؟ نہیں اور یقیناً نہیں۔ مشینی طاقت کے پاس کام کرنے کی تمام چیزیں ہوں گی۔ لیکن اس کا انجام نہیں ہوگا۔ مشینی طاقت اس وقت ایک با مقصد طاقت ہوگی۔ جب وہ کسی تخلیقی قوت کے تحت کام کر رہی ہوگی اور یہ تخلیقی قوت اس وقت نشو و نما نہیں پا سکتی جب تک تعلیم ہمارے میدان عمل کو وسیع سے وسیع تر بنانے کا موقع نہ دے۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ قائم رہے۔

بچوں کے علم نفسیات کا یہ ایک تازہ کارنامہ ہے اور اس کے نتائج بہت دور رس ہیں۔ یہ معلوم کر لیا گیا ہے کہ بچہ زندگی کے آغاز سے بلوغت تک بہت سی منازل سے گزرتا ہے جو بنیادی طور پر ہمیشہ یکساں ہوتی ہیں اور جہاں تک وہ قدرت کے قائم کئے ہوئے راستہ پر چلتا ہے وہ تکمیل کے انتہائی درجے تک پہنچ سکتا ہے۔ جس قدر اس کے لئے ممکن ہو اصل میں منازل کا نقطہ صحیح نہیں کیونکہ یہ علیحدہ علیحدہ اور غیر مسلسل نہیں ہوتیں بلکہ ایک ہی زندگی کی لہر ان میں جاری و ساری ملتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ساری زندگی ایک مسلسل طاقت ہے۔ جس کا دباؤ اور زور کسی سمت کم ہوتا ہے اور کسی سمت زیادہ لیکن جو کبھی بے حس نہیں ہوتی۔

زندگی کی اس قوت کو سمجھنا، اس کا مقصد ڈھونڈنا اور اس کے وسائل تلاش کرنا انسان کا کام ہے اور ہمارے دماغ کا سب سے بڑا فرض ہے اسی میں فلسفہ اور مذہب ہے۔ انسان [illegible] سائنٹفک کام کرے۔ [illegible] کام [illegible] زندگی کے پیش کردہ

ر سے بھاگ نہیں سکتا اور یہی وجہ ہے کہ تعلیم اگر اپنے مقاصد کو پورا کرنا چاہتی ہے
ہوتی ہے تو وہ اپنے استعمال کردہ وسائل میں حیاتیات کی حیثیت سے بدن اور دل
دماغ کی زندگی کا علم۔

تو پھر یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ مدرسۂ عمل کیا ہے جس کی صحیح حدود ابھی
تک نہیں بتائی گئیں۔ میں یہ نہ بتاؤں گا کہ یہ کیا ہے اور میرے پاس اس کے لئے
نہ بہت اچھی وجہ ہے۔ عملی مدرسہ بچے کی فطرت کی بہترین صفات وسیع کرنا چاہتا
ہے۔ اس کے لئے اس کی پہلے سے قائم کردہ کوئی تعریف، کوئی پروگرام اور کوئی طریقہ
نہیں۔ یہ چیزیں ہمیں آہستہ آہستہ دستیاب ہوں گی۔ جو کچھ یہ کل تھا آج نہیں اور
جو آج ہے کل نہ ہوگا۔ اس میں ہر روز تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اسے نیچے ہی وجود
میں لا رہے ہیں۔ اسے کسی غیر لچکیلی چار دیواری میں محدود کر رہے ہیں اس کی روح کو مار
رہنا ہے۔ اس کے اصول زندہ اور متحرک ہیں، خاموش اور مردہ نہیں۔ اس میں نہ
تو بدنظمی ہے اور نہ سخت پابندیاں بلکہ یہ ایک زندہ نظام ہے جس میں بڑھنے
اور ترقی کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔

اس مدرسۂ عمل سے جو تاریخ میں پہلی دفعہ بچے سے انصاف کرتا ہے
یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے۔ بچہ کیا ہے؟

(۱) ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ بچہ ایک ایسا جاندار ہے جو ابھی کسی
... نہیں جو حسول اور ذہن میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ جو خود
... حاصل کئے ہیں بالکل مبہم ہیں اور اس کے ردعمل میں کوئی اشتراک
... نہ بچہ ایک نامکمل نوجوان ہے بلکہ یہ نشوونما کے ہر درجہ میں پوری
... اور جو طریقے نوجوان کے لئے صحیح ہوتے ہیں اس کے لئے غلط اور
... ہے یہ کسی ابتدائی انسان کی طرح غیر متمدن اور جاہل ہے جس
... بیا پوشیدہ ہے اور اپنے وقت پر جس کا ظہور ہوگا اگر بچے کا اعصاب
... اس کا جسمانی و اخلاقی سکون قائم رکھا جائے تو اس کی تمام قوتیں اور

۔ یہ کہ ٹھوس صداقتوں کو یاد رکھنے کی صلاحیت بچوں میں بہت زیادہ ہوتی ہے
شروع میں وہ ان خیالات کو نہیں سنبھال سکتے۔ کہیں تیرہ سال کی عمر میں قوتِ
بیل میں وسعت پیدا ہونی شروع ہوتی ہے اور تب چیزوں وغیرہ کے متعلق
...ے کی طاقت آتی ہے۔ ہمارے ہاں مدرسے چھوٹے بچوں کے دماغ میں الخ
...لائل اور لایعنی اصول جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہوں ٹھونسنے شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ
ہوتا ہے کہ ان کے دماغ پریشان اور ماؤف ہو جاتے ہیں ۔

گلبرٹ ہائیٹ

فنِ تدریس

فنِ تدریس پر کوئی کتاب لکھنا بڑا کام ہے۔ کیونکہ اس موضوع میں آئے دن تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں ایک ہی زمانہ میں پڑھانے کے مختلف طریقے رائج ہوتے ہیں۔ کسی ایک ملک کے طریقہ ہائے تدریس ہر نسل کے بعد یا تقریباً اتنے ہی زمانہ میں سماجی حالات اور نصب العین کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بدل جاتے ہیں۔ آج اگر ایک انسان تعلیم کو باعث امتیاز سمجھ کر بڑی محنت سے سرمایہ پس انداز کرتا ہے۔ تاکہ یونیورسٹی جا کر زیادہ سے زیادہ علم سے بہرہ ور ہو سکے تو عین ممکن ہے کہ تیس سال بعد اس کا بیٹا تعلیم کو حقیر نظروں سے دیکھے۔ اسکول جانے سے پرہیز کرے۔ کالج میں اپنا وقت ضائع کرے اور اپنے بچوں کو کتابوں سے نفرت دلائے۔ اسی طرح مزید ۳۰ سال گذر جانے کے بعد یہ چیز بعید از قیاس نہیں کہ ایک بگڑے باپ کے بچے پھر بڑے شوق سے تعلیم کی طرف رجوع کریں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی اس تعلیمی رغبت کا آغاز بہت ہی والہانہ ہو یا مروجہ تعلیمی عقیدے سے بے نیاز ہو۔

شاید وہ اپنی عزیز عمر کا خاصا حصہ گزرنے پر علم کی طرف رجوع کریں یا کسی تعلیمی ادارے کا منہ بھی نہ دیکھیں۔ لیکن پھر بھی ان میں وہ صحیح علمی ذوق موجود ہو جو ایک طالب علم کے جوہر میں پایا جاتا ہے۔ اب ان میں سے ہر نسل کے لئے جیسا زمانہ ہے ایک مختلف قسم کے طریقۂ تدریس کی ضرورت ہے۔

مزید برآں دنیا میں سیکھنے سکھانے کی چیزیں بھی تو ہزار طرح کی ہیں۔ اتنی کہ آپ بجا طور پر یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آیا انہیں کسی ایک رشتہ میں منسلک بھی کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر اندازہ لگایئے کہ ایک ماں کے اپنے بچے کو بولنا سکھانے ایک اسکول کے مدرس کے کسی لڑکے کو تاریخ پڑھانے، ایک مکّا باز کے کسی شاگرد کو حریف کے مغالطہ میں ڈالنے کے لئے دھوکے کا داؤ بتانے اور ایک ٹھیکہ دار مزدور کے اپنے مزدوروں کو سڑک بنانے کی تعلیم دینے میں قدرِ مشترک کیا ہے! پھر ایک ہی ملک کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں معمولی جمع تفریق سے لے کر اعلیٰ طبیعات اور رقص و سرود سے لے کر دماغی جراحی تک کی اس درجہ مختلف النوع چیزیں سکھائی جاتی ہیں۔ کہ انسان ان کے تصور سے حیران رہ جاتا ہے پھر غور کیجئے کہ دنیا بھر کے بے شمار اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں کتنے ان گنت مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ آج مثلاً ایک لڑکا قرآن مجید حفظ کر رہا ہے۔ دوسرا کمپیوٹر پر کام کر رہا ہے اور تیسرا وائلن بجانے میں خصوصی مہارت حاصل کر رہا ہے۔ دوسری طرف ایک کھلاڑی تیرنے کی مشق کر رہا ہے اور ایک اور طالب علم کسی ایسے کتابچے کا مطالعہ کر رہا ہے جو زمین دوز لڑائیوں کی تباہ کاریوں سے متعلق ہے۔ اسی دور میں ایک لڑکی کو بیس بُننا سکھایا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں ایک لڑکی مہاتما گاندھی کی تعلیمات ازبر کر رہی ہے اور جاپان کی ایک لڑکی مختلف طرح سے پھولوں کو سجانے کے علامتی مفہوم سیکھنے میں مشغول ہے۔

یہ تمام اور اس طرح کے ہزاروں اور مضامین کی تدریس اسکولوں میں ہوتی ہے مگر اس سے قطع نظر اسکولوں کی چار دیواری کے باہر بھی بہت کچھ سیکھا سکھایا جاتا

ہے۔ کچھ چیزیں ۔۔ اور بلاشبہ اہم ترین چیزیں ۔۔۔ والدین اپنے بچوں کو سکھاتے ہیں۔ اس قسم کی تعلیم اس وقت سے شروع ہو جاتی ہے۔ جب ایک بچہ چاقو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے اور ماں اسے اٹھا کر کسی ایسی جگہ جہاں اس کا ہاتھ نہ پہنچ سکے رکھ دیتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے اس وقت سے بھی شروع ہوتی ہے جب بچہ پہلی بار غول غاں کرتا ہے اور ماں اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں اسے داب دیتی ہے۔ انہیں ایام میں، بچہ صحیح معنوں میں نہ کچھ دیکھ سکتا ہے نہ سن پاتا ہے اسے اپنے اور دنیا کے متعلق تھوڑا بہت احساس ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنی خواہشات کا کسی نہ کسی طرح اظہار کرتا ہے اور جواب پاتا ہے۔ وہ اپنی قوت ارادی کو شدت سے عمل میں لاتا ہے اور خواہ اس میں اسے کامیابی ہو یا ناکامی محرومی ہو یا جیت وہ ہر لحظہ اور ہر حال میں تحمل، خوف، محبت، خوشی اور تندخوئی کے سبق سیکھتا رہتا ہے۔ یوں گویا اس کی ذہنی تعمیر کا آغاز ہوتا ہے۔

اس قسم کی تعلیم بظاہر کوئی تعلیم نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن یہ اندر ہی اندر بچے کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتی ہے۔ ہم سب اس کا تجربہ کر چکے ہیں اور اسے بھول بھی گئے ہیں۔ بایں ہمہ اس کی اہمیت مسلم ہے۔ چونکہ اس کے اثرات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک بچے کے لئے چھری سے اپنا ہاتھ کاٹ لینا یا کھولتے ہوئے پانی کی کیتلی سے اپنا پیر جلا لینا کتنا آسان ہے۔ لیکن ایسے داغ چالیس پچاس سال کے بعد بھی نہیں مٹتے۔ دنیا کے بہت سے بد دماغ اور بگڑے ہوئے انسان درحقیقت ان لاپروا والدین کے بنائے ہوتے ہیں جنہوں نے گو انہیں آگ اور چھری کی زد سے بچا لیا۔ مگر ان کی پوری شخصیتیں ہمیشہ کے لئے داغدار کر دیں:

ماں باپ کی تعلیم کا سلسلہ ۔ ۔ ۔ ۔ بچوں کی اسکول کی تعلیم کے دوران میں بلکہ اسکول سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے کے برسوں بعد تک جاری رہتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ والدین شعوری طور پر چاہیں یا نہ چاہیں بچے ان سے کچھ نہ کچھ برابر

سیکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ باپ جو روزانہ شام کو اپنے بیٹے سے سوائے خدا حافظ کے
اور کچھ نہیں کہتا۔ مگر گھر سے نکل کر قریب کے شراب خانے میں جا بیٹھتا ہے
وہ حاشبہ بیٹے کو شراب نوشی کی تعلیم اسی طرح دے رہا ہے۔ جیسے وہ ہر شے کر
کے سر پر مسلط ہو جائے اور زبردستی کہے کہ چل شراب پی۔ دراصل یہ درس
و تدریس ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ وضاحت و تفصیل میں
ان جایا جائے۔ یہ اشاروں اور کنایوں میں بھی ہو سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے۔ کہ
باپ کی نیت یہ نہ ہو کہ اس کا بیٹا مے خواری اور ذمہ داریوں سے بے توجہی
کا شکار ہو اور بیٹا بھی حسن اتفاق سے برنارڈ شا اور جوائس کی طرح ریاضت پسند
اور طویل مضمونوں اور مشکل و پیچیدہ کاموں کا رسیا نکلے۔ مگر باپ نے اپنی طرف
سے بیٹے کو خواہ اسے اچھائی کہہ لیجئے یا برائی شراب نوشی سکھانے میں کوئی کسر نہ
اٹھا رکھی۔ اسی طرح اکثر باپ یا نوجوان پنے میں ایسا کرتے ہیں یا اس کی پرواہ
نہیں کرتے کہ ان کی غلط تربیت کا اولاد پر کیا اثر ہو گا۔ غرض یہ ناممکن ہے کہ
بچے ہوں اور والدین سے کچھ نہ سیکھیں۔ آپ انہیں ماریں، ان کی ناز برداری
کریں۔ انہیں نظر انداز کریں، انہیں زبردستی کھلائیں پلائیں، ان سے احتراز
کریں یا ان کے پیچھے خود کو گھلا ڈالیں، ان سے محبت کریں یا نفرت ان تمام حالتوں
میں آپ ہر وقت کچھ نہ کچھ سکھاتے ضرور رہتے ہیں۔

تدریس کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ یہ والدین یا پیشہ ور معلمین ہی تک
محدود نہیں رہتی۔ تجارت و صنعت میں بھی کچھ نہ کچھ سیکھنے اور سکھانے کی ضرورت
پیش آتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں جہاں مبتدی اور تجربہ کار
ورکہنہ مشق بوڑھے اور الہڑ نوجوان ہوں گے وہ کسی نہ کسی نوعیت کی درس و
تدریس کا پایا جانا لابدی ہے۔ اسی بنا پر یہ کہنا غلط نہیں کہ ہم سب بیک وقت
شاگرد بھی ہیں اور استاد بھی۔ دور کیوں جایئے آپ ایک فرد کی حیثیت سے
خود اپنی زندگی کا اگر جائزہ لیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ عمر کا بیشتر حصہ

ــــــ سے ٹیچر فرائض کے نذر ہوتا ہے۔ کچھ تفریح و تفنن میں گزرتا ہے اور باقی ماندہ کچھ سیکھنے یا دوسروں کو سکھانے میں صرف ہوتا ہے۔ آپ خواہ ایک ڈاکٹر ہیں اور بعض مخصوص امراض کے متعلق اپنی معلومات کو وسیع سے وسیع تر کر رہے ہیں یا گھر کی مالکہ یا امورِ خانہ داری کو بہتر زیادہ بہتر و منظم صورت دینے کے لئے نئی نئی تدبیریں سوچا کرتی ہیں۔ چاہے آپ کسی ٹریڈ یونین کے افسر ہوں جو معاشیاتی مسائل کو سمجھنے کی سعی کرتا رہتا ہے یا ایک ادنیٰ ٹائپسٹ جو اپنی قلیل آمدنی میں گزر بسر کرنا سیکھتا ہے۔ خواہ آپ ایک نوجوان شوہر ہیں جو اپنی شریکِ حیات کی دلداری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا ہے، بس کے ڈرائیور ہیں جو کسی نئے راستے کو عبور کرنے میں کچھ عجیب سا محسوس کرتا ہے یا ایک مصنف جو کسی کتاب کی تصنیف میں منہمک رہتا ہے۔ غرض ہر حیثیت سے آپ خود کچھ سیکھ اور دوسروں کو سیکھا رہے ہیں۔ اکثر حضرات یہ محسوس نہیں کرتے کہ ان کی نجی زندگی کا کتنا بڑا حصہ شوقیہ تدریس اور بہت سی اتفاقیہ باتوں کی آموزش میں گزر جاتا ہے اور معدودے چند یہ سمجھتے ہیں کہ ہم میں بیشتر انسان اپنی سماجی زندگی میں یا تو مسلسل کچھ سیکھتے یا سکھاتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر جانسن نے ایک مرتبہ اپنے مخصوص جوشیلے انداز میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ایک عورت کی پند و نصیحت ایسی ہی غیر فطری چیز ہے جیسے کتے کا اپنے پچھلے پیروں پر چلنا۔ پھر اس خیال کی مزید صراحت کرتے ہوئے کہا کہ عورت یہ خدمت خوش اسلوبی سے انجام نہیں دے سکتی۔ البتہ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ پند و نصائح کر ہی کیسے لیتی ہے؟ موصوف کا یہ قول اُن لوگوں پر صادق آتا ہے جو پڑھنے اور پڑھانے میں بے ڈھنگے ہیں۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہ بے وقوف ہوتے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ ان چیزوں کے بارے میں سنجیدگی سے غور نہیں کرتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یہ کام خوش اسلوبی سے انجام نہیں دیتے پھر بھی ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیئے کہ بُرا یا بھلا کسی نہ کسی طرح

ے اسے کم نور دیتے ہیں۔ پیشہ ور اساتذہ اپنی تعداد اور نوعیت ہر اعتبار سے مختلف زمانوں اور علاقوں میں مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ دنیا کے بعض حصوں میں تو وہ اتنے بھی دستیاب نہیں ہوتے کہ آپ ایک اسکول کھول سکیں۔ اس کے برعکس بعض دوسرے ممالک میں ہر گاؤں میں ایک لائق استاد مل جاتا ہے۔ بعض زمانوں میں اچھے معلم ہر جگہ پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور اس کے برعکس بعض اوقات خوف سے جان اور نفرت انگیز، اساتذہ سست اور جاہل اور طلبا بے توجہی کا شکار ہو کر بے ہودہ اور بد اخلاق نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ عطائی قسم کے اساتذہ (اگر مجھے ان حضرات کو یہ کہنے کی اجازت ہو تو) اس سے بھی زیادہ مختلف ہوتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ خوش مزاج اور دلکش قسم کے والدین کی اولاد افسردہ یا بدمزاج ہوتی ہے۔ نہ جانے کتنے کارخانے ایسے ہیں جن میں کام کی رفتار ان کی اصلی استطاعت سے نصف صرف اس لئے رہ جاتی ہے کہ کاریگروں کے نگران نہ تو ان سے کام کسی منصوبے کے تحت لیتے ہیں نہ ہی ان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ انہیں سمجھا سکیں کہ کام کس طرح کرنا چاہئے اور کتنے ہی فنون لطیفہ، سیاست یا مذہب سے دلچسپی رکھنے والے اشخاص ہیں جو ان علوم سے متعلق کسی بڑی تصنیف کو پڑھنا شروع کرتے ہیں اور بیچ میں ہی دل برداشتہ ہو کر محض اس لئے چھوڑ دیتے ہیں کہ مصنف نے خیالات کی صحیح ترجمانی نہ کر سکا۔ مختصر یہ کہ بری تدریس طالب علم کی محنت ... رائیگاں کرتی اور بہت سی ایسی زندگیوں کو تباہ کر دیتی ہے جو آئندہ ... سے سرسبز ہو سکتی تھیں۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

تعلیمی نفسیات

ہر شخص اپنی زندگی کے ہر دور میں طرح طرح کے افراد، اشیاء اور واقعات سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں اسے ہر قسم کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ مشاہدے کرتا ہے، سوچتا ہے، ارادے قائم کرتا ہے، ارادے باندھتا ہے، عمل کرتا ہے۔ تمام زندگی اسے مختلف قسم کے تاثرات وغیرہ ہوتے رہتے ہیں۔ ان تجربات و تاثرات سے اس کی ذہنی و جسمانی نشوونما کو تقویت ملتی رہتی ہے۔ عمومی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو نشوونما کے انہی جذبات کا نام تعلیم ہے۔

تعلیمی نفسیات علم نفسیات کی ایک ایسی شاخ ہے جو تعلیم کے متعلق تمام عناصر کا نفسیاتی مطالعہ کرتی ہے۔ یہ علم ان تمام تغیرات کا ناقدانہ جائزہ لیتا ہے جو فرد کی نشوونما کے مختلف مدارج میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہ علم ان سب عناصر کا مطالعہ کرتا ہے جو انسان کی تعلیم کے عمل کو فروغ دیتے ہیں یا اس کے رستے میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ تعلیم سے متعلق حقائق و کوائف اکٹھا کرنے کے لئے ماہر تعلیمی نفسیات مشاہدوں اور تجربوں کی بنا پر وہ چند باضابطہ اصول اور قوانین تشکیل کرتا ہے۔ یہ

زمین اور اصول درس و تدریس اور فہم و تفہیم میں عملی طور پر بہت سود مند ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان اصولوں کو تعلیمی اداروں کے نظم و نسق میں اصلاح اور ترمیم کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

تعلیمی نفسیات تعلیم و تدریس کے میدان میں عمومی نفسیات کے اصولوں کا عملی اطلاق ہے۔ اس کا مطمح نظر یہ ہے کہ مدرسوں کے درس و تدریس، نظم و نسق اور طلبا کی ذہنی اور جسمانی صحت کے معاملوں پر نفسیات کی تحقیقوں اور مشاہدوں کا عملی اطلاق کیا جائے۔

تاہم اس امر کو ذہن میں رکھا جائے کہ تعلیمی نفسیات عمومی نفسیات کا محض عملی اطلاق ہی نہیں ہے۔ بلکہ بذاتِ خود ایک باضابطہ علم ہے۔ ایک علیحدہ، جامع اور خود مختار علم ہونے کی حیثیت سے تعلیمی نفسیات کی چند بنیادی خصوصیات درج ذیل ہیں:۔

الف: یہ علم تعلیم سے متعلق بنیادی حقائق اور اصولوں کا ایک مفید ضابطہ ہے۔

ب: تعلیمی نفسیات کی بنا ایسے حقائق اور عناصر پر رکھی گئی ہے۔ جن کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور جنہیں سائنسی طور پر پرکھا جا سکتا ہے

ج: مطالعہ، تجربہ اور تحقیق کے لئے اس علم کے اپنے مخصوص عملی اور منضبط طریقے موجود ہیں۔

تعلیمی نفسیات کی غرض و غایت مندرجہ ذیل امور کی توضیح و تشریح کرنا ہے:۔

۱- تعلّم یعنی سیکھنے کی نوعیت

۲- تعلّم میں ماحول اور وراثت کا دخل

۳- تعلّم پر اثر انداز ہونے والے عناصر

۴- پڑھانے کے طریقے اور طلبا پر ان کا اثر

۵۔ طلبا میں تعلیم کا اثر جانچنے کے مختلف طریقے مثلاً امتحانات، آزمائشیں وغیرہ

۶۔ تعلیمی اصولوں اور طریقوں سے متعلق بصیرت پیدا کرنا اور سائنسی زاویۂ نگاہ کو فروغ دینا تاکہ درس و تدریس اور تعلم کے عمل میں خاطر خواہ ترمیم و اصلاح ہو سکے۔

۷۔ متفرق تعلیمی امور سے متعلق سمجھ بوجھ اور بصیرت پیدا کرنا۔

اس میں قطعی شک نہیں کہ تعلیمی نفسیات کئی علوم کے مقابلہ میں ایک نیا علم ہے۔ عمومی نفسیات کے علاوہ اس نے متعدد دیگر علوم سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً فلسفہ، عمرانیات، انسانیات، شماریات، طب وغیرہ۔ اس کے باوجود مطالعہ کے چند شعبے ایسے ہیں جو تعلیمی نفسیات سے منسوب ہیں۔ تعلیمی دنیا کے چند ایسے شعبے جو تعلیمی نفسیات بالخصوص مطالعہ کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ مختلف مضامین پڑھانے کے خصوصی نفسیاتی طریقے۔

۲۔ تعلیم کے دوران طلبا اور اساتذہ کو پیش آنے والی خصوصی مشکلات کا سائنسی تجزیہ اور حل۔

۳۔ تعلیمی دنیا میں محنت اور سرمایہ کے ضیاع کو فروغ دینے والے عناصر کا تجزیہ، تدارک اور علاج۔

۴۔ غیر معمولی بچوں کی نشوونما اور تعلیمی ضروریات کا تجزیہ اور ان کو پورا کرنے کا اہتمام۔ غیر معمولی بچوں کی چند قسمیں یہ ہیں۔ فطین۔ کم عقل معذور یعنی اندھے، گونگے، بہرے وغیرہ، مجرم بچے۔

۵۔ طلبا کی جماعت بندی وغیرہ کے بہترین طریقے۔

۶۔ بصری اعانتوں اور جدید آلات تعلیم کے ذریعے درس و تدریس

۷۔ طلبا اور اساتذہ کے مابین خوشگوار تعلقات استوار کرنے کے طریقے۔

- طلبا میں گروہی اور اجتماعی فکر و عمل کو فروغ دینے کے طریقے۔
- بچوں کے فطری رجحانوں کا تجزیہ اور ان کی فنی رہنمائی۔
- روزمرہ زندگی کے مسائل اور الجھنوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے ضرورت مند بچوں کی رہنمائی وغیرہ۔

مندرجہ بالا اور متعلقہ تعلیمی امور پر تعلیمی نفسیات نے بے پناہ روشنی ڈالی ہے۔ ان امور پر بے شمار مشاہدے، مطالعے، تجربے اور تحقیقیں کی گئی ہیں۔ اس کے مطالعوں اور تجربوں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مدارس کی تعلیم و تدریس اور نظم و نسق میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ جن جن ملکوں میں ان نفسیاتی تحقیقوں کے تعمیری عمروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ وہاں طلبا کی ذہنی، تمدنی اور معاشرتی صحت میں قابل قدر ترقی ہو رہی ہے۔ ان ملکوں میں تعلیم ایک فرسودہ عمل ہونے کی بجائے طلبا اور اساتذہ دونوں کے لئے خوش گوار، لطیف اور موثر مشغلہ بن گئی ہے۔

تعلیمی نفسیات کی نوعیت اور وسعت سمجھنے کے لئے اس کا موازنہ تعلیمی فلسفہ سے کیا جا سکتا ہے۔ تعلیمی فلسفہ تعلیم کی غرض و غایت سے متعلق نظریئے وضع کرتا ہے۔ اس کا مقصد تعلیم کے اغراض و مقاصد کا تعین ہے۔ مثال کے طور پر تعلیمی فلسفہ اس قسم کے مسائل پر روشنی ڈالتا ہے کہ:۔

* تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے ؟
* طلبا میں کن قدروں، معیاروں اور رجحانوں کو فروغ دینا چاہیئے؟
* مدرسہ اور معاشرہ میں کس قسم کا باہمی تعلق ہونا چاہیئے۔
* نصاب تعلیم کی نوعیت کیسی ہونی چاہیئے۔

اس کے برعکس تعلیمی نفسیات کچھ اس قسم کے امور کی تحقیقات کرتی ہیں کہ:۔

- ایک مدرسہ اپنے فرائض بہترین طریق سے کیسے سرانجام دے سکتا ہے؛
- مدرسہ اور معاشرہ کے مابین خوشگوار تعلقات استوار کرنے کے بہترین طریقے کون سے ہیں؟
- تعلیم وتدریس کے موزوں اور موثر طریقے کون سے ہیں؟
- اساتذہ اور طلبا کی تعلیمی الجھنوں کا تجزیہ اور حل کیسے ہو؟

ظاہر ہے کہ تعلیمی فلسفہ کا مطمح نظر یہ ہے کہ مدارس میں "کیا ہونا چاہیئے"۔ اس کے برعکس تعلیمی نفسیات اس امر کی وضاحت چاہتی ہے کہ اچھی تعلیمی تجاویز کو مدارس میں "کیسے عمل پذیر کیا جائے؟" اول الذکر نظریات پر توجہ مرکوز رکھتا ہے اور مؤخرالذکر ذرائع پر۔ مثال کے طور پر ایک تعلیمی فلسفی یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ تعلیم کی غرض و غایت طلبا میں خوشگوار، تخلیقی اور مفید معاشرت، شخصیت استوار کرنا ہے۔ ماہر تعلیمی نفسیات اس بات کی تحقیق کرتا ہے کہ وہ کون کون سے ذرائع اور عملی طریقے ہیں جن کی مدد سے طلبا کے تخیل اور کردار میں خوشگوار تخلیقی اور مفید معاشرت خاصیتوں کو پھیلنے پھولنے کا موقع دیا جا سکتا ہے۔

تعلیمی فلسفہ اور تعلیمی نفسیات کا آپس میں بہت گہرا رابطہ ہے۔ ماہرین تعلیمی نفسیات نے تعلیمی فلسفوں کے متعدد نظریوں کو جانچا پرکھا ہے اور ان سے عملی فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح تعلیمی فلسفیوں نے ماہرین تعلیمی نفسیات کی تحقیقوں اور تجربوں سے عملی استفادہ کیا ہے۔ ان عملی تحقیقوں کی روشنی میں انہوں نے اپنے [illegible] نظریوں میں مناسب ترمیمیں اور اصلاحیں کی ہیں۔ ایک دوسرے کے علم تجربہ اور زاویہ نگاہ سے استفادہ کرنے کا یہ مفید سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔

ایک کامیاب معلم کو کسی حد تک ہر دو تین ماہرین کی صفات کا حامل ہونا چاہیئے اسے تعلیمی، فلسفی اور ماہر تعلیمی نفسیات دونوں کے نظریوں اور تحقیقوں سے اچھی

طرح روشناس ہونا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معلم کو جہاں اس بات کا
علم ہونا چاہیئے کہ تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے۔ وہاں اُسے یہ بھی معلوم ہونا
چاہیئے کہ اس تعلیمی غرض و غایت کو پورا کرنے کے لئے مناسب درس و تدریس
اور طلبا کی رہنمائی کیسے کی جائے۔ تعلیمی فلسفہ اور تعلیمی نفسیات کے مبادیات اور ان
دونوں علوم کے باہمی تعلق کا علم معلم کو درس و تدریس کے کام اور بچوں کی رہنمائی
کے معاملوں میں بہت مدد دیتا ہے۔

غلام رشید خادم

جدید رہنمائی

راہنمائی کی تعریف ماہرین نے متعدد طریقوں سے کی ہے۔ اس طرح ان کا راہنمائی کا مفہوم جدا جدا ہے۔ اگرچہ نظریاتی حد تک مماثلت کا وجود ملتا ہے۔ راہنمائی کے مختلف معانی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ مثلاً آغاز میں راہنمائی کا مطلب پیشہ ورانہ رہنمائی سمجھا گیا اور بعض ممالک خصوصاً یورپ و ایشیا تو اس کو بھی اسی مفہوم کو نقطۂ آغاز سمجھتے ہیں۔ بعد میں یہ مفہوم وسیع ہوتا چلا گیا اور ماہرین نے اس کو مکمل تعلیم کے ہم معنی سمجھا۔ بعض نے اسے مختلف عوامل و خدمات کا مجموعہ سمجھا جو فرد کی کامیاب زندگی میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں۔ ایک اور مفہوم کے مطابق راہنمائی ایک سائنسی عمل ہے۔ جس میں چند ایک ایسے اقدام شامل ہیں جو کسی بھی طالب علم کی مدد کو ایک باقاعدہ عمل بناتے ہیں۔ ذیل میں راہنمائی سے متعلق چند ماہرین کے خیالات سے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو راہنمائی کے مفہوم کی تشریح میں معاون ثابت ہوں گے۔

ڈنسمور اور ملر کے خیال کے مطابق رہنمائی افراد کے تعلیمی، معاشی اور ذاتی

رتیں جوان کو میسر ہیں یا جن میں وہ ترقی کر سکتے ہیں کے دانش مندانہ طریق استعمال
یں مدد دینے کا ذریعہ ہے تاکہ طلبا اس کے ذریعہ دوران مدرسہ اور مابعد کی زندگی
میں ایک تسلی بخش مطابقت پیدا کر سکیں۔

آربکل کے خیال کے مطابق راہنمائی ایک ایسی معاونت ہے جو بچے کو اپنے
آپ کو اپنے ہمعصروں کو مدرسہ کو اور اپنی تہذیب کو مکمل طور پہ سمجھنے میں مدد دیتی
ہے۔ تاکہ اپنے تعلیمی تجربات سے کما حقہٗ فائدہ اٹھا سکے۔

جانسن و دیگر ماہرین نے راہنمائی کو ایک ایسا عمل قرار دیا ہے جو ان فعالیتوں
اور خدمات پہ مشتمل ہے۔ جو ہر طالب علم کی انفرادی طور پہ معاونت کرتی ہیں اور اس
کے انفرادی و امتیازی جوہر کے پس منظر کے مطابق اس کی کما حقہٗ نشوونما و ترقی
میں کوشاں ہیں۔

بقول میتھیوسن (MATHEWSON) راہنمائی ایک باقاعدہ مسلسل اور پیشہ ورانہ
عمل ہے۔ جس کی مدد سے انفرادی طور پہ ہر طالب علم کی مدد کی جاتی ہے تاکہ وہ مدرسہ
میں تعلیم و ترقی۔ ذاتی نشوونما۔ معاشرتی تربیت اور پیشہ ورانہ واقفیت کے
شعبوں میں اپنی ضروریات کو بطریق احسن پورا کر سکے اور اپنے مسائل کو حل کر سکے۔

سی۔ ایچ۔ ملر رہنمائی کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کرتا ہے۔

"راہنمائی ایک ایسا عمل ہے جو تعلیم کے جامع عمل کا ایک جزو لاینفک ہے اور
اس کا تعلق ہر فرد سے ہے تاکہ اسے اپنی زندگی کے لائحہ عمل میں منصوبہ بندی
کرنے میں اس طرح مدد دی جائے کہ وہ زندگی کے متعلق فیصلے کر سکے۔ اور
انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔

رہنمائی کے ان مطالب کے پیش نظر ہم اس نظریہ کی تشریح درج ذیل امور
کی روشنی میں کر سکتے ہیں۔

۱۔ راہنمائی ایک وسیع نظریئے کی حامل ہے اور اس کا میدان عمل صرف
پیشہ کے انتخاب تک محدود نہیں۔

۲۔ راہنمائی کی بنیاد قابلِ اعتماد۔ مکمل و صحیح معلومات پر ہے۔ محض بے بنیاد مفروضات پر نہیں۔

۳۔ راہنمائی کے لئے فرد کی صلاحیتوں اور ماحول کے مواقع میں مطابقت ضروری ہے۔

۴۔ راہنمائی کا تعلق مضمون فرد سے جو اپنی وراثت اور ماحول کے باہمی ربط کا نتیجہ ہے اور اسے سمجھنے کے لئے ہر دو اثرات کا سمجھنا ضروری ہے۔

۵۔ راہنمائی ایک باقاعدہ اور مدلل عمل ہے۔ یہ بات اس کی سائنسی فطرت پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ محض اتفاقی عمل یا فکر کا ڈھانچہ نہیں ہے۔ اس کی بنیاد اسباب و علل کے باہمی ربط پر ہے اور اس کی کامیابی میں وہ تمام عوامل کارگر ہیں جو نظام قدرت میں ایک تنظیم اور سسٹم کی نشاندہی کرتے ہیں۔

۶۔ راہنمائی تعلیم کا ایک ضروری حصہ ہے۔ اس کی جڑیں معاشرہ کی فکری و عملی تنظیم میں ہیں اور موجودہ معاشرہ کی تغیر پذیر حالت کی نشاندہی کرتی ہیں۔

۷۔ رہنمائی کے لئے ہمیں فرد کے مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنا ہوگی اس کی بنیاد سائنسی ہونی چاہیئے۔

۸۔ راہنمائی ایک مدد یا معاونت کا عمل ہے اس میں جبر کا دخل نہیں ہے یعنی ہم بطور راہنما یا مشیر کے اپنے فیصلے فرد پر نہیں ٹھونستے بلکہ ہماری سعی یہ ہوتی ہے کہ ہم فرد کو اپنی صلاحیتیں سمجھنے میں مدد دیں اور ایسے مواقع بہم پہنچائیں کہ وہ حقائق کے آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھ سکے۔

ایک اور تعریف کے مطابق راہنمائی ان خدمات کا نام ہے جو طلبہ کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ اپنے قوارممکنہ سے بطریق احسن استفادہ کر سکیں تاکہ وہ اپنے

رستے کے لئے اور معاشرہ کے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکیں۔ ان خدمات میں اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ طلباء کی ذہنی، جذباتی، مجلسی اور طبعی خصوصیات کی شناخت کی جائے ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے ان کی مشکلات کی تشخیص کی جائے اور ایسے عوامل مہیا کئے جائیں۔ جن سے ان کی بنیادی و ثانوی ضروریات کی تکمیل ہو سکے۔

راہنمائی کے لائحہ عمل کی بنیاد انسان کی حقیقت سے متعلق تصورات پر ہے۔ اس کا آغاز ایک معمولی مشاہدہ سے ہوتا ہے کہ ہر انسان کو اس دنیا میں ہر قدم پر کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہوتا ہے اور اس پر عمل کرنا ہوتا ہے ہمیں کسی نہ کسی طریقے سے زندگی گزارنا ہے۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح اپنے دائرہ عمل یعنی عالم فانی میں اپنی مشکلات کا حل تلاش کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا ہر فیصلہ اس بات پر مبنی ہے کہ وہ اپنے آپ کو جس حقیقت کے تصور میں دیکھتا ہے اور ان تصورات و خیالات کی روشنی میں اپنے ماحول سے کیا مطالب اخذ کرتا ہے۔ اس ضمن میں ایک ایسے باقاعدہ نظام خیال کی ضرورت ہے جو ہمارے یقین و عمل کے اصولوں کی وضاحت کرے اور انہیں ایک دوسرے سے مربوط رکھے۔

ہم میں سے بہت لوگ ایسے ہیں جو عملی زندگی کا آغاز بغیر کسی مربوط اصولی نظام کے کرتے ہیں اور اسطرح یقین و عمل کی عدم مطابقت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ہم نے اپنے اصولوں کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہ کی ہو۔ لیکن جب ہم کوئی بلند مقصد لے کر نکلیں تو ضروری ہے کہ اس کے بنیادی نظریات کو سمجھیں اور ان کی بنیاد پر اپنے لائحہ عمل کو ترتیب دیں۔

راہنمائی کے جملہ عوامل کی بنیاد درج ذیل اصولوں پر مبنی نظر آتے گی۔

۱۔ ہر فرد قابلِ احترام ہے اور اس طرح وہ ہماری تمام تر توجہ کا مستحق ہے۔ ہمارا یقین محکم ہے کہ تمام انسان قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ محض اسی لئے ہم اس کی بہبود کے لئے کوشاں ہیں۔

۲۔ ہر انسان مختلف تعمیری صلاحیتوں کا خزانہ ہے۔ یہ صلاحیتیں مختلف النوع ہیں جن کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انسانی جوہر کی شناخت کریں اور ایسا ماحول مہیا کریں کہ ان صلاحیتوں کو نشوونما ہو سکے۔ اور وہ تخلیقی عوامل میں استعمال ہو سکیں۔

۳۔ ہر فرد اس قابل ہے کہ وہ معاشرہ کی بہبود میں حصہ لے سکے اس طرح وہ اپنی زندگی بھی کامیابی سے گزارے اور ایک مثالی معاشرہ کی تشکیل میں مدد دے۔

۴۔ ہر فرد کو ایک جامع شکل میں دیکھنا ضروری ہے۔ جب بھی وہ رد عمل ہوتا ہے ایک مکمل انسان کے طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کے مختلف پہلو یعنی مذہبی، اخلاقی، ذہنی، طبعی۔ مجلسی وغیرہ صرف ہمارے مطالعہ کی سہولت کے لئے ہیں اور فرد کو سمجھنے کی کاوش کا ایک حصہ ہیں۔ ورنہ اس کی شخصیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہرگز ممکن نہیں ہے۔

۵۔ انسان کی زندگی میں ماضی۔ حال اور مستقبل کے تمام زمانے ہیں کن عوامل نے اس شخصیت پر اثر ڈالا جو کچھ وہ آج ہے وہ اس کے مستقبل کا عکس ہے۔ لہٰذا انسان کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کی نشوونما کے مختلف ادوار کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے اور ان حقائق کی روشنی میں اس کے مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کرنے کی بھی ضرورت ہوگی۔ یہ پیشین گوئی اس کے ماضی کے کردار، موجودہ صلاحیتوں، ممکنہ توار، اور موجودہ و مستقبل کے مواقع کی روشنی میں ہوگی۔

۶۔ ہر انسان دوسرے سے مختلف ہے۔ وراثت اور ماحول کے ملے جلے اثرات نے ہر انسان کی طبعی ہیئت، جسمانی حالت۔ خدوخال۔ ذہانت، رجحانات۔ دلچسپیوں اور شخصیت کے دیگر پہلوؤں کو ایک خاص رنگ دیا ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔ ہمیں ان انفرادی اختلافات کو پرکھنا چاہیئے اور ہر شخص کی صلاحیتوں

کے مطابق اسے زندگی کے لائحہ عمل کی تدوین میں مدد دینی چاہیئے۔

۷۔ انسان کی عملی زندگی اسباب و علل کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے اس کا کوئی بھی عمل بغیر کسی وجہ کے نہیں ہوتا۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے عمل کے محرکات کا بغور مطالعہ کریں۔ اور ایسے اسباب و ذرائع کا اہتمام کریں جو اس کی شخصیت کی تکمیل میں معاون ہو سکیں۔

۸۔ راہنمائی ایک باہمی تعاون کا عمل ہے۔ یہ کسی ایک فرد (مثلاً مشیر یا رہنما) یا کسی ایک ادارہ (مثلاً اسکول) کی انفرادی کاوشوں سے کامیاب نہ ہوگا۔ اس عمل میں مختلف افراد مثلاً معلم، والدین، ماہر نفسیات، مشیر اور متعدد ادارے مثلاً مدرسہ، کنبہ، معاشرہ وغیرہ عمل پذیر ہوں گے۔ راہنمائی کے اثرات صرف اسی صورت میں دور رس ہوں گے اگر ان افراد اور اداروں کا تعاون بدرجہ اتم ہوگا۔

۹۔ راہنمائی مختلف النوع طریقوں پر مبنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسئلہ جس سے انسان دوچار ہوتا ہے۔ وہ دوسرے مسائل سے مختلف ہے اور اس کا حل تلاش کرنے کے طریقے بھی مختلف ہوں گے۔ یعنی ہر مسئلہ کے حل کے [illegible] ایک مجرب نسخہ کارگر نہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں راہنمائی یا مشاورت [illegible] کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے مگر بنیادی اصول یہ ہے کہ ہمیں ہر [illegible] نوعیت کو سمجھنا چاہیئے اور اپنے طریقوں کو ضروریات کی روشنی میں [illegible]

[illegible] ۔ میں رہنما اور طالب علم کے تعلق کو فوقیت حاصل ہے یہ تعلق [illegible] گرو کا تعلق نہیں اور نہ ہی باپ بیٹے کا تعلق ہے۔ چونکہ ان ہر دو [illegible]

[illegible] منصب، اختیار، خوف اور ڈر کا دخل ہوتا ہے۔ رہنما اور طالب علم [illegible] باہمی احترام کا تعلق ہے۔ جس میں مشیر اپنے تجربہ، علم، تربیت اور

بہتر معلومات کی بناء پر طالب علم کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد دیتا ہے یہ ایک پیشہ ورانہ خدمت ہے اور اس کی بنیاد باہمی عزت، سمجھ بوجھ اور جذبۂ خدمت پر ہے۔

ان اصولوں میں واضح طور پر مرکزی حیثیت فرد کو ہے جو اپنے لئے معاشرہ کے لئے قدر و قیمت کا حامل ہے۔ یہ فرد ذہانت، فہم و فراست، سوچ بچار اقدار، جذبات اور دیگر جواہر ممکنہ کا حامل ہے وہ عوامل کو سمجھ سکتا ہے اور اسے سمجھایا جا سکتا ہے۔ اس کی مرکزی حیثیت کا تصور اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ ہم اسے اس سوال کا جواب دینے میں مدد دیتے ہیں کہ احسن زندگی کیا ہے اور اس کے نظریاتی و عملی تقاضے کیا ہیں؟

راہنمائی کا حتمی مقصد تو اس نظریہ کی تعریف اور اصولی شکل سے واضح کیا ہے مزید وضاحت کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رہنمائی کا سب سے بڑا مقصد ہر فرد کی بہتر نشو و نما ہے تاکہ وہ طبعی، ذہنی، مجلسی، اقتصادی، اخلاقی، جذباتی، روحانی اور مذہبی اعتبار سے ایک کامیاب انسان بن سکے۔ اس بلند مقصد کو عوامل کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس طرح مدرسہ کی حدود میں ہمیں رہنمائی کے مندرجہ ذیل مقاصد نظر آتے ہیں :-

۱- طلبا میں قوت فیصلہ، احساس ذمہ داری اور زندگی کے لائحہ عمل کے تعین کی قوتوں کو جلا دینا۔

۲- طلبا میں یہ صلاحیت پیدا کرنا کہ وہ زندگی کے احسن مقاصد کو پرکھ سکیں۔

اور ان کے حصول میں کوشاں ہوں۔

۳- طلبا کی زندگی میں مسائل کی پیش بینی کرنا اور ان مسائل سے عہدہ برآئی کے لئے مناسب حالات پیدا کرنا۔

۴۔ طلبا کی مدد کرنا تاکہ وہ اپنے مستقبل کے مسائل کو دیکھ سکیں اور ان کو حل کرنے کی سوجھ بوجھ پیدا کریں۔

۵۔ طلبا کی رہنمائی کرنا تاکہ وہ انسانی معاشرہ میں اچھے تعلقات کی اہمیت کو سمجھیں اور ان کے حصول کے لئے کوشاں رہیں۔

۶۔ مدرسہ میں طلبا کو مناسب مضامین چننے میں مدد دینا۔

۷۔ مناسب مرحلہ پر پیشہ کے انتخاب میں مدد دینا۔

۸۔ مدرسہ کی فضا میں گھل مل جانے میں مدد دینا۔

۹۔ ایسی سرگرمیوں کا انصرام کرنا جن سے طلبا کی اخلاقی و مذہبی تربیت ہو۔

۱۰۔ طلبا کی تدریسی مشکلات کا جائزہ لینا اور ان کے حل کے لئے مناسب پروگرام بنانا۔

۱۱۔ طلبہ سے متعلق مکمل معلومات فراہم کرنا اور انہیں بامعنی طور پر تربیت دینے کا انصرام کرنا۔

۱۲۔ جوہر قابل کی شناخت کرنا اور انہیں بامعنی طور پر تربیت دینے کا انصرام کرنا۔

۱۳۔ مدرسہ اور معاشرہ میں ربط قائم کرنا

۱۴۔ مکتب، گھر اور مدرسہ میں دیر سے آنے والے طلباء کا جائزہ لینا اور انہیں صحیح راستہ پر گامزن کرنا۔

... طلبہ کو اچھے شہری اور محب وطن بننے میں مدد دینا۔

... منتظمین کی مدد کرنا تاکہ وہ اپنے فرائض منصبی بطریق احسن انجام دے سکیں۔

... رہنمائی کے مقاصد اور تعلیم کے مقاصد میں گہرا ربط ہے۔ راہنمائی ... میں بھی اس امر کی طرف نشاندہی کی گئی ہے کہ راہنمائی تعلیم کا جزو ...

لابینفک ہے۔ راہنمائی تدریس سے مختلف ہے۔ مگر اساتذہ بھی راہنمائی کے فرائض ادا کرسکتے ہیں۔ تعلیم کے مقاصد میں بھی فرد اور معاشرہ پر زور دیا جاتا ہے اور اسی طرح راہنمائی میں بھی۔ تعلیم کے مقاصد میں بالعموم مندرجہ ذیل امور پر زور دیا جاتا ہے۔

۱۔ کہ ہر فرد کو ایسے تجربات بہم پہنچائے جائیں تاکہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول پر قابو پاسکے۔ اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنی زندگی کے مقاصد کا تعین کرسکے اور مناسب مواقع پر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرسکے۔

۲۔ کہ تعلیم ایسے افراد پیدا کرے جو معاشرہ کی اقدار کی حفاظت کرسکیں اور تغیر پذیر حالات میں ان کی اقدار کی ترقی و نشو و نما میں حصہ لے سکیں۔

۳۔ کہ فرد اپنے معاشرہ کی اخلاقی و مادی بنیادوں کو سمجھ سکے اور ان کی بہبود کے لئے کوشاں ہو۔

ان مقاصد کے مدنظر راہنمائی میں بھی تین امور پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے یعنی فرد۔ معاشرہ اور اس کی ثقافتی و اقتصادی ضروریات۔ اس لحاظ سے ہر فرد کے مسائل پیدائش سے بلوغت تک اور اس کے بعد مثلاً تعلیمی، طبعی، ذاتی۔ پیشہ ورانہ اخلاقی و مذہبی مسائل کی سمجھ بوجھ اور ان کا حل تلاش نہیں کرسکتا تو اسے راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح جب وہ اپنی ضروریات کی تکمیل خود نہیں کرسکتا تو اسے اپنے آپ کو اور ماحولی اثرات کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح راہنمائی اور تعلیم کے مقاصد میں مماثلت ضروری ہے۔

تعلیم کی غرض و غایت

تہذیب و شائستگی، فکری ریاضت، حسن اور انسانی شرافتوں کے جذب و قبول سے عبارت ہے۔ اس کا معلومات کے بیکار طوماروں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ یہ ان پر منحصر ہے۔ ایک ایسا شخص جو معلومات کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہو، خدا کی خدائی میں اس سے زیادہ مغز چٹ اور بیکار انسان کوئی نہیں ہوگا۔ ہمارا نصب العین تو یہ ہونا چاہیئے کہ ایسے انسان پیدا کئے جائیں جو "کلچر" کے بھی حامل ہوں اور کسی مخصوص شعبۂ علم کے ماہر بھی، اس صورت میں ان کی علمی مہارت انہیں اس بنیادی مقام پر لا کھڑا کرے گی۔ جہاں سے وہ آگے بڑھ سکیں گے اور کلچر ان میں فلسفہ کی سی گہرائی اور فن کی سی بلندی پیدا کرے گا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اصل ذہنی نشوونما وہ ہوتی ہے۔ جو انسان کے باطن سے خود کی مدد اور اپنی ہی صلاحیت سے ظہور میں آتی ہے اور یہ عام طور پر سولہ سے بیس برس کے درمیانی عرصہ میں وجود میں آتی ہے۔ اس نشوونما میں ابتدائی تربیت کا حصہ اہم ہے جو اکثر بارہ سال کی عمر سے پہلے ماں کے ذریعے تکمیل پاتا ہے۔

اس ضمن میں لارڈ پادری ٹمپل سے منسوب ایک قول میرے مفہوم کی مزید وضاحت کرے گا۔ کہتے ہیں کہ رگبی کا ایک شخص جو لڑکپن میں بالکل معمولی قابلیت رکھتا تھا جب آخری عمر میں اس کی امتیازی کامیابیوں پر حیرت کا اظہار کیا گیا تو لاٹ پادری موصوف نے یہ پتے کی بات کہی : "یہ اہم نہیں ہے کہ انسان اٹھارہ سال کی عمر میں کیا ہوتا ہے ! دیکھنا تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے بعد کیا بنتا ہے ؟"

ایک بچے کے ذہن و فکر کی تربیت کے سلسلے میں اور تمام چیزوں سے زیادہ ہمیں اس شے سے خبردار رہنا چاہیئے جسے میں "جامد افکار" کا نام دوں گا۔ اس سے مراد وہ افکار ہیں جنہیں برتنے اور پرکھنے کے بغیر ہی ذہن میں ٹھونس لیا جاتا ہے یا جنہیں دوسرے خیالات سے تازہ پیوند نہیں دیا جاتا۔

تعلیم کی تاریخ میں سب سے زیادہ عجیب و غریب مظہر وہ تعلیم گاہیں ہیں جن سے ایک وقت میں تو قابلیت اور ذہانت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ لیکن ایک ہی نسل بعد وہ بیکار علمی نمائش اور کھوکھلی قواعد پرستی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایسی تربیت گاہوں میں مذکورہ بالا جامد افکار کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے افکار کی روشنی میں جو تعلیم دی جاتی ہے، وہ نہ صرف بے مصرف ہی ہوتی ہے۔ بلکہ علاوہ اور باتوں کے نقصان دہ بھی ہوتی ہے۔ CORRUPTIS OPTIMI PESSIMA

عہد ماضی میں چند خاص وقفوں کے سوا جبکہ فکری زندگی واقعی جوش میں تھی تعلیم بنیادی طور پر جامد افکار کی حامل رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر سوسائٹی میں عام طور پر سب سے شائستہ حصہ ادھیڑ عمر کی ایسی ناخواندہ مگر چالاک اور جہاندیدہ عورتوں پر مشتمل ہوتا ہے جو جامد افکار کے اس بھیانک بوجھ سے بچ گئی ہوتی ہیں۔ ہر وہ ذہنی انقلاب جو انسانیت کو عظمت آشنا کرے، جامد افکار کے خلاف ایک پُرزور احتجاج ہوتا ہے لیکن رنجیدہ امر یہ ہے کہ انسانی نفسیات سے افسوسناک ناواقفیت کے باعث ایسا انقلاب انسانیت

(خود ساختہ جامد افکار کی زنجیروں سے از سر نو جکڑ دینے کے لئے اپنی قسم کے کسی
نئے تعلیمی منصوبے کا نفاذ کر دیتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمیں اپنے تعلیمی نظام میں اس ذہنی دیمک زدگی سے کیسے
بچنا ہوگا۔ اس سلسلے میں دو تعلیمی اصول ہر حال میں مد نظر رہیں :-

اول : بہت زیادہ مضامین نہ پڑھائے جائیں۔

دوم : جو کچھ پڑھایا جائے خوب اچھی طرح پڑھایا جائے۔"

زیادہ مضامین کے تھوڑے تھوڑے حصے پڑھانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ
متفرق خیالات کو جن میں قوت کی کوئی رمق نہیں ہوتی بے سوچے سمجھے حاصل کرتا
ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ بچے کو جن خیالات سے روشناس کرایا جائے وہ تھوڑے
اور اہم ہوں اور پھر ان کو ہر ممکن طریق سے ترتیب پانے دیا جائے۔ بچہ انہیں
اپنا لے اور اپنی حقیقی زندگی میں موقع و محل کے مطابق انہیں برتنے پر قادر
ہو جائے۔ اس انکشاف کی حقیقت یہ ہے کہ کلیات کی مدد سے بچے کو اپنی زندگی
کے سلسلۂ واقعات میں چھپے ہوئے عجائبات کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ یہاں شعور
سے میری مراد صرف منطقی تجربے کی صلاحیت نہیں۔ اگرچہ یہ شعور میں شامل
ہے میں نے اس لفظ کو یہاں اس معنی میں استعمال کیا ہے جو اس فرانسیسی ضرب المثل
میں ہے۔ "شعور کل عقل کل سے حاصل ہوتا ہے" علم کی نمائش کرنے والے ایسی
تعلیم پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں جو افادیت کی حامل ہو۔ لیکن اگر تعلیم افادے
کی شے نہیں تو پھر آخر کیا ہے؟ کیا یہ ایک ایسا جوہر ہے جسے ڈبیہ میں بند
کر کے رکھنا چاہیئے۔ زندگی کے مقاصد جدا جدا سہی تعلیم کو بہرحال مفید ہونا چاہیئے
تعلیم سینٹ آگسٹین کے لئے بھی مفید تھی اور نپولین کے لئے بھی۔ یہ کار آمد شے
ہے۔ کیونکہ شعور بہرحال مفید شے ہے۔

تعلیم میں ادب کے ذریعے جو شعور پیدا ہوتا ہے میں اس کا ذکر یہیں چھوڑتا
ہوں اور آگے بڑھتا ہوں۔ میں کلاسیکی اور جدید نصاب تعلیم کی تقابلی خوبیوں کے

بارے میں بھی کوئی فیصلہ صادر نہ کروں گا - میں تو صرف یہ کہوں گا کہ جس قسم کا ذ
ہمیں درکار ہے وہ زمانۂ حال کے ناگزیر تقاضوں کا شعور ہونا چاہیئے. ماضی ؟
علم کا ایک ہی مصرف ہے اور وہ یہ کہ اس سے ہم عہد حاضر سے عہدہ برآء ہو
کے لئے مسلح ہو سکیں. نوجوان ذہنوں کے لئے کوئی شے مہلک نہیں کیونکہ حا
ہی سب کچھ ہے - اور حال اس لئے مقدس شے ہے کہ اس میں ماضی اور مستقبل
جمع ہو گئے ہیں. اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مدنظر رہنا چاہیئے کہ زمانہ خواہ دو
سال پہلے کا تھا یا صرف دو سو سال پہلے کا بہر حال پرانا ہی ہے. برسوں کی کم
بیشی سے اس کے پرانا ہونے میں کچھ فرق نہیں پڑتا. تاریخوں اور سنوں کی مانما
نمائش سے فریب نہیں کھانا چاہیئے. شیکسپیئر اور مولیئر کا عہد سوفوکلیز اور یوری
کے زمانوں سے کم پرانا نہیں. بزرگوں کی روحوں سے راز و نیاز ایک عظیم اور بصیر
افروز چیز ہے لیکن اس اختلاط کا مقام صرف ایک ہی ہے اور وہ عہد حاضر
اور اس چیز سے بہت کم فرق پڑتا ہے کہ بزرگوں کے کسی خاص گروہ کو اس مقام تک
پہنچنے کے لئے کس قدر عرصہ صرف کرنا پڑا -

تعلیم کے سائنٹفک اور منطقی پہلو کے ذکر کے وقت ہمیں یاد رکھنا چاہیئے :
یہاں بھی ایسے افکار جنہیں مصرف میں لایا نہیں جاتا. حقیقتاً مضر ہوتے ہیں. کہ
خیال کو مصرف میں لانے سے میری دلی مراد یہ ہے کہ اسے اس سلسلۂ حیات سے جو
دیا جائے جو احساسات، جذبات، امیدوں، تمناؤں اور ذہنی عمل (جو خیالات
ایک سلسلے کو دوسرے سے ملاتا ہے) سے مرکب ہے ..... اور ظاہر ہے کہ ان
سب چیزوں کا دوسرا نام حیات ہی تو ہے ..... میں لوگوں کے کسی ایسے گروہ کا تص
کر سکتا ہوں جو اپنی روحوں کو محبوس کر کے منتشر افکار کو بلا چون و چرا مان کر ان
یوں ہی راستہ زنی کرتا رہے ..... مگر انسان اور انسانیت کا ارتقاء کبھی اس طرح
نہیں ہوا ..... شاید اخبارات کے ایڈیٹر اس نوع کے ہوں تو ہوں ..... باقی نوع
انسانی کی سرگزشت تو اس سے الگ ہی ہے -

سائنٹفک انداز تربیت میں کسی تصور کو سب سے پہلے ثابت کرنا ہوتا ہے، لیکن
وسیع معنوں میں ثابت کرنے سے میری مراد اس کی قدر و قیمت کو ثابت کرنا ہے
آپ جانتے ہیں کہ ایک تصور کی اس وقت تک کچھ وقعت نہیں ہوتی۔ جب تک کہ ان
کی قضایا جن سے وہ مرکب ہے تصدیق نہ ہوتی ہو۔ لہٰذا کسی تصور کے اثبات کی
ایک لازمی شرط یہ ہے کہ وہ قضایا تجربے یا منطقی استدلال سے صحیح ثابت ہوں۔
لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ اثبات اس تصور کے ابتدائی تعارف کے وقت ہی عمل میں
لایا جائے۔ کیونکہ شروع میں تو معتبر استادوں کا بیان ہی کافی سند ہوگا۔ ہمیں
جب بعض مخصوص قضیوں سے سابقہ پڑتا ہے تو ابتدا میں اتنا ہی کافی ہوتا ہے۔
کہ ہم اس کی صحیح قدر و قیمت سے باخبر ہو جائیں۔ ان کی صحت کے ثبوت وغیرہ
کا کام تو علم کے دوسرے حصوں میں ہوتا رہتا ہے۔ زیادہ متعین لفظوں میں ہم کسی شے
کے اثبات و انکار کی اس وقت تک کوشش ہی نہیں کرتے جب تک کہ اس کی
اہمیت ہماری نظروں میں اسے اس مقام کا حقدار نہ بنا دے ..... محدود معنی
میں "ثبوت" اور "اہمیت کا احساس" یہ دو عمل ایسے ہیں جن کو زمانی لحاظ سے پوری
طرح الگ الگ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ دونوں عمل قریب قریب ایک ساتھ ہی
شروع ہو سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان میں سے کسی ایک کے تقدم کا سوال ہے۔ تو
عمل اور تجربے کی مدد سے اہمیت کا احساس پیدا کرنا بہرحال مقدم ہے۔

اس کے علاوہ ہمیں کسی تصور کو منقطع انداز میں عمل میں لانے کی کوشش نہیں کرنی
چاہیئے۔ اس سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ پہلے کسی ایک تصور کی وضاحت کے لئے
تجربات کا ایک عمل اور مختصر سا سلسلہ قائم کیا جائے اور پھر دوسرے کے لئے ایسی ہی
صورت پیدا کی جائے، پھر اس کی وضاحت اور اس کے بعد اس کے ثبوت کے لئے
تجربات کا شمار کیا جائے۔ غرض ساری کتاب میں یہی طریقہ جاری رہے۔ میری یہ مراد
ہرگز نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ تو انتہائی اکتا دینے والا عمل ہوگا۔ صحیح بات یہ ہوگی کہ باہم
متعلق سچائیوں سے بحیثیت مجموعی استفادہ کیا جائے اور مختلف تصورات کو کسی قابل نظام

کے تحت لا کر استعمال کر لیا جائے۔ خواہ ان میں تکرار کا رنگ ہی کیوں نہ پیدا ہو جائے
اپنے نظریات کی چند عملی صورتوں کا انتخاب کر لیجئے اور ان کا نظریاتی مباحث کے ساتھ
مخصوص انداز میں مطالعہ کیجئے۔ نظری بحث کو مختصر اور آسان تو رکھیے مگر اس
میں قطعیت برقرار رہے۔ ..... وضاحت کی خاطر اسے بہت طویل نہیں ہونا
چاہیئے۔ نیم ہضم شدہ نظری علم کے نتائج افسوسناک ہوتے ہیں۔ اس کے
علاوہ نظریئے اور تجربے کو خلط ملط نہیں رہنا چاہیئے۔ بچے کے ذہن میں اس بارے
میں کوئی شبہ نہیں رہنا چاہیئے کہ کب کوئی بات ثابت کی جا رہی ہے اور کب کوئی تجربے
کی منزل سے گذر رہی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جو چیز ثابت ہو جائے اسے عمل میں لے
آنا چاہیئے اور جو چیز عمل میں بھی لائی جائے جہاں تک ممکن ہو اسے ثابت شدہ ہونا چاہیئے
میرے نزدیک ثبوت اور استفادہ ایک شے نہیں ۔

یہاں پہنچ کر بظاہر موضوع سے ہٹ کر میں ایک اور زاویئے سے اس بحث کو
اٹھاتا ہوں۔ ہم ابھی تو صرف اس بات کا احساس کر پائے ہیں کہ فن تعلیم کے لئے
ایک خاص قسم کی ذہانت اور ایک خاص قسم کے مطالعہ کی ضرورت ہے اور یہ کہ
یہ ذہانت اور یہ علم کسی شاخ کی سرسری اور سطحی علم کی طرح کا نہیں بلکہ اس سے
مختلف اور زیادہ گہرا ہے۔ پچھلی نسل نے جزوی طور پر اس کا احساس کیا تھا۔
اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر اپنے رفیقوں میں امتیاز حاصل کرنے کے لئے بھدے بھونڈے
انداز میں بائیں ہاتھ سے گیند پھینکنے اور فٹ بال کا ذوق پیدا کرنے کی طرف مائل
ہوتے، لیکن کلچر، کرکٹ، فٹ بال وغیرہ تک محدود نہیں، نہ کلچر کتابی علم کے
حصول سے عبارت ہے۔

تعلیم تو علم سے فائدہ اٹھانے کا فن ہے یہ فن بڑی مشکل سے سکھایا جا سکتا ہے
جب کبھی بھی تعلیمی نقطۂ نظر سے کوئی قابل قدر کتاب لکھی جائے تو تبصرہ نگار یہی
کہے گا کہ یہ کتاب تو تدریس کے کام کی نہیں اور یہ تو مشکل ہے۔ یقیناً وہ کتاب پڑھانی
مشکل ہو گی۔ لیکن اگر وہ کتاب آسان ہوتی تو جلا دینے کے قابل ہوتی۔ ایسی کتاب تعلیم

...ب نہیں ہو سکتی۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیم میں بھی بظاہر دلچسپ اور خوشنما شاہراہیں گھناؤنے مقام کی طرف لے جاتی ہیں۔ بدی کی یہ راہ کسی ایسی کتاب یا استاد یا لیکچروں کے مجموعے کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے جو عملاً ایک طالب علم کو وہ تمام سوالات رٹ لینے کے قابل بنا دے گی جو آئندہ بیرونی امتحان میں اس سے پوچھے جانے والے ہوں۔ چلتے چلتے میں یہ بھی کہوں گا کہ اس وقت تک کسی تعلیمی نظام کا وجود ممکن ہی نہیں، جب تک کہ ہر وہ سوال جو کسی بھی امتحان میں کسی طالب سے صاف طور پر کیا جائے اس کی تشکیل اور ترتیب خود طالب علم کے اپنے استاد کے ہاتھوں نہ کی گئی بیرونی ممتحن نصاب تعلیم یا طالب علموں کے عملی کام کی رپورٹ تو پیش کر سکتا ہے لیکن اسے کبھی اس امر کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ طالب علم سے کوئی ایسا سوال کرے جس کی اس کے اپنے استاد نے سختی سے نگرانی نہ کی ہو یا کم از کم وہ سوال اس کے اپنے استاد سے طویل رابطہ کا نتیجہ نہ ہو۔ اس کلیئے کی چند مستثنیات بھی ہیں۔ لیکن وہ مستثنیات ہی ہیں اور عام قاعدے کے تحت آسانی سے ان کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ طالب علم کے نصاب میں افکار نظری کے اہم عملی اطلاق کی گنجائش ہونی چاہیئے۔ اس نقطۂ نظر کو عمل میں لانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں علم کو زندہ رکھنے اور جمود سے اس کے تحفظ کا مسئلہ پوشیدہ ہے اور یہ مسئلہ ہر قسم کی تعلیم میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

بہترین طریق کار کے لئے کئی چیزوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً استاد کی صلاحیت، طالب علموں کی ذہنی اقسام، زندگی میں ان کی توقعات۔ اسکول کے گرد و پیش سے میسر آنے والے فوری مواقع اور ان سے متعلق دوسرے کوائف ... یہی وجہ ہے کہ سب طلباء اور سب اسکولوں کے لئے یکساں اور یک رنگ بیرونی امتحان بے حد مہلک ہوتا ہے۔ ہم اس کی مذمت اس لئے نہیں کرتے کہ ہم خبطی ہیں اور

جملہ رائج شدہ قاعدوں اور رسموں کی مذمت ہمارا شعار ہے۔ ہم اتنے نادان نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ کسی شے کی مخالفت کرنے لگیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسے یک رنگ امتحانات بھی اس لحاظ سے مفید ہی ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے کام چوری پکڑی جا سکتی ہے۔ دراصل ہماری ناپسندیدگی کی وجہ واضح اور عملی نوعیت کی ہے اور وہ یہ کہ ایسے امتحانات، تعلیم کے بہترین حصے کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر تجربے کی روشنی میں تعلیم کے مرکزی مقصد کا تجزیہ کیا جائے تو یہ واضح ہوگا۔ کہ اس مقصد کی تکمیل کا انحصار بہت سے عناصر کے نازک امتزاج پر ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارا واسطہ بے جان مواد سے نہیں ہے بلکہ انسانی ذہنوں سے ہے۔ طالب علم میں جستجو کا ذوق پیدا کرنا پیچ در پیچ الجھنوں پر قابو پانے اور نظری علم کو آنے والے حالات اور پیچیدگیوں کے حل میں استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا یہ سب خوبیاں گنے چنے قواعد کے ذریعہ ممکن نہیں جن کو کسی قاعدے کے تحت امتحان کے مضامین میں شامل کیا جا سکتا ہو۔

جو استاد عملی تجربہ رکھتے ہیں مجھے ان سے یہ کہنا ہے کہ کسی معقول ضابطے کے ذریعے یہ چیز تو ممکن ہے کہ طالب علموں کے ذہنوں میں جامد افکار کی ایک خاص مقدار ٹھونس دی جائے۔ آپ نے نصاب کی ایک کتاب اٹھائی اور پڑھا دی۔ یہاں تک تو خیریت ہے! اس سے ایک بچہ یہ تو جان جاتا ہے کہ "دوسرے درجہ کی مساوات" کو کیسے حل کیا جاتا ہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ ایک بچے کو دوسرے درجہ کی مساوات کا حل سکھانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کا ایک رسمی جواب دیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ "ذہن ایک آلہ ہے جسے پہلے تیز کیا جاتا ہے اور پھر استعمال میں لایا جاتا ہے" دوسرے درجہ کی مساوات کو حل کرنے کی استعداد کا حصول اس آلہ کو تیز کرنے کے عمل ہی کا حصہ ہے۔ اس جواب میں اتنی سچائی تو ضرور ہے کہ یہ بڑا پرانا جواب ہے! لیکن اس نیم سچائی کے باوجود اس میں ایک بنیادی نقص ایسا ہے جو جدید شعور کا گلا گھونٹ دینے کے لئے کافی ہے۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ وہ کون پہلا شخص تھا جس نے ذہن انسانی کو آلہ سے مشابہت دے کر ایک زندہ چیز کا ایک بے جان شے سے رشتہ

ہوا شاید یونانی کے سات دانش وروں میں سے کوئی ایک یا ان کی پوری جماعت ہوئی... خیر... اس کا معیار کچھ بھی ہو اس میں شک نہیں کہ نامور اکابر نے اسے جو شرف قبولیت بخشا ہے اس کے باعث اسے ایک قسم کا استناد حاصل ہو گیا ہے مگر یہ استناد کتنا وزنی ہی کیوں نہ ہو اور اس کے تسلیم کرنے والوں کی صف میں کتنے ہی بڑے لوگ کیوں نہ ہوں، مجھے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ یہ ان انتہائی مہلک، غلط اور خطرناک تصورات میں سے ایک ہے جو نظریۂ تعلیم میں کبھی بھی بار پا سکے ہیں ذہن کبھی بھی نکما نہیں رہتا - یہ برابر کام میں لگا رہتا ہے' اثرات قبول کرتا اور ان پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتا رہتا ہے - یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کچھ دیر کے لئے اس کو معطل رکھیں، یہ کہہ کر ٹھہریئے، ہم پہلے بچے کے ذہن کو ذرا تیز کر لیں پھر اس سے کام لینا شروع کریں گے۔ بنا بریں لازم ہے کہ آپ اپنے سبق یا موضوع درس میں جتنی بھی دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں وہ آج ہی سے.... ابھی سے پیدا کیجیے - آپ طالب علم کی جن صلاحیتوں کو تقویت دینا چاہتے ہیں ان کے لئے ابھی کام کیجیے۔ طالب علم کی ذہنی بالیدگی کے جو بھی امکانات آپ کی تدریس میں ہیں انہیں فوراً .... فی الحال نمودار ہونا چاہیے۔ تعلیم کا سنہرا اصول تو یہی ہے مگر اس پر عمل بے حد مشکل ہے۔

اب اس میں دقت کیا ہے؟ دقت صرف اتنی ہے کہ کلیات کے ادراک، ذہنی میلانات اور داخلی تفصیلات میں پرمسرت دلچسپی کو صرف الفاظ کے ذریعے بیدار نہیں کیا جا سکتا۔ خواہ الفاظ کو کتنی ہی احتیاط سے کیوں نہ منتخب کیا گیا ہو؟ تدریس کا تجربہ رکھنے والے سب لوگ جانتے ہیں کہ تعلیم لمحہ بہ لمحہ، ساعت بہ ساعت اور روز بروز تدریجاً جزئیات پر قابو پانے کا صبر آزما سلسلۂ عمل ہے۔ علم کوئی ایسی منزل نہیں کہ اس کو چند کلی قاعدوں کی مدد سے بآسانی طے کیا جا سکتا ہو، گویا کہ کوئی سایہ دار اور ہموار شاہراہ ہے جس پر کوئی ٹہلتا ٹہلتا منزل پر پہنچ جائے گا۔ یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ جنگل کے نظارے میں خود جنگل کے درخت ہی مانع آتے ہیں۔ یہی دشواری تعلیم میں بھی پیش آتی ہے - تعلیم کی مشکل ہی یہ ہے کہ گویا اس میں طالب علم کو درختوں کے باوجود درختوں کے

واسطے سے جنگل کو دیکھنے کا اہل بنایا جاتا ہے۔

میں جو حل پیش کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ مضامین میں باہم جو مہلک قسم کی بے تکی پائی جاتی ہے، اس کا استیصال کیا جائے۔ کیونکہ یہ چیز ہمارے جدید نصابوں کی حیاتیت کو تباہ کئے دیتی ہے۔ تعلیم کے لئے فقط ایک ہی نصاب ہے اور وہ ہے... زندگی اپنے تمام مظاہر سمیت... اس کی بجائے ہم بچوں کے سامنے کیا رکھتے ہیں... الجبرا۔ جو محض بے نتیجہ چیز ہے، جیومیٹری جو بالکل بے معنی ہے، سائنس اور تاریخ جن کا مقصد ہی کوئی نہیں، یا چند ایک دو زبانیں جن پر کبھی عبور حاصل نہیں ہوتا اور ان میں سب سے افسوسناک شے ادب ہے جس کی نمائندگی شیکسپیئر کے ڈراموں سے ہوتی ہے۔ ان پر زبان و بیان سے متعلق کچھ حواشی ہوتے ہیں اور پلاٹ کا خاکہ اور کرداروں کا مختصر سا تجزیہ... ان سب چیزوں کا خلاصہ طالب علم کو یاد کرنا ہوتا ہے۔ کیا مضامین کی اس فہرست کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس زندگی کی ترجمانی کرتی ہے جسے صرف تجربۂ زیست سے سمجھا جا سکتا ہے، ایسی فہرست کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مضامین کا ایک ایسا سرسری اور چلتا سا خاکہ ہے جو اس لمحے میں کسی دیوتا کے ذہن میں آیا ہوگا۔ جب کہ پہلی مرتبہ دنیا کی تخلیق کا خیال اسے سوجھا اور ابھی اس کے منتشر اجزا کو یکجا کرنے کے سوال پر اس نے غور ہی نہ کیا ہو۔

تھوڑی دیر کے لئے پھر دوسرے درجہ کی مساوات کے سوال کو لیجئے۔ کیونکہ ابھی تک اس بات کا جواب نہیں دیا گیا کہ بچوں کو اس مساوات کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میری رائے میں جب تک دوسرے درجے کی مساوات کو کسی منظم نصاب سے مربوط نہ کیا جائے۔ اس وقت تک اس کی تدریس کے لئے کوئی جواز مہیا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں کلچر کے کسی مکمل نظام میں ریاضی کو کتنا ہی وسیع مقام کیوں نہ دیا جائے مجھے اس میں پھر بھی شبہ رہے گا کہ طلباء کی مختلف اقسام کے لئے دوسرے درجے کی مساوات کا سیکھنا کس حد تک برمحل ہے۔ یہ تو دراصل ریاضی میں تخصیص پیدا کرنے والوں کی ضرورت کی

بیز ہے۔ میں یہاں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ابھی تک میں نے تخصیص کی نفسیات یا تفصیلاً کے بارے میں کچھ نہیں کہا جو کسی بھی نصب العینی نظام تعلیم کا ایک لازمی جزو ہے لیکن اس موقع پر اس بارے میں اس سے زیادہ کچھ کہنا حقیقی سوال سے پہلو تہی کے مترادف ہوگا۔ میں نے اس کا ذکر یہاں صرف اس لئے کیا ہے کہ میرے اصل جواب سے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

دوسرے درجہ کی مساواتیں الجبرا کا ایک حصہ ہیں اور الجبرا وہ ذہنی آلہ ہے جس کی تخلیق زندگی کے مقداری پہلوؤں کی تصریح کے لئے عمل میں آئی ہے۔ زندگی تمامتر مقدار ہے۔ معقول بات کرنے کے معنی ہی مقدار میں بات کرنے کے ہیں۔ یہ کہنا بالکل مہمل ہے کہ فلاں قوم عظیم ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ کتنی عظیم ہے؟ اسی طرح یہ کہنا کہ ریڈیم کمیاب ہے بے معنی ہے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ کتنا کمیاب ہے؟ آپ کسی حال میں مقدار سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ آپ بھاگ کر شاعری اور موسیقی کی دنیا میں پہنچ جائیں۔ تو وہاں بھی آپ کو آہنگ اور سروں کی شکل میں مقدار اور تعداد کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایسے نازک دماغ جو مقدار کے تصور پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں نیم تربیت یافتہ ہی ہوتے ہیں۔ انہیں مورد الزام ٹھہرانے کی بجائے نظر ترحم سے دیکھنا چاہیئے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ بے معنی طومار جو ابتدائی عمر میں اسکول میں الجبرا کی صورت میں پڑھائے گئے تھے۔ تھوڑی سی کراہیت کے مستحق ضرور ہیں۔

کسی ایسے تصور کی موجودگی کے بغیر کہ ہم بچوں میں کون سی ذہنی صلاحیتیں بیدار کرنا چاہتے ہیں، الجبرا کا لفظاً وعملاً بگڑ کر بے معنی طومار کی صورت اختیار کر لینے کے واقعہ ہی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واضح طور پر جانے بغیر کہ ہم بچوں کے جیتے جاگتے ذہنوں میں کون سی خاص صلاحیتیں بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ تعلیمی اصلاح کی کوشش افسوسناک حد تک بے سود ہی ہوتی ہے۔

چند سال پہلے یہ شور و غوغا سنائی دیا تھا کہ اسکولوں میں الجبرا کا نصاب اصلاح طلب ہے، پھر اس بات پر اتفاق سا ہو گیا کہ گراف کے نفاذ سے سب ٹھیک ہو جائے گا

چنانچہ سب چیزوں کو خارج از نصاب کر کے گراف کو رائج کیا گیا۔ لیکن جہاں تک میں دیکھتا ہوں گراف کے نفاذ کے پیچھے کوئی تصور موجود نہ تھا چنانچہ اب ہر امتحان میں گراف پر ایک یا دو سوال ضرور ہوتے ہیں۔ میں ذاتی طور گراف کا پرجوش حامی ہوں لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اب تک ہمیں اس کا کوئی خاص فائدہ بھی پہنچا یا نہیں۔ آپ اس وقت تک کسی تعلیمی خاکے میں جان نہیں ڈال سکتے جب تک آپ عملاً یہ دکھا نہیں سکتے کہ اس کا بچوں کے شعور اور جذبے کے کن کن بنیادی حصوں سے رابطہ و تعلق ہے یہ بات درست سہی مگر ہے بھی .... اور اس کام کو آسان بنانے کا کوئی گر بھی مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ اس طرح کی معمولی صوری تبدیلیوں کے دوران میں ہم خود اشیاء کی ماہیت سے ہی مات کھا جاتے ہیں۔ ہمارا مقابلہ زیادہ ہوشیار حریف سے ہے اور اس میں ہر دفعہ ہار ہمیں ہی ہوگی۔

اصلاح کا آغاز نو دوسرے سرے سے کرنا چاہیئے سب سے پہلے تو ہمیں کرۂ ارض کے ان مقداری پہلوؤں کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوگا جو اس قدر آسان ہوں کہ انہیں عام تعلیم میں جاری کیا جائے۔ پھر الجبرا کے ایسے قاعدوں کی ایک جدول تیار ہو جن کا اطلاق مندرجہ بالا مسائل پر ہوسکے۔ ہمیں اپنے محبوب گرافوں کے بارے میں متشوش نہ ہونا چاہیئے کیونکہ جب ہم نے الجبرے کو دنیا کے سنجیدہ مطالعہ کا وسیلہ بنا لیا تو یہ گراف بڑی تعداد میں پھر بھی موجود رہیں گے۔ بعض آسان ترین صورتیں اس کی وہ ہوں گی جن میں ہم ان کے ذریعے انسانی سوسائٹی کے کوائف کا مقداروں کے پیمانے سے مطالعہ کریں گے اب تاریخ کو لیجیے، تاریخ کے موڑ ان خشک فہرستوں سے جو اسکولوں میں خشک مطالعہ کا بیشتر حصہ بنتی ہیں اور جن میں ناموں، سنوں اور تاریخوں کی بھرمار ہوتی ہے کہیں زیادہ معلومات افزا ہوتے ہیں، ایسی فہرست سے جس میں غیر ممتاز بادشاہوں اور ملکاؤں کا ذکر ہوتا ہے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ الف، ب، ج تو سب مر چکے اب ان کے گڑے مردے اکھاڑ کر ان میں جان ڈالنے کی کوشش سے کیا فائدہ ہوگا۔ اس زندگی میں حشر کے سے عام ہنگامے اٹھانے کی کوششیں اکثر ناکامی پر منتج ہوئی ہیں اس لئے ان کو اٹھا

رکھنا ہی مناسب ہوگا ۔ جدید انسانی سوسائٹی کے کوائف حیات کو مقدار کے پیمانے میں
پیش کرنا نسبتاً آسان کام ہے ۔ اس اثنا میں تصور تغیر مقدار IDEA OF THE VARIABLE
تفاعل (FUNCTION) شرح تغیر (RATE OF CHANGE) مساوات اور ان کے حل اور
حل استقاط (ELIMINATION) کا مطالعہ جبر رطور پر عملی مقصود کے پیش نظر جاری
رکھا جائے ۔ لیکن یقیناً ایسے پرشکوہ الفاظ ہی نہیں جن میں کہ میں ان کا ذکر کر رہا ہوں بلکہ
ان سادہ اور مخصوص حالتوں کی تکرار سے جو تمدلیب کے لئے مناسب ہوں ۔

اگر یہ طریق کار اختیار کیا جائے تو چاسر سے لے کر بلیک ڈیتھ[1] اور بلیک ڈیتھ
سے لے کر موجودہ دور کے صنعتی تنازعات تک واقعات کی ایک لڑی بن جاتی ہے ۔ اس
طرح قرون وسطیٰ کے زائرین کی کہانیوں کو الجبرے سے پیوند دے کر تعلیم کے مرکزی
موضوع یعنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا جا سکتا ہے . . . . میں یہ جانتا ہوں
کہ اس نقطہ پر پہنچ کر آپ میں سے اکثر اصحاب کے خیالات کیا ہیں ؟ آپ کا خیال
یہ ہے کہ جس خاص طریق کار کا خاکہ میں نے پیش کیا ہے ۔ یہ وہ طریق نہیں ہے جو آپ
منتخب کرتے یا جس پر عمل درآمد کی خاطر آپ نگاہ تک اٹھاتے ۔ مجھے پوری طرح
آپ سے اتفاق ہے ۔ میں اس بات کا مدعی نہیں کہ میں اس کام کو کر سکتا ہوں لیکن
آپ کا اعتراض بذاتِ خود اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ ایک عام "بیرونی امتحان"
تعلیم کے لئے واقعی مہلک ہے ۔ علم کے عملی اطلاق کی کامیابی کا مدار لازماً طالب علموں
کے کردار اور اساتذہ کی قابلیت پر ہوتا ہے . . . میں نے یہاں ان آسان ترین اطلاقات
کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ جن سے ہم آپ اچھی طرح واقف ہیں . . . . میری مراد
سائنس کی پوری مقداری شاخوں ، یعنی علم طبیعیات اور میکینکس سے ہے
اس سلسلے میں ہم سماجی اصول و مظاہر کے اعداد و شمار کا زمانے اور وقت

---

[1] بلیک ڈیتھ ۔ چودھویں صدی عیسوی میں طاعون کی وبا پھیلنے سے انگلستان کی آدھی آبادی تلف ہو گئی تھی جس کا
محنت کش طبقہ پر گہرا اثر پڑا ۔ اسی وقت سے جاگیرداری کا انحطاط شروع ہوا اور مزارعین آزاد ہوئے

سے ربط کرتے ہیں جو ہم موزوں جوڑوں کے درمیان زمان کو ساقط کر دیتے ہیں
اور اس امر کا اندازہ لگاتے ہیں کہ کہاں کہاں ہم علت و معلول کے حقیقی رشتے دکھا
سکے ہیں اور کس حد تک اٹکل پچو اندازے سے چلے ہیں .... ہم دیکھتے ہیں کہ ممکن ہے
ہم نے زمان کے مقابل اعداد و شمار کے ایک سلسلہ کو ایک ملک کے لئے رکھا ہو۔
اور اعداد و شمار کے ایک دوسرے سلسلے کو ایک دوسرے ملک کے لئے اور یوں موضوعوں
کے انتخاب کے ذریعہ ہم بعض ایسے گراف حاصل کر سکے جو یقینی طور پر باہم مطابق تھے
اور یہ بھی ہے کہ دوسرے گراف واضح طور پر علت و معلول کے رشتے کا اظہار کرتے ہوں۔
اب ہم حیران ہوتے ہیں کہ ان میں امتیاز کیونکر کیا جائے .... ایسے سلسلۂ عمل کو جہاں
تک چاہیں طول دے سکتے ہیں۔

لیکن اس بیان پر غور کرتے وقت میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ جس
چیز پر میں قبل ازیں اصرار کر چکا ہوں اسے ذہن میں رکھا جائے۔ سب سے پہلی
بات تو یہ ہے کہ بچوں کے تمام گروپوں کے لئے ایک ہی قسم کے افکار کا سلسلہ موزوں
نہیں رہے گا۔ مثال کے طور پر مجھے یہ توقع ہے کہ ہنرمند بچے اس سے زیادہ ٹھوس
اور نسبتاً تیز رفتار طریق کا مطالبہ کریں۔ جو کہ میں نے پیش کیا ہے، شاید میرا یہ
خیال غلط ہو، لیکن میرا یہی اندازہ ہے دوسری بات یہ ہے کہ میرے خیال میں
کوئی ایک ہی سبق یا استاد کا لیکچر ایسا نہیں ہو سکتا۔ جس سے لیکچر کو پسند
کرنے والی کلاس ایک ہی بار ہمیشہ کے لئے اتنی متاثر ہو کہ اس میں جوش پیدا
ہو سکے۔ نہیں صاحب، تعلیم کے یہ ڈھب نہیں! ایک عرصہ تک طالب علم
محنت سے مثالوں کو حل کرتے رہتے ہیں، گراف بناتے رہتے ہیں یا عملی تجربات
کرتے رہتے ہیں، تاآنکہ وہ مضمون پر کامل قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس عرصے میں
استاد کی طرف سے متفرق موقعوں پر جو ہدایات اور تصریحات انہیں ملتی ہیں
انہی سے تو بچوں کے خیالات کے رُخ متعین ہوتے ہیں۔ بہرحال بچوں کو یہ محسوس
کرانا ضروری ہے کہ وہ کچھ پڑھ رہے ہیں اور محض دماغی ورزش نہیں کر رہے!

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر آپ طالب علموں کو کسی عام امتحان کے لئے درس دے رہے ہیں تو ٹھوس تدریس کا سوال اور زیادہ پیچیدہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی کسی نارمن طرز تعمیر پہ بنے ہوئے محراب کے اردگرد بنا ہوا آرائشی حاشیہ دیکھا ہے.... پرانا کام حسین ہے مگر نیا بھدا.... اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید کام قطعی پیمائش کے مطابق ہے لیکن پرانے میں صناع کی شخصی لوالعجبیوں کے باعث ایک تنوع پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ ایک جگہ پہ تو اس میں ابھار ہے اور دوسری جگہ بناوٹ چپٹی چپٹی سی ہے۔ یہی حال نصابوں اور امتحانوں کا ہے۔ طلبا کو امتحانات میں کامیاب کر لینے کا گر یہ ہے کہ مضامین کے تمام حصوں کو مساوی درجہ دیا جائے لیکن نوع انسانی فطرتاً تخصیص پسند ہے۔ ایک انسان شے کو بحیثیت ایک کل کے دیکھتا ہے لیکن دوسرا فقط چند غیر متعلق سی مثالوں پہ نگاہ رکھتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک ایسے نصاب میں جو بالخصوص وسیع تربیت کے نقطۂ نظر سے اختیار کیا گیا ہو تخصیص کی بات، متضاد سی بات دکھائی دیتی ہے لیکن بغیر تضادات کے زندگی بہت سادہ ہوگی اور شاید بے رنگ بھی.... مجھے یقین ہے کہ تعلیم میں جہاں کہیں آپ تخصیص کو خارج کر دیں گے وہاں آپ گویا زندگی کو خارج کر دیں گے۔

اب ہم ریاضیات کی تعلیم کے سلسلہ میں ریاضی کے ایک اور عظیم شعبے یعنی جیومیٹری کو لیتے ہیں، وہاں بھی انہیں اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے، اس میں تدریس کا نظری پہلو نہایت واضح، ٹھوس، مختصر اور ضروری ہونا چاہیئے۔ ہر اس ہندسی مسئلے کو جو تصورات کے اہم ربط کو ظاہر کرنے کے لئے انتہائی اہم نہ ہو تدریس سے خارج کر دینا چاہیئے۔ لیکن تمام بنیادی تصورات کو برقرار رہنا چاہیئے۔ مماثلت اور تناسب کے تصورات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک جسم کے برای العین دکھائی دینے کے باعث جو مدد ملتی ہے، اس کے باعث جیومیٹری استدلال کی استقرائی صلاحیت میں بے نظیر ہے اور پھر اس کے

ساتھ ہی ہندسی ڈرائنگ بھی ہے جو ہاتھ اور آنکھ کی تربیت کرتی ہے۔

لیکن الجبرے کی طرح جیومیٹری اور ہندسی ڈرائنگ کو بھی جیومیٹری سے متعلق نظریات کی حدود سے آگے بڑھا کر وسعت دینا چاہیے۔ ایک صنعتی علاقے میں شینری اور ورکشاپ میں عملی کام وسعت کا ایک بے حد موزوں شکل ہے۔ مثال کے طور پر لنڈن کے پالی ٹیکنیکل صنعتی اداروں میں جہاں متعدد فنون کی تعلیم دی جاتی ہے، اس سلسلہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی جا چکی ہے، بیشتر ثانوی مدرسوں کے بارے میں میری تجویز یہ ہے کہ پیمائش اور نقشہ کشی قدرتی عملی صورتیں ہیں، بالخصوص تختۂ مسطح (PLANE TABLE) پیمائش تو ایسی چیز ہے جو طالب علموں کو جیومیٹری کے حقائق کے فوری اطلاق کے واضح ادراک تک پہنچا سکتا ہے، ڈرائنگ کے سادہ ساز و سامان سے یعنی ایک پیمائشی فیتے اور پیمائشی قطب نما کے ذریعے ایک میدان کی پیمائش کے طالب علموں میں ایک چھوٹے ضلع کا نقشہ کھینچنے کی استعداد پیدا ہو جانی چاہیے۔ بہترین تعلیم وہی ہے جو سادہ ترین ساز و سامان سے زیادہ سے زیادہ معلومات کے حصول میں مدد دے۔ آلات کے مکمل ترین سیٹ مہیا کرنے کے دستور کی زبردست مذمت کی جانی چاہیے۔ ایک چھوٹے سے ضلع کی نقشہ کشی اس کی سڑکوں، اس کی فصیلوں، اس کے معدنی خصائص، اس کے موسم اور دوسرے اضلاع کے ساتھ اس کے روابط اور ان کے باشندوں پر ان کے اثرات کے مطالعے سے تاریخ و جغرافیہ کا جو علم حاصل ہوگا۔ وہ اتنا وسیع ہوگا کہ اس کے آگے پرکن اور ادربک یا آیناتے بجرین کا علم فروتر ہوگا۔ میرا منشا اس موضوع پر ایک مبہم سی تقریر نہیں ہے بلکہ قدرے سنجیدگی سے یہ معلوم کرنا ہے۔ کہ صحیح نظری علم کو دے حقائق و واقعات کا یقینی علم کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے اس سلسلہ میں ریاضی کا ایک مسئلہ بطور مثال یوں ہوگا کہ فلاں میدان کی پیمائش کرو اور فلاں اسکیل سے اس کا خاکہ کھینچو اور اس کا رقبہ معلوم کرو۔ یہ عمل بتلائے بغیر جیومیٹری کے مسئلوں کی تدریس کا خاصا اچھا طریقہ ہوگا۔ نتیجۃً اس اثناء میں

ہمائش کے ساتھ ہی ساتھ ان مسئلوں کے حل بھی مل جائیں گے۔

خوش قسمتی سے عام تعلیم کی نسبت تخصیصی تعلیم کی مشکلات کم ہیں اور اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ اول تو یہ کہ دونوں صورتوں میں طریق کار کے متعدد پہلو ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ جن کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے۔ ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ تخصیص ذرا بلند درجے سے شروع ہوتی ہے یا اسے شروع ہونا چاہیئے۔ لہذا ایسے طلبا پر کام کرنا نسبتاً سہل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ذرا بڑی عمر کے اور قدرے تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ لیکن یقیناً سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ خصوصی مطالعہ بالعموم طالب علم کے ذوق سے مطابقت رکھتا ہے وہ اس کا مطالعہ اس لئے کرتا ہے کہ کسی نہ کسی وجہ سے وہ اس کا علم ضرور حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی سے عام اور تخصیصی تعلیم کا بنیادی فرق ظہور میں آتا ہے۔ عام تعلیم تو ذہنی مستعدی پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے لیکن تخصیص کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس ذہنی مستعدی سے کام لے۔ لیکن ان دونوں واضح متناقض طریقوں پر حد سے زیادہ زور دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ عام تعلیم کے دوران میں خصوصی دلچسپی درمیان ہی سے مرکز کی طرح آہستہ آہستہ ابھرتی آئے گی اور خصوصی مطالعہ کے وقت مرکزی مضمون آہستہ آہستہ پھیلتا جائے گا اور دائرہ نظر میں خود بخود وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔

پھر عام تعلیم اور خصوصی تعلیم کے لئے کوئی ایک خاص راستہ تو ہے نہیں کہ ایک تو عام تہذیب نفس کے لئے ہو اور دوسرا خصوصی معلومات کی خاطر ہو۔ عام تعلیم کے نقطۂ نظر سے بھی جن مضمونوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہ خصوصی مضامین ہی ہوتے ہیں جن کا مطالعہ کیا جاتا ہے (اگرچہ ان کا دائرہ محدود ہی رکھا جاتا ہے کیونکہ بیک وقت کئی مضامین پڑھائے جاتے ہیں) دوسری طرف عام ذہنی زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے کسی خاص شے کی لگن کو ایک وسیلہ بنایا جا سکتا ہے۔ آپ علم کو خالص مقصد یا محض تربیت ہے۔ تعلیم کا مقصد تو یہ ہے کہ وہ افکار کی قوت، ان کے حسن

ان کی ساخت کے حقیقی شعور کے ساتھ ہی ساتھ علم کی ایک ایسی خاص مقدار مہیا کرے جو منفرد طور پر اس علم کے جاننے والے کی زندگی سے بھی وابستہ ہو۔

افکار کی ساخت کی سمجھ مہذب ذہن کا ایک ایسا جوہر ہے جس کی نشو نما صرف خصوصی مطالعہ کے زیر اثر ہی ممکن ہے۔ میری مراد اس شاطرانہ انداز نگاہ سے ہے جو افکار کے مختلف سلسلوں کے باہمی اثرات کا بھی سراغ لگا سکے۔ اصولی افکار کو قطعی طور پر مرتب کرنے اور مرتب ہو چکنے کے بعد ان کے ربط باہم اور پھر شعور زندگی کے سلسلہ میں ان کی افادیت کا احساس صرف خصوصی مطالعہ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ وہی ذہن جس کی تربیت اس طریق پر ہوئی ہوا ایسا ہو سکتا ہے جو مجردات کا ادراک بھی کر سکتا ہوا اور متجرات کا بھی، اسی کی تربیت ہی اس طرح کی ہوئی ہوتی ہے کہ حقائق کا ادراک بھی کرلے اور واقعات کا تجزیہ بھی۔

بالآخر وہ سخت اور خشک قسم کی ذہنی استعداد بھی ابھرنی چاہیئے جس کا دوسرا نام میرے نزدیک ذوق اسلوب ہے یہ ایک جمالیاتی حس ہے جو در اصل اس جذبۂ تحسین سے ابھرتی ہے جو بیان کی بلاغت سے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے اسلوب فن، ادب، سائنس، منطق ہر عمل میں ہوتا ہے اور ہر جگہ جمالیاتی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ عبارت ہے قابلیت تعمیر اور اس میں چند پابندیوں کو ملحوظ رکھنے سے کسی مضمون کی محبت اور صرف اس مضمون کے لئے محبت، صرف عرصۂ خیال میں نیم خوابیدہ حالت میں لطف گل گشت کے مترادف نہیں ہے۔ اس مضمون کی سچی محبت کا اظہار، اسلوب کی محبت کی صورت ہی میں ہوتا ہے۔

اب ہم بحث کے اس نقطہ پر واپس آگئے ہیں۔ جہاں سے ہم نے ابتداء کی تھی یعنی تعلیم کی افادیت، اسلوب اپنے لطیف ترین معنی میں تربیت یافتہ ذہن کا آخری اکتساب ہے اور سب سے زیادہ کارآمد شے بھی یہی ہے یہ انسان کے رگ و ریشے میں سما جاتا ہے۔ ایسا عالم جو شعور اسلوب رکھتا ہو ہر قسم کے اسراف سے نفرت کرتا ہے اور وہ انجینئر جو اسلوب کا شعور رکھتا ہو، اپنے مسالے میں کفایت

بنتا ہے اور دستکار اپنی اس حس کی بدولت خوب صورت کام کو مقدم جانتا ہے
یعنی اسلوب اخلاقِ ذہنی کا منتہا ہے۔

لیکن اسلوب اور علم بالاتر، مبہم سی ایک اور شے بھی ہے جس طرح یونانی دیوتاؤں سے برتر ایک چیز تھی ..... مقدر ..... یہ شے ہے ..... قدرت ..... اسلوب اسی قدرت کو حسین شکل و صورت دینے کا نام ہے یا اس قدرت کو حدود اور سانچوں میں ڈھالنے کا نام ... مگر مطلوبہ مقصد کو پالینے کی قدرت (یا قوت) تو بہرحال بنیادی شے ہے، اولین چیز کو اس مقصود تک رسائی ہے اس لئے اسلوب کے بارے میں تردد کی ضرورت نہیں۔ اصل شے تو اپنے پیش نظر مسائل کو حل کرنے کی کوشش ہے۔ اس لئے آپ کو نگاہ اسی مقصد پر رکھنی چاہیے (اگر آپ حکیم ہیں تو) آپ خدا کے کاموں کی حکمت کی تشریح کئے جا ئیں۔ ایک حاکم ہیں تو اپنے زیر تصرف علاقے کی نگرانی میں منہمک ہیں ..... بہرحال جو کچھ بھی آپ کے پیش نظر ہے اچھی طرح دل لگا کر کئے جائیں (اسلوب کی پروا نہ کریں) اسلوب تو خود بخود پیدا ہو ہی جائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ اسلوب کہاں کام آتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلوب کے ذریعے مقصد کو اِدھر اُدھر باتوں میں الجھنے اور ناپسندیدہ تحریکات کو اٹھائے بغیر حاصل کر لیا جاتا ہے۔ اسلوب کے ذریعے آپ اپنا مقصود اور صرف مقصود ہی حاصل کرتے ہیں۔ اسلوب کی موجودگی میں آپ کے کام کی تاثیر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور پیش بینی وہ انتہائی قیمتی تحفہ ہے جو قدرت نے انسان کو ارزانی کیا ہے اسلوب کی موجودگی میں آپ کی قوتِ اظہار میں اضافہ ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ کا ذہن غیر متعلق مسائل سے پریشان نہیں ہوتا اور اپنے مقصود کو حاصل کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن اسلوب تو صرف ایک ماہر فن کا حصہ ہوتا ہے۔ کیا کبھی کسی نے کسی نوآموز مصور یا متشاعر کے اسلوب کے بارے میں کبھی کچھ سنا ہے۔ اسلوب ہمیشہ محض شوقیہ خصوصی مطالعہ ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی یہ تخصص کا عجیب و غریب

اور خاص تحفہ ہے، شائستگی و تہذیب کے نام۔

موجودہ حالت میں ہماری تعلیم میں کسی واضح مقصد کا فقدان ہے اس کی خارجی مشینری اس کی اندرونی روح کو تباہ کر رہی ہے۔ اس خطبے میں میں نے اب تک ان مقاصد کا جائزہ لیا ہے، جن کے تحت تعلیم کو چلانا چاہیئے۔ اس اعتبار سے ہماری تعلیم دو طرح کے نظریات کے درمیان معلق ہے۔ اس نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ اسے ماہرین فن پیدا کرنے ہیں یا شوقین کاریگر... دنیا بھر میں ۱۹ ویں صدی میں جو گہری تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے علم سے بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ شوقیہ کاروز بنیادی طور پر وہ انسان ہوتا ہے جس میں ذوق اور صلاحیت تو ہوتی ہے اور جو عموماً روز مرہ میں لکیر کا فقیر بننے کی اور ہر فن مولا ہونے کی فراواں استعداد کا مالک ہوتا ہے لیکن اس میں ایک ماہر فن کی بصیرت مفقود ہوتی ہے اور خصوصی علم کا فیضان ہوتا ہے۔ اس خطبے کا مقصد یہ بتانا تھا کہ شوقیہ کاروز کی بنیادی خوبیوں کے زیاں کے بغیر ماہرین فن کس طرح پیدا کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ثانوی مدرسوں کی مشینری میں جہاں لچک ہونی چاہیئے وہاں تو سختی ہے اور جہاں سختی ہونی چاہیئے وہاں ڈھیلا پن پایا جاتا ہے۔ ہر مدرسہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے اس امر پر مجبور ہے کہ وہ اپنے بچوں کو معینہ امتحانات کے لئے تیار کرے۔ کسی ہیڈ ماسٹر کو اتنی آزادی میسر نہیں ہے کہ وہ عام تعلیم یا خصوصی مطالعہ کے لئے مدرسہ میں مہیا شدہ سہولتوں یعنی اپنے اساتذہ کی قابلیتوں یا طلبا کی لیاقتوں یا پھر اس مدرسے کے مالی حالات اور اس کے ماحول کے مطابق اپنے مدرسے کو چلائے۔ میری رائے میں بیرونی امتحانات کا کوئی بھی نظام ہو، اگر اس بنیادی غایت طالب علموں کا فرداً فرداً امتحان ہے تو اس سے سوائے تعلیمی زیاں کے اور کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا۔

بنیادی طور پر معائنہ مدرسوں کا ہونا چاہیئے نہ کہ طالب علموں کا۔ ہر مدرسہ اپنے نصاب تعلیم کی بنیاد پر اپنے طلبا کو فارغ التحصیل ہونے کی اسناد خود دینا چاہیئے

[illegible] مدرسے کے معیار تعلیم کو معین اور درست کرنا چاہیئے۔ کیونکہ نظام تعلیم کی اولیت
[illegible] یہ ہے کہ ہر مدرسہ ایک یونٹ ہو جس کا منظور شدہ نصاب تعلیم اس کی
[illegible] ضروریات کے مطابق ہو اور اس کے اپنے استادوں نے اس کی تشکیل کی ہو۔
[illegible] اگر ہم ایسا کرنے میں ناکام رہتے تو ہم ایک طرح کی رسم پرستی سے نکل کر ایک
دوسری قسم کی رسم پرستی کا شکار ہو جائیں گے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جامد [illegible]
کے ایک لایعنی طریقے سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتے جائیں گے اور بس۔

[illegible] جب میں نے یہ کہا کہ کسی قومی نظام تعلیم میں جس کا مقصد قابلیت
[illegible] مدرسے کو ایک یونٹ بن جانا چاہیئے تو یہ بات میں نے اس
[illegible] کے مقابلے میں کہی ہے جس میں خارجی امتحان کے ذریعے ہر بچے کا فرداً فرداً
[illegible] لیکن یہ یاد رہے کہ تصویر کے عموماً دو رخ ہوتے ہیں۔ ہر اچھے نظام
[illegible] پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً مدرسہ یونٹ بھی بن جائے تو اس میں
[illegible] اتنی ہی مہلک ہوں گی۔ مثلاً اگر ہم ایسے نگران محکمے کے تحت
[illegible] جو یہ سمجھتا ہو کہ تمام مدرسوں کو سختی سے دو یا تین قسموں میں تقسیم
[illegible] ہر ایک قسم کو ایک کڑا نصاب تعلیم اختیار کرنے پر مجبور
[illegible] بھی تو مہلک ہی ہے۔ جب میں مدرسے کو یونٹ قرار دیتا ہوں
[illegible] ایک یونٹ ہی سمجھتا ہوں۔ جس میں نہ کمی کی جا سکتی
[illegible] یہ حق پہنچتا ہے کہ اسے اس کے مخصوص حالات کے تحت ہو
[illegible] مدرسوں کو مختلف انواع میں تقسیم کر دینا بعض خاص مقاصد
[illegible] لیکن اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ کسی مدرسے
[illegible] کا نصاب رائج ہو جس میں اس مدرسے کے اساتذہ
[illegible] اصول کا اطلاق یونیورسٹیوں اور ٹیکنیکل کالجوں پر بھی

[illegible] کے نوجوانوں کی تعلیم کے سوال کی بیحد اہمیت پر غور کرتے ہوئے

شکستہ زندگیوں۔ ٹوٹی پھوٹی آرزوؤں اور قومی ناکامیوں پر نگاہ جاتی ہے جو اس خفتہ انگیز جمود کا نتیجہ ہوتی ہیں جو اس پر مسلط کر دیا جاتا ہے تو انسان اپنے اندر جذبات غیظ و غضب کو بمشکل ہی دبا سکتا ہے۔ زندگی میں ضبط و نظم ہی سب کچھ ہے اور وہ نسل جو تربیت یافتہ ذہانت کی وقعت کو نہیں پہچانتی۔ گویا تباہی کے موڑ پر کھڑی ہے، آپ کی ساری اولالعزمیاں آپ کی ساری مجلسی شائستگی، آپ کی تمام نکتہ آفرینیاں اور بحر و بر پہ آپ کے تمام تصرفات آنے والی گھڑی کو ٹال نہیں سکتے۔ آج ہم نے آپ کو ذرا سا سنبھالا۔ کل سائنس ایک قدم اور آگے بڑھا چکی ہوگی اور پھر بے تعلیم لوگوں کے بارے میں تقدیر کا جو فیصلہ ہوگا اس کے خلاف کسی اپیل کی سماعت نہ ہو سکے گی۔

تعلیم میں ہمیں اس پرانی غایت سے کم کسی چیز پر جو ہر عہد میں تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ رضامند نہ ہونا چاہیئے، وہ غایت یہ ہے کہ تعلیم کی روح مذہبی ہونی چاہیئے۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ مذہبی تعلیم کیا ہے؟

مذہبی تعلیم وہ تعلیم ہے جو انسان میں احساس فرض اور تقدس پیدا کرتی ہے۔ احساسِ فرض حالات پر مضبوطی سے حاوی ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ جہاں قابل تحصیل علم حالات کو بدل سکتا ہو۔ وہاں جہالت ایک بدی ہوتی ہے اور تقدس کی اساس اس تصور پر ہے کہ وجود کل حال و مستقبل زمان کی تمام پہنائی جسے ابدیت کہہ دینا چاہیئے عہد حاضر ہی میں موجود ہے۔

غیر فنی تعلیم، وسیلۂ شعورِ قومیت

نئی تعلیمی پالیسی کی روشنی میں غیر فنی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بامعنی اور بامقصد بنانے کی خاطر تحقیقی و ترقیاتی مرکز برائے نصاب تعلیم، محکمۂ تعلیم پنجاب نے ماہرین تعلیم اور مختلف درجوں کے اساتذہ پر مشتمل ایک سب کمیٹی تشکیل دی ہے۔ اس سب کمیٹی نے اس سوال پر غور و فکر کیا ہے کہ غیر فنی تعلیم پاکستانی قومیت کے شعور کو نئی نسل کے دل و دماغ میں راسخ کرنے کا مؤثر ترین وسیلہ کیسے بن سکتی ہے؟ اس غور و فکر کے نتائج مختصراً درج ذیل ہیں۔

غیر فنی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ بچے کی تمام تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما اس انداز میں ہو کہ وہ بڑا ہو کر ایک انسان اور سچا پاکستانی بن سکے۔ ایک اچھا کاریگر، اچھا ڈاکٹر، اچھا انجینئر اور اچھا سائنسدان ہونے سے پہلے وہ سچا پاکستانی اور اچھا انسان ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر شروع ہی سے نظریۂ پاکستان اور پاکستانی قوم کی وحدت اور عظمت کے بنیادی تصورات نصاب تعلیم کا جزو ہونے چاہئیں۔

اس سلسلے میں یہ بات زیر بحث آئی کہ نظریۂ پاکستان کا تعین کیسے کیا جائے۔ رجعت پسند

نظریۂ پاکستان کی تاویل اپنے زوال زدہ تصورات کی روشنی میں کرتے ہیں اور ترقی پسند اپنے انداز میں۔
پھر کون سا نظریۂ پاکستان تعلیم کا جزو بنایا جائے؟ خاصی بحث وتمحیص کے بعد طے پایا کہ ہمیں صرف
جدید اور ترقی پسند نقطۂ نظر کو اپنانا چاہیے۔ قیام پاکستان سے پہلے تحریک پاکستان کے مجاہدین مسلم
قومیت پر اصرار کر رہے تھے۔ ان کے مخالف رجعت پسند علما اور مسلمان متحدہ ہندی قومیت کے
علم بردار تھے جدید اور ترقی پسند مسلمانوں کی مسلم قومیت کا تصور غالب آگیا۔ اور پاکستان قائم ہوا۔ یہی مسلم
قومیت، پاکستانی قومیت کی اساس ہے قیام پاکستان کے بعد ہندی قومیت کے حامی رجعت پسند
مسلمان بھی پاکستان میں ہجرت کر آئے۔ اب یہ لوگ جو صدیوں پرانے زوال زدہ تصورات پر جمے
اور ڈٹے ہوئے ہیں۔ پاکستانی قومیت اور نظریۂ پاکستان کی اپنی ذاتی اور طبقاتی تفسیر پیش کرتے
ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر قبول کرنا گویا پاکستانی قومیت میں ہندی قومیت کی ملاوٹ کرنا ہے ایسا نظریہ

نظریۂ پاکستان کے سلسلہ میں ترمیم پسندی (REVISIONISM) ہے نظریۂ پاکستان
وہی ہے جو اقبال اور قائداعظم جیسے جدید اور ترقی پسند مسلمانوں کی فکر سے اور عوام کی انقلابی
جدوجہد سے برآمد ہوتا ہے۔ آج ہمیں صرف اس نظریۂ پاکستان کو اپنی نئی نسل کے دل ودماغ میں
جاگزیں کرنا ہے۔ تدامت پسندوں کی کوئی تاویل قابل قبول نہ ہونی چاہیئے۔
ابتدائی تعلیم کے زمانے میں بچے کی عمر جذبات کی تربیت کی عمر ہوتی ہے
اس زمانے میں بچے کی جذباتی تربیت پر زور دینا ہوگا۔ مگر جذباتی تربیت ایسے انداز میں ہونی
چاہیئے کہ بچے کو زندگی میں عقل اور تجربے کی اہمیت کا احساس شروع ہی سے ہو جائے
اور وہ عقلیت پسندی اور ترقی پسندی کی راہوں پر گامزن ہو جائے۔ اپیل بے شک جذبات
کو ہو مگر جواب عقل کو دی جائے تاکہ زندگی کے بارے سائنسی نقطۂ نظر پروان چڑھ سکے۔ بچے کو
بڑے ہو کر جس دنیا میں کاروبار حیات کا بوجھ سنبھالنا ہے۔ وہاں سائنٹفک نقطۂ نظر کی بالادستی
ہے۔

زبان پر خصوصیت سے توجہ دینی چاہیئے۔ تیسری جماعت تک صرف اردو پڑھائی جائے
مگر یہ خالصتاً کتابی اردو نہ ہونی چاہیئے اردو کو زندہ اور ترقی پذیر زبان سمجھ کر پڑھانا ہوگا۔ ایک

اسی زبان ماں کرجس کی آئندہ ترقی کا انحصار پاکستان کے مختلف علاقوں کے عوام پر ہے وہیں
ایسی اردو میں بچے کو تعلیم دینا ہے۔ جو پاکستان کی علاقائی زبانوں سے قریب تر ہو۔ قدیم
محاورات اور روزمرہ پر زور دینے کی بجائے عوامی اردو کو رائج کرنا ہوگا۔ اسی زندہ عوامی اردو
میں بچے کو توہماتی اور طلسماتی کہانیوں کی بجائے حقیقت سے لبریز ایسی کہانیاں پڑھائی جائیں جو
اس کے اندر جستجو اور تجسس کا ذوق پیدا کریں اور ایک ایسا وسیع انسانی نقطۂ نظر پیدا کریں کہ
وہ پاکستانی قومیت کے جذبے سے سرشار ہونے کے باوجود باہر کی دنیا میں بسنے والے انسانوں
سے ہمدردی اور محبت کر سکے اور ان کے علمی اور سائنسی تجربات سے استفادہ کرنا اپنا قومی
اور انسانی فرض سمجھے۔

بچوں کو نیکی اور بدی کا تصور بھی نئے سیاق و سباق میں پیش کرنا چاہیئے۔ جاگیرداری
اور شہنشاہیت کے عہد کا نیکی اور بدی کا تصور اب متروک قرار پا جانا چاہیے۔ نیکی اور بدی کو
انفرادی سے زیادہ اجتماعی پس منظر میں پیش کرنا چاہیئے۔ مثلاً دوسروں کا حق مارنا اور استحصال کے
مختلف و متنوع انداز بدی کی صورت میں اور محنت، حق گوئی، بے باکی کو نیکی کی صورت میں پیش کرنا
چاہیئے۔ معاشرتی اور اجتماعی برائیوں سے نفرت کو نمایاں کرنا چاہیئے۔

اسلام اور سوشلزم ہر دو نظام اجتماعیت پر زور دیتے ہیں مگر ہمارے نظام تعلیم میں
پہلے کے زمانے سے ہی اجتماعیت کی نفی پر زور دیا جاتا رہا ہے طالب علموں میں شروع ہی سے
مقابلے اور مسابقت کا جذبہ پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ غلط ہے اس کی بجائے آغاز کار میں ہی بچوں
میں باہمی تعاون اور اجتماعی انداز نظر پیدا کرنے پر توجہ دینی چاہیئے۔ انہیں شروع ہی سے یہ سکھانا
چاہیئے کہ وہ تنہا ہوں سے نکل کر انہوں نے مل جل کر ایک نئے، ترقی پسند اور مضبوط پاکستان
کی تعمیر کرنا ہے تعاون اور اجتماعیت کا یہ فریضہ ابتدائی مدرسوں سے ہی شروع ہو جانا چاہیئے

اسلام نے وحی کے بعد انسانی تاریخ کو علم کا سب سے بڑا سرچشمہ قرار دیا ہے
اس لئے تاریخ کے مطالعے کی طرف ابتدا ہی سے توجہ دینی چاہیئے۔ ہمارے مخصوص قومی تقاضوں
کے پیش نظر بھی تاریخ کا مطالعہ قومیت اور قومی وحدت کے شعور کے لئے بہت ضروری

ہے مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں تاریخ لکھنے اور پڑھانے کا ڈھنگ ابھی وہی شہنشاہیت اور جاگیرداری عہد سے آگے نہیں بڑھا۔ تاریخ کو جدید قومی اور سائنسی تقاضوں کے مطابق پڑھانا چاہیئے۔ بادشاہوں اور ان کی فتوحات سے زیادہ صوفیوں اور عالموں کی انقلابی جدوجہد، اقتصادی اور عوامی تحریکوں کے تجزیاتی مطالعے کے ساتھ ساتھ برصغیر میں مسلم قومیت کے عروج اور استحکام پر زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ تاریخ کو اس طرح پیش کیا جائے کہ پڑھنے والا انتشار کا شکار نہ ہو جائے۔ بلکہ وہ وقت کے مسلسل بہاؤ سے آشنا ہو کر اپنے ماضی کو اپنی ذات میں جذب کر کے مستقبل کی طرف اعتماد کے ساتھ بڑھ سکے۔ تاریخ ایک خاص جغرافیے پر پیدا ہوتی ہے اس لئے جغرافیہ کو تاریخ کے ساتھ ساتھ پڑھانا چاہیئے۔ اور اس انداز میں طالب علم ملک کے مختلف صوبوں میں بسنے والے لوگوں کی مشترک تاریخی، اقتصادی اور تہذیبی جدوجہد سے آشنا ہو کر ملکی وحدت کا تصور قائم کر سکے اور جان سکے کہ مشترک تعاون اور مشترک مقاصد کے حصول کی جدوجہد کس طرح نئی قومی تاریخ کو جنم دے رہی ہے۔ تاریخ اور جغرافیہ پڑھانے کا انداز یہ ہونا چاہیئے کہ بچہ بالترتیب :۔

پنجاب پاکستان، برصغیر کے مسلمانوں کی انقلابی سرگزشت پھر پوری تاریخ اسلام جس میں اسلامی تہذیب کے نشوونما کو مرکزیت دی جائے اور اس کے بعد دنیائے اسلام سے باہر کی انسانی تاریخ سے رابطہ قائم کرے۔

سب کمیٹی کے بعض اراکین مثلاً پروفیسر محمد عثمان اور جناب علاؤالدین اختر نے معاشرتی علوم کے مضمون سے اختلاف کیا۔ انہوں نے لفظ "معاشرتی علوم" کو بچے کے لئے مشکل اور جناتی قرار دیا جائے اور اس پر اصرار کیا کہ اسے تاریخ اور جغرافیہ کا پرانا نام دیا جائے۔ ہاں یہ ضرور ہو کہ ان مضامین کو نئے انداز میں پڑھایا جائے۔ مثلاً تاریخ میں سیاسیات اور جغرافیہ میں اقتصادی ترقی سے جغرافیائی حسن کے نکھار کا علم بھی شامل ہونا چاہیئے۔ اسی طرح "مطالعہ پاکستان" کی افادیت بھی مشکوک ہے۔ اسے بھی تاریخ اور جغرافیہ کا جزو ہونا چاہیئے۔ الگ سے پڑھانا بیکار ہے۔ سب کمیٹی کے اراکین میں یہ احساس عام ہے کہ نصابی کتابیں لکھوانے میں احتیاط نہیں کی جاتی جو صاحب مصنف نہ ہوں انہیں کسی صورت میں بھی نصابی کتاب کی تیاری میں شریک

ب ہونا چاہیئے۔ تحقیقی مصنفوں سے رابطہ قائم کرنا چاہیئے۔ ہمارے ہاں نصابی کتابیں ترتیب دی جاتی ہیں۔ اسی طرح کتاب میں جو تحریریں اکٹھی کر دی جاتی ہیں وہ بالعموم بچوں کے لئے نہیں لکھی گئی ہوتیں سوائے عاری ہوتی ہیں۔ کتابیں لکھوائی جانی چاہئیں اور کم از کم نویں دسویں جماعت کی اردو میں کوئی مستقل تصنیف ضرور شامل نصاب ہو۔

اردو کا ادبی انتخاب کرتے وقت زبان و بیان کی نفاستوں سے زیادہ خیال کی اہمیت مدنظر رہنی چاہیئے۔ اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں تخلیق کئے جانے والے ادب کو زیادہ نمائندگی ملنی چاہیئے۔ ہمعصر زندگی سے بچوں کو روشناس کرانے کے لئے ہم عصر ادب پڑھانا بہت ضروری ہے۔ حسن اتفاق سے جدید ادب عقلیت، ترقی پسندی اور عوامیت کا ترجمان ہے جس لئے اس کا مطالعہ اور بھی زیادہ مفید ہے۔

پچھلے پچیس برس میں ہمارے نصاب میں جدید ادب کو اس کی ترقی پسند اور عوامی روح کی وجہ سے ہی نصاب سے دور رکھا گیا ہے۔ اور تخلیقی لکھنے والوں سے نصابی کتابیں عمداً بچائی گئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارا ہر ادبی نصاب اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے انداز نظر کا حامل ہے بیسویں اور اکیسویں صدی کے انداز نظر کی جھلک ہمارے جس جدید ادب میں موجود ہے اسے نصاب میں جگہ ملنی چاہیئے۔ تاکہ طالب علم نئے شعور اور نئی عوامی اردو کے حسن سے متاثر ہو سکیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں یورپ کے ساتھ ساتھ چین اور روس کے تجربات سے بھی بیش از بیش استفادہ کرنا چاہیئے۔ انقلاب سے پہلے ہر دو ممالک کے حالات ویسے ہی تھے جیسے آج ہمارے ہیں۔ پھر ان ملکوں نے تعلیمی تعمیر نو سے اپنی اقتصادی پس ماندگی دور کی۔ اور اپنے سیاسی نصب العین پر قائم رہتے ہوئے بہت جلد دنیا کے صف اول کے ترقی یافتہ ملک بن گئے۔ ہم بھی ایک نظریاتی مملکت ہیں ہمیں ان ممالک سے سیکھنا ہے کہ آئیڈیالوجی کو تعلیم کا جزو کیسے بنایا جائے۔ اور ہم کس طرح اقتصادی تباہی کے ملبے سے نکل کر اقتصادی ترقی کا مینار نور کیسے تعمیر کریں۔

ہمیں چند ایسے تصورات کی ترویج کرنا ہے جن پر سب متفق ہیں مثلاً اسلام کے چند

تصورات لیجیے ۔ توحید، مساوات، عدل و احسان، رواداری اور علمی تجسس، اسی طرح اقبال کے چند تصورات لیجیے ۔ خودی، حرکت و عمل مسلسل، ارتقا پھر قائداعظم کے چند بنیادی تصورات دیکھیے اتحاد، تنظیم، یقین محکم اور پیہم محنت اور استقلال ـــــــ ان تصورات سے کیسے اختلاف ہوگا۔ ان تصورات سے تعلیمی مقاصد اخذ کرکے انہیں تعلیم کے مختلف درجوں میں نصاب سازی کے رہنما اصولوں کا درجہ دیا جانا چاہیے۔ اور ان تعلیمی مقاصد کو ایک قطعی چارٹ کی صورت میں پیش کیا جانا چاہیے ۔

قومی یکجہتی، ثقافتی و لسانی ادارے

جس طرح معاشرتی اور سماجی زندگی میں فرد اپنے تشخص و کردار کا آزادانہ اظہار کرنے کے باوجود جماعت سے الگ رہ کر اور اجتماع سے کٹ کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جماعت بھی افراد کے اشتراک و تعاون سے وجود میں آتی ہے۔ آزادیٔ آرا اور کثرتِ آرا کے تصادم سے ایک ایسی کلا نمایاں ہوتی ہے۔ جو افہام و تفہیم کی بنیادوں پر جماعتی یک جہتی کی علامت بن جاتی ہے چونکہ ادب زندگی ہی کا آئینہ دار ہوتا ہے لہٰذا سماجی سطح پر فرد اور جماعت کی آزادی اور یک جہتی کی طرح ادب میں بھی کل اور جزو کا رشتہ وحدت فی الکثرت کا علمبردار بن کر ابھرتا ہے، ادیب اور فنکار جہاں داخلی سطح پر اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے۔ وہاں خارجی طور پر اس کی ذات کا رشتہ کائنات کے تنوع اور رنگا رنگی سے بھی جڑا ہوا ہوتا ہے۔ یوں ادیب و فنکار اپنی وحدت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی کثرت کا جزو لاینفک بن جاتا ہے۔ جزو اور کل داخلیت اور خارجیت ذات اور کائنات اس نقطۂ اتصال پر یوں یک جان اور ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ انفرادیت اور اجتماعیت کی داخلی اور خارجی سطحوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس نقطۂ اتصال پر ادب اور معاشرہ اپنی اپنی اکائی اور وحدت کو برقرار رکھنے کے باوجود کثرت سے ہم آمیز و ہم آہنگ ہو کر قومی یک جہتی کا ترجمان بن جاتا ہے۔

ان معروضات کی روشنی میں قومی یک جہتی کے مسئلے کو دو سطحوں پر سمجھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اولاً پاکستان کے علاقائی ادبوں اور تہذیبوں کی انفرادیت اور اجتماعات کے حوالے سے اور ثانیاً اس زاویے سے کہ ہماری ادبی و ثقافتی انجمنیں اس مسئلے کے ان دونوں پہلوؤں کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں اور اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔

شعبۂ ادب و ثقافت کی حد تک اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ پاکستان کے تمام صوبوں میں نہ صرف قومی یک جہتی کا احساس موجود ہے۔ بلکہ آزمائش کے لمحوں میں اس قومی خلوص کا اظہار عملی صورت میں بھی ہوتا رہا ہے اس کا ثبوت ملکی اور بین الاقوامی سطحوں پر اولاً جدوجہد آزادی کی تحریک اور حصول پاکستان اور ثانیاً ۱۹۶۵ء کی کامیاب دفاعی جنگ کی صورت میں فراہم ہو چکا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ پاکستان کی قومی اور علاقائی زبانوں کے ادیب و فنکار بیک وقت اگر ایک طرف حصول وطن کے لئے قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے تو دوسری طرف دفاع وطن کے لئے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بھی بن گئے تھے۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ قومی یک جہتی کی ان واضح تاریخی مثالوں کے باوجود ہمیں ۱۹۷۱ء کے سانحے سے دوچار ہونا پڑا۔ اور ہمارے وطن عزیز کے ساتھ ساتھ ہمارے دل بھی دو نیم ہو گئے۔ آج ہم حال کے نقطے پر کھڑے ہو کر پاکستان کے علاقائی ادبی و تخلیقی ورثوں اور تہذیبوں کے درمیان بڑھتی ہوئی حد فاصل دیکھتے ہیں تو پہلے سے کہیں زیادہ قومی یک جہتی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ تاکہ ہم موجودہ ادبی و تہذیبی زوال کی اندھی گپھوں سے نکل کر اتحاد و یگانگت کی روشنی اور تر و تازہ فضا میں سانس لے سکیں۔ اس صورت حال کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت اس لئے بھی محسوس ہو رہی ہے کہ حصول منزل کے بعد پچھلے تیس سال میں ہماری ادبی و ثقافتی انجمنیں قومی یک جہتی کے فروغ میں اکثر مزاحم ہوتی رہی ہیں۔

دراصل ادبی و ثقافتی انجمنیں کسی ملک کی متعدد زبانوں اور متنوع و الگ تہذیبوں کے

باہمی عملی رابطہ کی بنیادیں فراہم کرتی ہیں۔ رواں دواں زندگی کی حرکت و حرارت میں فضائے کے ساتھ ساتھ ادب و ثقافت کے چمن زاروں میں نت نئے پھول کھلتے رہتے ہیں۔ ہر آنے والی بہار گزری ہوئی بہار سے زیادہ حسین اور دلکش ہوتی ہے۔ ادبی و ثقافتی انجمنوں کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ اس بہار کو حسین تر بنانے اور قریب تر لانے کے لئے مسلسل عملی رابطہ کی فضا استوار کرتی ہیں اور یہ نصب العین اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے یہ خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے، جب ادبی و ثقافتی انجمنوں کے رگ و ریشے اور قد و قامت میں لگاتار خون گرم کی نمود ہوتی رہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری ادبی و ثقافتی انجمنوں نے بعض اعتبار سے قومی یکجہتی کے فروغ اور ترویج و ترقی میں نمایاں کردار بھی ادا کیا ہے اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو پاکستان، انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان، پاکستان رائٹرز گلڈ۔ پاکستان نیشنل سنٹر۔ اکادمی ادبیات پاکستان اور دوسرے متعدد ملکی اور علاقائی ادبی و ثقافتی اداروں کی کاوشیں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ تاہم آئندہ لائحہ عمل مرتب کرنے اور منزل کی طرف تیزی سے پیش قدمی کرنے کے لئے ادبی و ثقافتی انجمنوں کی تشکیل، ان کے طریقہ کار اور عملی کردار کا تجزیہ کرنا از بس ضروری ہے کہ اداروں کے محاسن کے باوصف ان میں ایسی خامیاں اور پیچیدگیاں بھی موجود رہی ہیں جن سے قومی یکجہتی کے فروغ کو مسلسل صدمہ پہنچتا رہا ہے۔

انسان کے ارتقاء کی ثقافتی تاریخ شاہد ہے کہ ادب، زبانیں اور تہذیبیں مغائرت اور منازعت کی بنیادوں پر نہیں بلکہ ہمیشہ اشتراک و موانست کے رویے سے ایک دوسرے سے اخذ و نفوذ کرتی رہی ہیں۔ جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ وحدتیں ہمیشہ کثرت میں ضم ہو کر خود بھی مستفید ہوتی رہی ہیں اور کثرت کو بھی نقش و نور بناتی رہی ہیں چونکہ ادبی و ثقافتی انجمنیں زبانوں، ادبوں اور تہذیبوں کے حسن کارکردگی میں عملی رابطہ کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ اس لئے ادبی و ثقافتی اداروں کو بھی اشتراک و تعاون اور خلوص و موانست کی بنیادوں پر منظم کرنا بے حد ضروری ہے کہ اس رویے اور انداز نظر سے راستوں کے کانٹے ہٹا کر تیزی کے ساتھ منزل کو حاصل سفر بنایا جا سکتا ہے

پھر ادبی و ثقافتی انجمنوں کی تشکیل نو میں خونِ تازہ کی نمو اس صورت میں ممکن ہے کہ اداروں کی زمام ان ہاتھوں میں دی جائے جو بیشک منصب اور عہدے کے لحاظ سے بڑی بڑی کرسیوں پر متمکن نہوں مگر تہذیب و ادب اور تخلیق و فن کے گلزاروں کو وہ جوہر منتقل کر سکتے ہیں جن کے بغیر زمین ظاہری نمو کے باوجود روحانی طور پر بانجھ ہو جایا کرتی ہیں۔

پاکستان کے علاقائی ادبوں اور تہذیبوں کے مابین یک جہتی کو پروان چڑھانے کے لیے ادبی و ثقافتی انجمنیں اردو زبان سے بیش از بیش کام لے سکتی ہیں، لیکن شرطِ اول یہی ہے کہ قومی ہم آہنگی کے نصب العین کی بارآوری کے لئے اردو زبان اور علاقائی زبانوں کے مابین رویہ افتراق کے بجائے اشتراک اور منافرت کے بجائے موانست کا ہو۔ اور جذباتی پراگندگی کے بجائے توازنِ فکر و نظر کی فضا استوار کی جائے۔ یہ فضا ایسی صورت میں سازگار بنائی جا سکتی ہے کہ ادبی و ثقافتی ادارے اردو زبان و ادب کے دوش بدوش علاقائی زبانوں اور ادبیات کو آزادانہ نشوونما کے ساتھ کو ہموار کریں۔ خود رو پھولوں کی طرح وہ ادب اور ادیب پھل پھولنے کے پورے پورے مواقع بہم پہنچائیں۔ اردو قومی زبان کی حیثیت سے بھی اور علاقائی زبانوں اور اداروں کے مابین تراجم کے ذریعے مستقل عملی رابطے کے طور پر بھی نہ صرف علاقائی ادبیات اور تہذیبوں کو ایک دوسرے سے قریب تر آنے کا رویہ اختیار کر کے انہیں ہم آہنگ کر سکتی ہے۔ بلکہ بحیثیت قومی زبان جہاں دوسری علاقائی زبانوں کے ذخیرہ الفاظ میں مسلسل اضافے کا وسیلہ بن سکتی ہے وہاں علاقائی زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ سے خود بھی مالا مال ہو سکتی ہے مگر ٹھہریئے اردو زبان اور علاقائی زبانوں میں اشتراک و موانست پیدا کرنے کے راستے میں ابھی تو انگریزی زبان کی بالادستی اسی طرح قائم ہے

پاکستان میں تمام سطحوں پر انگریزی کی جگہ اردو کو اس کا جائز حق اور کھویا ہوا منصب دلانا تو ایک بڑی بات ہے افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے اکثر ادبی اور ثقافتی اداروں میں بھی قومی اور علاقائی زبانوں کی بجائے انگریزی بڑی حد تک نہ صرف ذریعۂ اظہار کے طور پر اب تک مسلط ہے بلکہ عظمت کی علامت بھی سمجھی جاتی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ بحیثیت زبان سائنسی اور تحقیقی میدانوں میں انگریزی سے استفادہ کرنے کی ضرورت باقی رہے گی لیکن قومی زبانوں اور علاقائی

زبانوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے انگریزی کی بالادستی کو بہرحال ختم کرنا ہوگا۔ بصورت دیگر یہ قدم قدم پر قومی یکجہتی کی راہ میں حائل ہوتی رہے گی اور آزادی کے بعد بھی اسی طرح ہمارے پاؤں کی زنجیر بنی رہے گی۔

پاکستان کے تمام صوبوں کی یکجہتی کے مسئلے پر غور کریں تو اردو انگریزی اور صوبائی زبانوں کی حیثیت ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ یہاں بھی ہماری تمام پاکستانی زبانوں پر ہنوز انگریزی کی بالادستی قائم ہے اگرچہ انگریزی کی یہ فوقیت مجبوری کے نام پر روا رکھی جا رہی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ قیام پاکستان کے تیس سال بعد بھی ہمارے ادبی و تہذیبی ادارے اس صورتحال سے گلو خلاصی ہونے کی کوئی صورت پیدا نہیں کر سکے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ، پاکستان نیشنل سنٹر، انجمن ترقی اردو اور بعض دوسری ملکی اور صوبائی انجمنوں کے محاذوں پر اردو کے ساتھ ساتھ دوسری علاقائی یا پاکستانی زبانوں میں صرف تقریبات منعقد کر دینے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا اور نہ یہ بات زندہ اور آزاد قوموں کے شایان شان ہی ہے کہ برق رفتاری کے اس زمانے میں کچھوے کی چال چلیں۔ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ پاکستان کے تمام صوبوں میں تمام سطحوں پر ایک طرف اردو زبان اور ادب کو لازمی مضمون کی حیثیت سے اختیار کیا جائے اور دوسری طرف اردو کے ساتھ ساتھ ہر صوبے میں اس صوبے کی زبانوں اور ادب کو پہلے پرائمری سطح پر اور پھر درجہ بدرجہ تمام سطحوں پر تعلیم و تدریس کے لئے اپنا کر اس کی ترویج و ترقی کے لئے مسلسل راستہ ہموار کیا جائے۔ بلکہ ہر صوبے کے تعلیمی نظام میں یہ اہتمام بھی کیا جائے کہ فارسی اور عربی کی طرح چھٹی جماعت سے پاکستان کے دوسرے صوبوں کی زبانوں کو بھی اضافی مضامین کی طرح اپنانے کا انتظام موجود ہو۔ ملک کے طول و عرض میں ادبی و تہذیبی انجمنیں اس خیال کو تحریک کی صورت دے کر اسے حقیقت کا جامہ پہنانے میں مثبت کردار ادا کر سکتی ہیں۔ یوں ہماری قومی زبان اردو کے ساتھ تمام علاقائی زبانیں سرعت کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب تر بھی ہوتی چلی جائیں گی اور جوں جوں انگریزی کے بجائے اردو اور دوسری علاقائی زبانوں (جو درحقیقت اردو ہی کی طرح پاکستانی زبانیں ہیں) کو ذریعہ تعلیم اور ذریعہ اظہار بنانے کی رسم عام ہوگی ہماری قومی زبان اور علاقائی زبانوں کے راستے سے انگریزی کی دیوار بھی ہٹتی چلی جائے گی۔ پاکستان کی تمام زبانیں قریب سے قریب تر ہوتی چلی جائیں گی۔ باہمی اشتراک و یگانگت [illegible]

کو مالا مال کریں گی ۔ صوبائی عصبیت کی کمر ٹوٹتی چلی جائے گی اور نظریہ پاکستان کی بنیادوں پر قومی یکجہتی کی فضا خوشگوار سے خوشگوار تر ہوتی چلی جائے گی ۔ یوں وقت کے ہر کاب پاکستان میں اردو اور علاقائی زبانوں کے میل جول اور باہمی اخذ و استفادہ کے عمل سے ایک ایسی پر مایہ زبان ابھرتی اور نکھرتی چلی آئے گی جس کے رگ و ریشے میں ہمیشہ اشتراک و محبت ، ارتباط و اتحاد ۔ افہام و تفہیم اور لین دین کا خون تازہ رواں دواں رہے گا ۔ مستقبل میں ابھرنے والی یہ قومی زبان (LINGUA FRANCA) نہ صرف کثرت میں وحدت کی علامت بن کر اپنا لوہا منوالے گی ۔ بلکہ ارض وطن پر قومی یکجہتی کے وہ دوامی نقوش بھی چھوڑتی چلی جائے گی جو ہر آنے والی نسل کے لیے مشعل راہ اور سرمایہ افتخار ہوں گے گفتنی گو کہ یہ منزل بظاہر بہت دور نظر آتی ہے ۔ تاہم ہمارے ادبی ۔ ثقافتی ۔ لسانی اور قومی ادارے اپنی مسلسل انتھک اور پر خلوص کوششوں سے اس بہار نو اور طلوع فردا کو قریب سے قریب تر لانے کا فریضہ سر انجام دے سکتے ہیں ۔

نظامِ تعلیم کا المیہ

پاکستان میں اس وقت دو قسم کا نظامِ تعلیم رائج ہے۔ دونوں نظام اپنے مزاج، طریق کار اور نتائج کے اعتبار سے باہم متصادم ہیں۔ ایک کا رخ مشرق کی جانب ہے۔ تو دوسرے کا مغرب کی طرف۔ اس نظریاتی آویزش کے تکلیف دہ اثرات ہماری قومی زندگی پر مرتب ہونے لگے ہیں۔ اہلِ فکر و نظر پر لازم ہے کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر اصلاحِ احوال کی طرف توجہ دیں۔

ہمارے ہاں کا ایک طریقۂ تعلیم، متمول، خوش حال اور اعلیٰ طبقے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور اس کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ اردو اگرچہ ہماری زبان ہے مگر مغربی طرز کے ان اداروں میں اس کا گزر ذرا مشکل سے ہی ہو پاتا ہے۔ مقامِ اطمینان ہے کہ موجودہ حکومت نے اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی غرض سے عملی قدم اٹھایا ہے۔ مگر اس کے مثبت نتائج برآمد ہونے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ فی الحال صورت یہ ہے کہ بچہ شعور کی آنکھ بعد میں کھولتا ہے۔

نرسری کلاس میں داخلہ پہلے مل جاتا ہے۔ یہاں انگریزی زبان پر خصوصی توجہ دی
جاتی ہے۔ انگریزی لب و لہجہ کے ساتھ اپنے جذبات کا اظہار کرنا سیکھتا ہے۔ مغربی
لباس زیب تن کرتا ہے۔ جب وہ ٹائی، نیکر پہنے گھر سے ایئر کنڈیشنڈ کار میں بیٹھ
کر "ٹا ٹا" کرتے ہوئے اپنے اسکول کی جانب روانہ ہوتا ہے، تو اس کی ممی "خوشی
کے مارے پھولے نہیں سماتی۔ گھر لوٹتا ہے اور ممی کو انگریزی میں رٹے ہوئے
پہاڑے اور جملے سناتا ہے، تو ڈیڈی، ممی دونوں سمجھتے ہیں۔ ان کی دولت ٹھکانے
لگی۔ انگریزی اسکولوں میں داخلہ دلوانا اب بڑائی اور امارت کی نشانی بن چکا
ہے اور والدین اس بھیل کو برقرار رکھنے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ جس کا
تصور بھی بڑا تکلیف دہ ہے۔ "بڑوں" کی دیکھا دیکھی متوسط طبقہ بھی اس "انگلش
میڈیم" کے جنون میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے۔ گھر کے اخراجات پورے نہ ہو سکیں تو ناجائز
ذرائع کا سہارا لیا جاتا ہے، تاہم بچے کا "سینٹ میری اور کانونٹ" اسکول میں بھیجنا
لازمی کیوں؟ اس کے بغیر جدیدیت کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے، معاشرے میں
آدمی کا وقار نہیں بنتا اور مستقبل تاریک رہتا۔

اس کے برعکس دوسرے نظام تعلیم کو "اردو میڈیم" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ طریقۂ
تعلیم دیہاتوں میں سو فیصد اور شہروں میں کسی حد تک رائج ہے۔ ملک کے ستر فیصد سے
زائد بچے جو دیہات میں رہتے ہیں۔ انہی اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ شہری حلقوں میں
بھی اس طرز کے اسکول غریب عوام کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ مزدوروں، متوسط
طبقہ کے ملازموں اور چھوٹے موٹے کاروبار کرنے والے محنت کشوں کے بچے ان اسکولوں
میں داخل ہوتے ہیں۔ انگریزی میڈیم اسکول، امارت اور تمکنت شان کے مظہر ہیں
اور اردو میڈیم، غربت، افلاس اور بیچارگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ایک آزاد
ملک میں تعلیم کے میدان میں دو عمل ناقابل فہم ہے اور اس کی بدولت پاکستانی معاشرہ
دو متحارب گروہوں میں بٹتا جا رہا ہے۔ امیر اور غریب "HAVE" اور "HAVE NOT"
کا تصور اب شدت اختیار کر رہا ہے اور غریب محسوس کر رہے ہیں کہ ان کی حق تلفی ہو رہی ہے

ں ٹیکسوں سے وصول کیا ہوا روپیہ امراء کے بچوں کی فلاح و بہبود پر صرف ہو رہا
ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ ان کے بچوں کو جان بوجھ کر جاہل رکھا جا رہا ہے۔
تاکہ مراعات یافتہ طبقے کی اجارہ داری کے لئے کبھی خطرہ نہ بن سکیں۔

ہم اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہیں کہ ان مراعات یافتہ اداروں کی کامیابی
کے اسباب کیا ہیں۔

الف : انگریزی طرز تعلیم کا سحر

ہم اردو زبان کی ہزار برکتیں گنوائیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انگریزی زبان آ
ج ہمارے اعصاب پر بُری طرح سوار ہے۔ انگریز چلا گیا۔ لیکن ذہنی غلامی کا طو
ق ہماری گردن ہی میں چھوڑ گیا۔ انگریز کا فرمایا ہوا ہم آج بھی مستند سمجھتے ہیں۔ ہم
دیکھتے ہیں تو انگریزی دان طبقے کو اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ تو اس
مخصوص گروہ کے لئے صنعت و حرفت اور تجارت کے اونچے کاروبار پر قبضہ ہے
تو اس مختصر سی جمعیت کا۔ غرض جدھر نگاہ دوڑائیے انگریزی تہذیب و تمدن
کی چکا چوند دکھائی دے گی۔ اردو دان طبقے کے لئے تو کلرکی یا اسکول ماسٹری
سے بڑھ کر کوئی موقع نہیں۔ اس بناء پر اب ہر شخص ان انگریزی طرز کے تعلیمی
اداروں کا رخ کر رہا ہے۔

ب ۔ سہولتوں کی فراوانی

انگریزی طرز کے اداروں میں گوناگوں مراعات کی فراوانی ہے۔ ان اسکولوں
کا اسٹاف تربیت یافتہ ہوتا ہے۔ عمارتیں کشادہ، آرام دہ اور جاذب نگاہ ہوتی
ہیں۔ کھیل کے میدان بھی میسر ہوتے ہیں۔ فرنیچر کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ صفائی کا
خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔ پانی، بجلی، روشنی اور ہوا کے تمام انتظامات مکمل
ہوتے ہیں۔ والدین کے لئے یہ سب کچھ بڑی طمانیت کا موجب بنتا ہے اور وہ ان
سہولتوں کے پیش نظر بھاری بھرکم فیسوں کا بوجھ ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔

ج۔ نفاست اور رکھ رکھاؤ

ان اداروں میں ظاہری چمک دمک اور بانکپن پر خاص توجہ دی جاتی ہے
فرنگی لباس زیب تن کرنے کا خوگر بنایا جاتا ہے۔ جون، جولائی کے مہینوں میں بھی
ٹائی پہننا لازمی ہے۔ یہ نہ ہو تو اسکول کا معیار گرنے لگتا ہے۔ انگریزی بولنے پر خصوصی
توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ روزمرہ کی گفتگو میں انگریزی کے بازاری الفاظ کا سہارا
لیا جاتا ہے۔ ایک خاص انداز سے اٹھنے بیٹھنے کے آداب سیکھنا۔ کندھوں کو ایک
خاص زاویے سے جنبش دینا۔ منہ کے مخصوص پیچ و خم سے انگریزی میں گفتگو کرنا
انگریزی بولتے وقت آدھے سے زیادہ انگریزی الفاظ کا سہارا لینا۔ یہ سب باتیں
ایک اچھے انگلش میڈیم اسکول کے طالب علموں کا امتیازی نشان ہیں۔ "ڈیڈی" "
ممی" "انکل" اور "آنٹی" کا وافر استعمال بھی ایک ہوشیار طالب علم کی نشانی
سمجھی جاتی ہے۔ کسی کے منہ سے ابا جی، امی جی، چچا یا خالہ کے الفاظ آپ سن
لیں تو فوراً سمجھ جاتے کہ یہ بدتمیز اردو میڈیم کا طالب علم ہے۔ اسے تہذیب جدید
کی روشنی سے کیا واسطہ۔

انگلش میڈیم اسکولوں میں بچے نرسری سے انگریزی پڑھنا شروع کرتے ہیں
اور پانچویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے انگریزی زبان میں خاصی مہارت ہو جاتی ہے
وہ تمام مضامین انگریزی زبان میں پڑھتے ہیں۔ انگریزی بولنے کی مشق جاری رکھتے
ہیں۔ چھٹی جماعت اور ساتویں جماعت میں بھی ان کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہی ہوتا
ہے۔ ساتویں جماعت کے اختتام پر جب وہ پبلک اسکولوں میں داخلے کے امتحان
میں شریک ہوتے ہیں تو ان کے مقابلے میں جیچو کی ملیاں، بھائی پھیرو، چونترہ
کے اسکولوں کے پڑھے ہوئے وہ طالب علم ہوتے ہیں جو π r 2 کو "پرل" پڑھنے
پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کے استاد نے ایسا ہی پڑھایا تھا۔ اس مقابلے کی دوڑ میں
انگریزی میڈیم والے بچے اردو میڈیم والوں کو پچھاڑ دیتے ہیں۔

مشنری ادارے ہمارے قومی تشخص کے لئے ایک مبہم خطرہ بنے ہوتے ہیں۔ مگر
ہیں کہ سود و زیاں کے تصور سے بے نیاز ان کے دام تزویر میں پھنسے چلے جاتے
غیر ملکی تعلیمی ادارے، بڑے غیر محسوس انداز میں اپنے اثرات اپنے طالب علموں
منتقل کرتے ہیں۔ انہیں موسیقی سے رغبت دلاتے ہیں۔ رقص کی برکات سے
فیاب کرتے ہیں۔ انگریزی بولنے پر حوصلہ افزائی اور اردو بولنے پر سرزنش کرتے
اس طرح کی اور کتنی تدبیروں سے وہ پاکستانی نوجوانوں کو پاکستانی معاشرے
باغی اور بیزار کر ڈالتے ہیں۔

انگلش میڈیم اسکولوں کے اس جائزے کے بعد ایک نظر اردو میڈیم اداروں
حالت زار پر بھی ڈال لیجئے۔

درس و تدریس کا پیشہ ہمارے ملک میں عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا
بلکہ پڑھے لکھے لوگ اس پیشے کو اسی وقت اپناتے ہیں۔ جب انہیں ہر سو ناکامی
سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اساتذہ کی غالب اکثریت اپنے پیشے
قطعاً کوئی لگن نہیں رکھتی۔ وہ محض مجبوری کے تحت اس میں شامل ہوتے ہیں
ہر ہے یہ شعلہ اگر شروع ہی سے نم خوردہ ہو تو کسی شرارے کے پھوٹنے کی کیا توقع
رکھی جا سکتی ہے۔ دیہاتی اسکولوں میں تعینات اساتذہ اکثر اپنے علاقے سے تعلق رکھتے
ہیں اور ان کی سرگرمیوں کا مرکز زیادہ تر اپنی کھیتی باڑی اور اپنے دیگر مسائل ہی
رہتے ہیں۔ اسکول میں بھی بس تفریح اوقات ہی کے لئے آتے ہیں۔ یہاں بھی ان کی
سوچ، اپنی ذات کے محور پر گھومتی ہے۔ بچوں سے بجی بیگار لینا انہیں اپنے کھیتوں
پر بھجوا کر ان سے کام لینا، اپنے مویشیوں کے لئے چارہ کٹوانا، مرغیاں، انڈے
دودھ، لسی کا اہتمام کروانا، تھکے ہوئے اعصاب کو سکون پہنچانے کے لئے طالب علموں
سے مٹھی چاپی کروانا۔ نت نئے ہتھکنڈوں سے چندے کی رقم اکٹھی کرنا۔ یہ چند ایسی
بنیادی خرابیاں ہیں۔ جنہوں نے تعلیم و تدریس کے مقدس پیشے کا تقدس خاک میں
ملا دیا ہے۔ اساتذہ اس ذہنیت کے مالک ہوں گے۔ تو وہ اپنے شاگردوں کی کیا

اخلاقی تربیت کر سکیں گے۔ دیہاتی اسکولوں کے طلبا کے خوفناک انحطاط میں زیادہ تر ہاتھ ان کے اساتذہ کا ہے۔ ان اساتذہ کا فکری معیار حد درجہ پست ہوتا ہے۔ ان کی علمی قابلیت تکلیف دہ حد تک ناقص اور سطحی ہے۔ ان کے پڑھانے کا انداز دقیانوسی اور فرسودہ ہے۔ وہ بچے کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کرتے۔ سوچ اور تجسس کا مادہ پیدا کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ وہ اس بیسویں صدی میں بھی "چپتر یہ ہیڈ" ہی پر انحصار کرتے ہیں۔ دور افتادہ دیہاتوں میں اکثر ماسٹر کی اپنی حکومت ہوتی ہے۔ "بڑے بابو" اور "چھوٹے بابو" (ایجوکیشن افسروں) کا اول تو وہاں گزر ہی نہیں ہوتا اور اگر کبھی یہ صاحب اختیار آ ہی دھمکیں تو انہیں رام کرنے کے لئے بھی بہت سے گر قوم کے ان معماروں کو آتے ہیں۔ ع

ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

یہاں یہ بات واضح کردوں کہ سب استاد اس قماش کے نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ تو جذبے اندروں کی دولت سے سرشار ہوتے ہیں۔ مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔۔۔ لق ودق صحرا میں مثل نخلستان۔

دیہاتی اسکولوں کی عمارتیں، کچھ مستثنیات چھوڑ کر بڑی بے بسی اور کس مپرسی کا منظر پیش کرتی ہیں۔ ایک اسکول کے اگر بیس سیکشن ہیں تو کمروں کی تعداد آٹھ سے متجاوز نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ کہ بارہ کلاسیں موسمی تغیرات سے بے نیاز، آسمان تلے اپنا وقت گزارتی ہیں۔ جھلستی ہوئی دھوپ اور ٹھٹھرا دینے والی سردی میں بھی انہیں سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں ملتی۔ دوسری سہولتوں کا بھی یہی عالم ہوتا ہے۔ سائنس کے سامان کا تو ذکر ہی کیا۔ پینے کے لئے پانی تک کا انتظام نہیں۔

دیہاتی بچے زیادہ تر اَن پڑھ گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسکول میں انہیں نہ تعلیم ملتی ہے نہ تربیت۔ نتیجہ یہ کہ ان کی فطری صلاحیتوں کو جلا ملنے نہیں پاتی اور تھوڑی بہت جو ہوتی ہے وہ ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ اس طرح بڑے بڑے جوہر قابل ہمیشہ کے لئے برباد ہو جاتے ہیں۔ غریب گھرانوں کے یہ ہونہار بچے مفلسی

بہ ہاتھوں میں پس کر اپنی تعلیم آٹھ جماعتیں پاس کرنے کے بعد ختم کر ڈالتے ہیں۔
اور پھر فوج میں بھرتی ہونے یا "باہر" جانے کا جنون انہیں آ لیتا ہے۔

پبلک اسکول اور طبقاتی فرق

ہمارے ہاں کے پبلک اسکولوں میں عموماً ساتویں پاس بچے داخل کئے جاتے ہیں۔ بچوں کو تحریری امتحان کی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ مرحلہ سر ہو جائے تو انٹرویو کی باری آتی ہے۔ دیکھنے کو تو ان اداروں میں داخلہ محض اہلیت اور قابلیت کی بناء پر ملتا ہے۔ مگر صورت حال اتنی سادہ نہیں۔ ان ٹیسٹوں میں شریک ہونے والے دیہاتی بچوں کو ان بچوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جو شروع ہی سے کانونٹ اسکولوں کے طالب علم رہ چکے ہوتے ہیں۔ یہ بچے انگریزی زبان میں فر فر گفتگو کر سکتے ہیں۔ انہیں کھیلوں سے بھی بڑی رغبت ہوتی ہے۔ ان کے تعلیمی مشاغل بھی صحت مندانہ ہوتے ہیں۔ لباس اور تراش خراش کے لحاظ سے بھی وہ ماڈرن ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس دیہاتی بچے احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ ناقص طریق تعلیم ان کے گنوار پن میں اضافہ کر دیتا ہے۔ چاہے ان کی ذہنی قابلیت شہری بچوں سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ امتحان اور انٹرویو کے مراحل طے نہیں کر پاتے اور مقابلے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس طرح ملک کی ستر اسی فیصد آبادی ان اعلیٰ تعلیمی اداروں سے محروم رہتی ہے۔ یہ قطعاً کوئی خوش گوار بات نہیں۔ اس طرح طبقاتی درجہ بندی میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ مخاصمت بڑھتی ہے جس کے مہلک اثرات سارے قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ چارہ گروں پر لازم ہے کہ وہ ان مسائل پر توجہ دیں جو قوم میں ناروا طبقاتی فرق پیدا کر رہے ہیں۔

پاکستان میں موجود غیر ملکی مشنری ادارے ہمارے قومی تشخص اور ہمارے قومی مزاج سے متصادم ہیں۔ ان کی اجارہ داری توڑنا بے حد ضروری ہے۔ یہ ادارے دام ہم رنگ زمیں بچھا کر ہماری نئی نسل کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں۔ جو مسلمان بچے یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ ان کی سوچ کا انداز یکسر بدل جاتا ہے۔ وہ مغربی اقدار اور

مغربی طرز زندگی کے اتنے خوگر ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی ملی اور دینی قدریں فرسودہ دکھائی دینے لگتی ہیں۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ ان اداروں کو کسی استثنا کے بغیر اپنی تحویل میں لے لے اور ان کا ماحول اور انداز تربیت اس طرح بدل ڈالے کہ مسلمان طالب علم مسلمان بن کر اٹھیں۔ نیم عیسائی یا لامذہب نہیں۔

انگلش میڈیم اسکولوں میں نرسری اور کے جی ہی سے انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا موجودہ کاروبار بند ہونا چاہیئے۔ اس طرزِ عمل سے طبقاتی تفریق کی بُو آتی ہے۔ بچوں کو انگریزی بطور ایک لازمی مضمون بے شک پڑھائی جائے۔ مگر چھٹی جماعت سے اس میں بچے کا بھی فائدہ ہے اور معاشرے کا بھی۔ بچہ اپنے مادری زبان کو بہتر سمجھ سکتا ہے۔ جب وہ اردو میں تعلیم پائے گا تو اس کی سوچ میں نکھار اور شعور میں پختگی پیدا ہوگی۔ انگریزی زبان سیکھنے میں جتنی توانائیاں صرف ہوتی ہیں۔ انہیں کسی بہتر کام میں لایا جا سکتا ہے۔ معاشرے کا فائدہ یوں ہوگا کہ اس وقت سٹیٹس سمبل کی جو مجنونانہ دوڑ ہو چکی ہے۔ اس کی شدت میں کمی آجائے گی۔ جب ہر ادارے میں انگریزی چھٹی جماعت سے پڑھائی جائے گی۔ تو پھر انگریزی میڈیم اسکولوں کی اجارہ داری بڑی حد تک ختم ہو سکے گی۔

یوں کہنے کو تو اردو ہماری قومی زبان ہے۔ اور ہم نے اسے ایف اے تک لازمی بھی قرار دے رکھا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انگریزی دان مراعات یافتہ طبقہ اب بھی زبان پر فخر کرنے کی بجائے اسے حقارت سے دیکھتا ہے۔ یہ انداز فکر بدلنے کی ضرورت ہے اور اس کی سب سے بہتر صورت یہی ہے کہ انگریزی زبان کی امتیازی حیثیت ختم کر دی جائے اور تعلیمی اداروں میں ابتداء ہی سے اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے۔

ماہرین تعلیم پر لازم ہے کہ وہ قوم کے تمام بچوں کو یکساں مواقع فراہم کرنے کی کوشش کریں۔ موجودہ طریق کار سے تو ایک مخصوص طبقہ ہی فیض یاب ہو رہا ہے۔ اور آبادی کی غالب اکثریت ان مراعات سے محروم کی جا رہی ہے۔ راقم کی رائے میں ایسے تعلیمی ادارے ختم کر دیئے جائیں۔ جہاں صرف امراء کے بچے ہی تعلیم پا سکتے

ہیں۔ ان کی بجائے تمام تعلیمی اداروں کی حالت بہتر بنائی جائے۔ ایسے ادارے ہماری توجہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ جہاں بنیادی آسائشیں اور سہولتیں ناپید ہیں۔ ایک پبلک اسکول کے سالانہ بجٹ کو ذہن میں رکھیئے اور پھر عام اسکول کے اخراجات کا جائزہ لیجئے رتی صاف دکھائی دے گا۔ ایک پبلک اسکول پر جتنا خرچ ہو رہا ہے۔ اس رقم سے کتنے اسکول چلائے جا سکتے ہیں۔ یہ پہلو خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

ہمارے ہاں اساتذہ کی غالب اکثریت اپنے منصب کی عظمت سے بے خبر ہے ضرورت ہے کہ انہیں معاشرے میں ان کا جائز مقام دیا جائے۔ ان کے مشاہروں میں اضافہ ہو۔ ان کی اخلاقی، ذہنی اور دینی تربیت کے لئے ریفریشر کورس شروع کئے جائیں اور ایسے اساتذہ جو اپنے آپ کو قومی تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کر سکتے ہوں انہیں رخصت کر دیا جائے۔ یہ لوگ قومی خزانے پر ناروا بوجھ بن کر قوم کی محرومیوں میں اضافہ کا سبب ہی بنتے ہیں۔ ان سے کسی بہتری کی توقع عبث ہے۔

دیہاتی اسکول کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ اسکول موجود ہے۔ مگر اساتذہ غائب اساتذہ حاضر ہیں تو سامان ناپید۔ یہ ادارے قرون وسطیٰ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ وہی پرانے رنگ ڈھنگ، وہی فرسودہ انداز تربیت۔ بدلے ہوئے تقاضوں کی روشنی میں ان اداروں کی حالت بہتر بنانا ضروری ہے۔ نیم خواندہ اساتذہ پر کڑی نظر رکھی جائے۔ انہیں اپنا تعلیمی معیار بہتر بنانے کو کہا جائے اور ایسے اساتذہ جو اپنی سوچ میں کسی خوشگوار تبدیلی کے متحمل نہ ہو سکتے ہوں، ان سے چھٹکارا پایا جائے۔ ملک میں افرادی قوت کی کمی نہیں۔ جوہر قابل تلاش کیا جائے۔ تو آسانی میسر آ سکتا ہے

پبلک اسکولوں کا فوری خاتمہ ممکن نہ ہو تو ان کی اجارہ داری ختم کرنے کے لئے تدریجی اقدامات کرنے چاہئیں۔ ماہرین تعلیم اس ضمن میں ایک پالیسی مرتب کر سکتے ہیں جب تک یہ ادارے قائم ہیں۔ ان میں داخلہ کا معیار صرف اور صرف لیاقت ہونی چاہیئے۔ داخلے کا امتحان اردو میں لیا جائے اور انٹرویو بھی اردو میں۔ انگریزی کو بلاجواز فوقیت حاصل ہے۔ اسے یکسر ختم کر دینا چاہیئے۔ کالج کے سربراہ بچے کی ذہانت کو فوقیت

دیں۔ اس کے لباس، اس کی تراش خراش اور اس کے اطوار سے زیادہ متاثر نہ ہوں۔
سی طریقے سے غریبوں کے بچے اپنی قابلیت کے سہارے ایچی سن کالج، صادق
پبلک اسکول، کیڈٹ کالج حسن ابدال اور برن ہال اسکول ایبٹ آباد میں داخلہ
لے سکیں گے۔

تعلیمی انحطاط کا یہ مختصر سا جائزہ ہے۔ ہم نے حقائق کی روشنی میں ثابت
کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے ہاں انحطاط کا واحد سبب تعلیمی میدان میں دوعملی
ہے۔ یہ دوعملی۔ طبقاتی کشمکش کو جنم دے رہی ہے۔ معاشرے میں بے چینی بڑھ
رہی ہے اور محرومی کا احساس تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک آزاد اسلامی مملکت میں
یہ نظریاتی آویزش بے حد تشویشناک ہے۔ ماہرین تعلیم پر لازم ہے کہ وہ مخلصانہ
مساعی کو عملی جامہ پہنانے میں مثبت کردار ادا کریں ×

سجاد [illegible]

سمسٹر سسٹم

۱۹۸۰ء سے پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں اور ان سے ملحقہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پوسٹ گریجوایٹ کی سطح پر سمیسٹر سسٹم رائج ہے۔ دراصل یہ تدریس و تعلیم و طریقہ امتحان کا نیا نظام ہے پرانے نظام کے تحت ایم اے کا نصاب سات یا آٹھ پرچوں پر مشتمل ہوتا تھا اور اسے کم و بیش دو سال میں مکمل کیا جاتا تھا دو سال بعد اس پورے نصاب کا ایک پبلک امتحان یونیورسٹی کی جانب سے منعقد ہوتا تھا جس کے نتائج کا اعلان بالعموم انعقاد کے چار پانچ ماہ بعد کیا جاتا تھا۔

نئے نظام کے تحت دو سال کی مدت کو چار سمیسٹرز میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ہر سمسٹر اٹھارہ ہفتے کا ہوتا ہے اس مدت میں سے سولہ ہفتے تدریس کیلئے ایک ہفتہ فائنل امتحان کے انعقاد کے لئے اور ایک ہفتہ اس کے نتائج مرتب کرنے کے لئے مختص کر دیا گیا ہے سات یا آٹھ پرچوں کی بجائے ہر طالب علم کو ایک سمسٹر میں پانچ مختلف "کورسز" پڑھنے پڑتے ہیں۔ ہر کورس کے تین کریڈٹ ہوتے ہیں گویا ہر سمسٹر میں پندرہ اور چاروں سمسٹرز میں مجموعی

طور پر ساٹھ کریڈٹ ہو گئے۔

ایک سمسٹر کے دوران ہر طالب علم کو ہر کورس میں تین تین امتحان دینے اور پاس کرنے ہوتے ہیں۔ ہر امتحان تقریباً پانچ ہفتے بعد منعقد ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر سمسٹر میں طلبا کو کم از کم تین مضامین فی کورس یا ایک ایک طویل تحقیقی مضمون فی کورس لکھنا پڑتا ہے لسے (SESSIONAL WORK) کہا جاتا ہے۔ ہر سمسٹر کے دوران امتحانات اور سیشنل ورک (SESSIONAL WORK) کی جانچ پڑتال الگ الگ اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل جدول سے کیا جا سکتا ہے۔

ابتدائی یا (PRELIMINARY) امتحان کے لئے ۲۰٪ نمبر

درمیانی یا (MID-TERM) " " ۲۰٪ "

ٹرم پیپر یا (SESSIONAL WORK) کے لئے ۲۰٪ نمبر

آخری یا (FINAL) امتحان کے لئے ۴۰٪ "

ہر سمسٹر میں کورسز کی تعداد : ۵ میزان ۱۰۰

کل نمبر : ۵ × ۱۰۰ = ۵۰۰

کسی بھی طالب علم کو پاس ہونے کے لئے کم از کم ۵۳٪ (ترپن فی صد) نمبر حاصل کرنا ضروری ہیں پرانے نظام کے تحت طلبہ کو اول دوم اور سوم درجے دیئے جاتے تھے۔ سمسٹر سسٹم کے تحت ان کی درجہ بندی A، B، C گریڈز میں کی جاتی ہے۔

۵۳٪ سے ۶۴٪ تک = C گریڈ

۶۵٪ سے ۷۹٪ " = B "

۸۰٪ یا اس سے اوپر = A "

سمسٹر سسٹم رائج کرنے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ طالب علم زیادہ محنت اور لگن سے تعلیم حاصل کریں۔ ان کا تعلیمی معیار بلند ہو اور وہ اپنے مضامین میں تازہ ترین حقائق سے روشناس ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سمسٹر سسٹم بہت سی خوبیوں کا حامل ہے لیکن اپنی تمام تر افادیت

کے باوجود اس نظام کے نفاذ نے طلبا ۔ اساتذہ اور تعلیمی اداروں کے لئے بے شمار مشکلات ور مسائل پیدا کر دیئے ہیں ۔ آیئے ذرا ان مشکلات اور مسائل کا ایک سرسری سا جائزہ لینے کی کوشش کریں تاکہ اس نظام کی افادیت اور کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے مناسب اور بروقت اقدامات کئے جا سکیں ۔

کسی بھی نظام تعلیم میں طلبہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ ہر نظام تعلیم کے نفاذ سے براہ راست وہی سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں ۔ سمسٹر سسٹم کے تحت طلبہ کو پیش آنے والی بعض مشکلات یہ ہیں ۔

۱۔ زیادہ کورسز سمسٹر سسٹم سے پہلے عام طور پر ایم اے کے طلبہ کو دو سال میں کل سات پرچے تیار کرنا پڑتے تھے ۔

اس کے برعکس اب انہیں ہر سمسٹر میں پانچ کورس مکمل کرنے ہوتے ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک کا نصاب کافی طویل اور جامع ہوتا ہے ۔ طلبہ کے لئے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ اس نصاب کے منتخب حصوں کی تیاری کر لیں جیسا کہ ماضی میں ممکن تھا ۔ اب تو سارا نصاب تمام تر وسعت اور گہرائی کے ساتھ پڑھنا پڑتا ہے ۔ ان قواعد کے مطابق ہر ایک کورس پر (ASSIGN MENTS) اور ٹرم پیپر لکھنے ہوتے ہیں جن کے لئے مقررہ نصاب سے کہیں زیادہ مطالعے اور تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے ۔ طلبہ کی اکثریت کا خیال ہے (اور یہ یقیناً درست ہے) کہ کورسز کی تعداد زیادہ ہے نصاب پہلے سے زیادہ وسیع ۔ طویل جامع اور پیچیدہ ہیں ۔ اس لئے ان کی تعداد کو مناسب حد تک کم کر دینا چاہیئے ۔

۲۔ زیادہ امتحان پرانے نظام کے تحت دو سال کی مدت کے اختتام پر یونیورسٹی کی جانب سے ایک ہی امتحان منعقد کیا جاتا تھا ۔ لیکن نئے نظام کے تحت ہر طالب علم کو ہر سمسٹر میں پندرہ امتحان پاس کرنا ہوتے ہیں ۔ گویا دو سال کے عرصہ میں یا چار سمسٹرز میں مجموعی طور پر [illegible] امتحانوں میں پاس ہونا لازمی ہے ۔

علاوہ ازیں ہر طالب علم کو ایک ایک سمسٹر میں کم و بیش پندرہ مضامین یا پانچ پانچ طویل تحقیقی مقالے لکھنے پڑتے ہیں۔ ہر امتحان اور مضمون کا ایک الگ کریڈٹ ہوتا ہے اور ان میں سے کسی ایک سے گلو خلاصی ممکن نہیں۔ طلبہ کے نقطۂ نظر سے امتحان کی یہ کثرت اور مضامین کی اس قدر بھرمار جان لیوا ہے۔

۳۔ غیر حقیقی طور پر بلند معیار پرانے نظام کے تحت کسی بھی طالب علم کو امتحان میں پاس ہونے کے لئے صرف ۳۳٪ نمبر حاصل کرنے ہوتے ہیں۔ ۴۵٪ نمبر حاصل کرنے والے درجہ دوم میں اور ۶۰٪ یا اس سے زیادہ نمبر پانے والے طلبہ درجہ اول حاصل کر لیتے تھے۔ اس کے باوجود پنجاب یونیورسٹی کا بیشتر مضامین میں نتیجہ بیس ۲۰٪ سے پچیس ۲۵٪ فی صد تک ہی رہتا تھا۔ گزشتہ سال ۱۹۷۱ء پنجاب یونیورسٹی کا ایم اے انگریزی کا نتیجہ صرف ۱۲٪ تھا۔ کوئی طالب علم اول درجہ حاصل نہ کر سکا۔ بلکہ درجہ دوم حاصل کرنے والوں کی تعداد بھی بہت قلیل رہی۔

نئے نظام کے تحت ہر امیدوار کو امتحان پاس کرنے کے لئے کم از کم ۵۲٪ نمبر پانا لازم ہے۔ (B) بی گریڈ کے لئے کم از کم ۶۵٪ اور (A) اے گریڈ کے لئے ۸۰٪ یا اس سے زیادہ نمبروں کی شرط لگا دی گئی ہے۔ مختلف وجوہات کی بنا پر پچھلے کئی برس سے ہمارے ہاں جو تعلیمی انحطاط ہوا ہے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ چنانچہ طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد کی ذہنی استعداد کے پیش نظر نئے نظام کا مقرر کردہ بلند معیار ہرگز حقیقت پسندانہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خاص طور پر اس لئے کہ بی اے کی سطح تک ابھی پرانے معیار کے مطابق پرچوں کی جانچ پڑتال کی جا رہی ہے۔ یہاں اس امر کی نشاندہی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ گزشتہ کئی سال سے پنجاب یونیورسٹی کے بی اے کے نتائج بیس سے بائیس فی صد تک رہے ہیں چنانچہ درجہ اول اور دوم پانے والوں کی تعداد بے حد قلیل رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایم اے میں داخلہ لینے والے طلبہ انہیں میں سے منتخب ہو کر یونیورسٹی

۔ ۔ ویوں کے پوسٹ گریجوایٹ شعبوں میں آتے ہیں ۔ ان کے داخلے پر کسی بھی پابندیاں عائد
کی جائیں داخل ہو جانے والوں کی کثیر تعداد کی ذہنی استعداد سمسٹر سسٹم کے مقررہ معیار تک
مشکل سے ہی پہنچ سکتی ہے ۔ نتیجہ " سمسٹر سسٹم کے معیار کو سختی سے نافذ کرنے کی کوشش
خطرناک صورت حال اختیار کر سکتی ہے ۔ بصورت دیگر ہر قسم کی برائیاں اور بے قاعدگیاں
جنم لیں گی اور آخر کار لوگوں کا اعتماد اس سسٹم کی کارکردگی سے اٹھ جائے گا ۔

۴۔ گریڈ پوائنٹ اوسط کو بہتر بنانے کی گنجائش نہیں ہے

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ طلبہ کی ذہنی استعداد سوجھ بوجھ اور قابلیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ
بڑھتی اور ترقی کرتی ہے لہذا ان کی کارکردگی ابتدائی امتحان کی نسبت آخری امتحانوں میں ہر
لحاظ سے بہتر ہوتی ہے ۔ بدقسمتی سے نئے نظام کے تحت ہر امتحان کی کارکردگی کا
جائزہ فرداً فرداً لیا جاتا ہے چنانچہ ابتدائی امتحانوں میں کم نمبر حاصل کرنے کا نتیجہ طلبہ
کی مجموعی کارکردگی اور نتائج پر بہت بری طرح اثر انداز ہوتا ہے ۔ لہذا ان کی O. P. M ،
OVER ALL PERCENTAGE OF MARKS. کم ہو جاتی ہے جس کے باعث ان کے دل
میں اس نظام کے خلاف نفرت کا لاوا ابلنے لگتا ہے ۔

طلبہ چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے ابتدائی امتحانوں کے نتائج بہتر بنا سکنے کا موقع
فراہم کیا جائے ۔ موجودہ صورت حال میں صرف ان طلبہ کو اس بات کا موقع ملتا ہے
جو کسی مضمون میں فیل ہو جاتے ہیں ۔ پاس ہونے والے طلبہ کا یہ مطالبہ حق بجانب
ہے کہ انہیں واسطے دوبارہ گریڈ بہتر کرنے کا موقع ملنا چاہیئے ۔

۵۔ حاضریوں کی تعداد

مختلف وجوہات کی بنا پر کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ اپنی
جماعتوں سے غیر حاضر رہنے کے عادی ہو چکے ہیں ۔ بی اے پاس کر کے ایم اے تک
پہنچتے پہنچتے ان کی یہ قبیح عادت پختہ ہو چکی ہوتی ہے ۔ چنانچہ وہ نئے قوانین کی سختی
کو ناپسند کرتے ہیں جن کے مطابق فائنل امتحان میں بیٹھنے کے لئے ضروری ہے کہ انہوں

سے کم از کم ۷۵٪ حاضریاں ہر مضمون میں پوری کی ہوں ۔ بصورت دیگر وہ امتحان میں بیٹھنے کے لئے نا اہل قرار دیئے جاتے ہیں ۔ اپنے اٹھارہ سالہ تدریسی تجربے کی بنیاد پر میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں ۔ کہ درمیانہ درجے کے طلبہ کی نسبت غیر حاضر رہنے کا رجحان ذہین طلبہ میں زیادہ پایا جاتا ہے ۔

طلبہ کا یہ مطالبہ جائز معلوم ہوتا ہے کہ ایم اے کے لئے بھی حاضریوں کی تعداد کم کر کے ۶۶٪ کر دی جائے ۔ جیسا کہ ماضی میں دستور تھا اور بی اے تک بھی حاضریوں کی یہی تعداد مقرر ہے ۔

۶ ۔ مائیگریشن (MIGRATION.)

نئے نظام کے تحت طلبہ کو ایک تعلیمی ادارے سے دوسرے ادارے میں منتقل ہونے کی اجازت نہیں ہے ۔ چنانچہ بعض طلبہ کو ان کے والدین کے تبادلوں کی صورت میں بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس قانون کی زد میں سب سے زیادہ وہ طلبہ آتے ہیں جو کسی وجہ سے ایک آدھ مضمون میں فیل ہو جائیں اور کالج سے خارج کر دیئے جائیں ۔ کسی بھی مضمون میں ناکامی سے اعلےٰ تعلیم کے دروازے ان پر ہمیشہ کے لئے مسدود کر دیئے جاتے ہیں طلبہ کو مائیگریشن کی سہولت مہیا کرنے کیلئے قوانین میں مناسب ترمیم کرنے کی ضرورت سے انکار کرنا ممکن نہیں ۔

سمسٹر سسٹم کے نفاذ نے اساتذہ کے لئے بھی بہت سے مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں ۔

ا ۔ کام کی زیادتی

پوسٹ گریجوایٹ کالجوں میں تعلیم دینے والا اساتذہ کو ایم اے کے علاوہ ایف اے اور بی اے کی جماعتوں کا تدریسی کام بھی کرنا پڑتا ہے پرانے نظام کے مطابق پوسٹ گریجوایٹ جماعتوں کا تدریسی کام اتنا محنت طلب اور دشوار نہ تھا ۔ جیسا کہ آج کل ہو گیا ہے مختصر وقت مقررہ کے دوران کافی طویل نصاب ختم کرانا بذات خود ایک مسئلہ ہے لیکن اساتذہ کو تدریسی کام کے علاوہ بھی کئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے ۔ ہفتے میں ایک بار سیمنار

...ستی ہوتی ہے۔ طلبہ پر انفرادی توجہ دینے کے لئے وقت مختص کرنا پڑتا ہے۔

نیز یہ کہ سمسٹر سسٹم کے تحت داخلی امتحان منعقد کرنے کا طریقہ نافذ العمل ہے اس
سے اساتذہ کو امتحان کے پرچے بنانے پڑتے ہیں پھر یہی پرچے انہیں جانچنے بھی پڑتے ہیں
...حان کی نتیجہ فہرستوں کی کٹی کٹی کا پابن بنانے کے علاوہ تمام امتحان کے ریکارڈ رکھنے کی ذمہ
...ری بھی انہیں کے سپرد ہوتی ہے اکثر و بیشتر کلریکل دفتری عملہ ان کی مدد کے لئے موجود
...ں ہوتا چنانچہ ان کے کام کا بوجھ اور بڑھ جاتا ہے ۔ ددتدریسی کام کے علاوہ ان کا بہت سا وقت
...ن تمام اضافی ذمہ داریوں کی نذر ہوجاتا ہے ۔ اس سب پر مستزاد یہ کہ پوسٹ گریجوایٹ کلاسیں
پڑھانے والے معلم پہلے اپنے تعلیمی اداروں کے سینئر اساتذہ ہوتے ہیں جن کے کندھوں پر نیک
...تعالی ...ور کا بار بھی ڈالا گیا ہوتا ہے۔ اس اضافی بار کی وجہ سے ان کے تدریسی کام کی کارکردگی
...زاشی کا متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ لہٰذا ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے ان تمام درسگاہوں کے
سٹاف میں خاطر خواہ اضافہ کرنے کی اشد ضرورت ہے جن میں سمسٹر سسٹم نافذ کیا گیا ہے۔

سمسٹر سسٹم کے نفاذ سے پوسٹ گریجوایٹ جماعتوں کے اساتذہ کے کام میں بے
پناہ اضافہ ہوجانے کے باوجود ان کے اس اضافی کام کے لئے کوئی معاوضہ یا (INCENTIVE)
موجود نہیں ہے۔

اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ منفصل کالجوں میں ایم اے کے معلم یونیورسٹی کے اساتذہ
کے ہم پلہ قرار دیئے جائیں۔ انہیں وہی مراعات اور سہولتیں پہنچائی جائیں اور ان کے ساتھ
بھی ویسا ہی سلوک کیا جائے۔ جس کا استحقاق فی الحال یونیورسٹی کے اساتذہ کو ہی حاصل ہے
...جس کے وہ جائز طور پر مستحق اور اہل ہیں۔ اگر ان کے لئے کسی اضافی مالی معاوضے کا بندوبست
...ں ہو سکتا تو کم از کم ان سے ادنیٰ درجوں کا تدریسی کام ہی واپس لے لیا جائے کہ وہ سمسٹر سسٹم
...کے تقاضوں کے مطابق دلجمعی اور زیادہ محنت اور لگن کے ساتھ پوسٹ گریجوایٹ جماعتوں
...کی تدریس کا کام سر انجام دے سکیں۔

۲۔ پوسٹ گریجوایٹ جماعتوں کے اساتذہ کیلئے ریفریشر کورسز کی ضرورت

پاکستان کے اساتذہ کی ایک کثیر تعداد کے لئے سمسٹر سسٹم کا نفاذ ایک بالکل نیا اور انوکھا تجربہ ہے بہت سے اساتذہ اس نظام کی پیچیدگیوں سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہیں اور اس نظام کے تحت تدریسی فرائض سرانجام دینے کے فرق سے کماحقہٗ واقف نہیں ہیں اور نہ ہی اپنی اسی نظام کی روح کے مطابق امتحانی پرچے بنانے جانچنے اور پرکھنے کا صحیح تصور ہے نتیجۃً بعض کالجوں میں طلبا کو پرچے جانچنے کے بارے میں شکایت رہی ہے اور مختلف اساتذہ کے جانچنے کے معیار میں بھی یک رنگی اور ہم آہنگی کے فقدان کو واضح طور پر محسوس کیا گیا۔

اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ متعلقہ اساتذہ کیلئے وقتاً فوقتاً ریفریشر کورسز کا اجرا کیا جائے تاکہ وہ اس نئے نظام کی پیچیدگیوں باریکیوں اور ضرورتوں سے اچھی طرح آگاہ ہو سکیں اور اپنے آپ کو بہتر طور پر اس نظام میں ڈھال سکیں۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے ریفریشر کورسز کی مدد سے ہمارے اساتذہ کی صلاحیت کار میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے اسطرح ان کے خلاف طلبہ کی شکایت کا ازالہ بھی ہو سکتا ہے۔

سٹاف کی کمی

سٹاف کی کمی کا مسئلہ عام طور پر پوسٹ گریجوایٹ تعلیمی اداروں کا سب سے اہم مشترکہ اور سنگین مسئلہ ہے۔ پرانے نظام کے تحت چند اساتذہ آسانی سے پوسٹ گریجوایٹ کلاسوں کی تدریس کا کام سرانجام دے سکتے تھے۔ ابتدائی اور فائنل سال کے طلبہ کی جماعتیں مشترکہ طور پر پڑھائی جا سکتی تھیں۔ موجودہ صورت حال میں مختلف سمسٹرز کی جماعتوں کو ایک ساتھ پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر سمسٹر کے طلبہ ایک طے شدہ نصاب اسی سمسٹر کی مدت کے دوران مکمل کرتے ہیں جو باقی سمسٹرز سے مختلف ہوتا ہے۔

مقررہ وقت میں مقررہ نصاب ختم کرنے کی وجہ سے مختلف سمسٹرز کے طلبہ کی مشترکہ جماعتیں ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں اساتذہ ہمہ وقت تدریسی اور اضافی فرائض میں معروف رہتے ہیں تاکہ سولہ ہفتے کے اندر اندر مقررہ نصاب مکمل کرا سکیں۔ انہیں مکمل یکسوئی سے کام کرنے کا موقع دینے کے لئے سٹاف میں اضافہ ناگزیر ہے۔

۲۔ اساتذہ کے تبادلے

جیسا کہ بتایا گیا ہے سمسٹر سسٹم کے تحت اساتذہ ہی طلبہ کی تعلیمی پروگریس ان کے امتحان اور امتحانی نتائج کا ریکارڈ رکھنے کے ذمہ دار ہیں، بعض اوقات ان اساتذہ کے تبادلے کر دیئے جاتے ہیں یا انہیں ترقی دے کر دوسرے اداروں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس طرح کالج کی انتظامیہ اور طلبہ کے لئے بے شمار مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

علیٰ ہٰذا القیاس اگر کوئی استاد بیمار پڑ جائے یا کسی اور حادثے کی وجہ سے طویل رخصت پر چلا جائے تو بس مدت میں بھی طلبہ کے لئے کئی مشکلات پیدا ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں کسی بھی استاد کا نعم البدل تلاش کرنا یا حاصل بے حد دشوار ہوتا ہے اور اگر نعم البدل فراہم ہو بھی جائے تو طلبہ کے نقطۂ نظر سے کئی پیچیدگیاں سر اٹھانے لگتی ہیں۔ متبادل استاد کے پڑھانے کا طریقۂ کار۔ اس کا دیا ہوا پرچہ جانچنے کا معیار اپنے پیشرو سے یکسر مختلف ہو سکتا ہے

اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ اول تو ایسے کالجوں کے پوسٹ گریجوایٹ جماعتیں پڑھانے والے اساتذہ کا تبادلہ نہ کیا جائے اور اگر ایسا کرنا بالکل ناگزیر ہو تو متعلقہ کالج کے پرنسپل اور صدر شعبہ سے پیشگی مشورہ کر لیا جائے تاکہ تبدیل ہو جانے والے استاد کے لئے اس رواں سمسٹر میں ایسے کا کوئی کام نہ رکھا جائے۔

۳۔ لائبریریوں کے لئے خصوصی گرانٹ

سمسٹر سسٹم کے بہتر نفاذ کے لئے پوسٹ گریجوایٹ تعلیمی اداروں کے پاس بہترین لائبریریاں ہونی چاہئیں۔ اور ان لائبریریز کو مسلسل بہتر بنانے کے لئے خصوصی گرانٹ مہیا کی جانی چاہیئے۔ نیز ان کے لئے جدید ترین کتب اور ضروری جرائد کی خریداری کے لئے بھی انہیں وقتاً فوقتاً گرانٹ دی جانی چاہیئے۔ اس بات کا بھی خیال رکھا جائے۔ کہ اس مقصد کے لئے دی جانے والی گرانٹ کا اجراء سال ختم ہونے سے کافی پہلے کر دیا جائے اور اس سلسلے کی تمام غیر ضروری رکاوٹیں دور کر دی جائیں تاکہ مناسب وقت پر کتب و جرائد کی خریداری کی جا سکے۔

۴۔ خریداری کے طریقہ کار میں تبدیلی ضرورت

ہمارے ہاں کتب جرائد اور لیبارٹری کے سامان کی خریداری کا طریقہ کار بے حد پیچیدہ دشوار اور انتہائی فرسودہ ہے۔ نئے نظام سے بہتر نتائج حاصل کرنے کے لئے اس طریقہ کار میں اس طرح تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ ضروری اور انتہائی اہمیت کا سامان خریدنے میں خواہ مخواہ رکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں ان تمام اشیاء کی خریداری کی ذمہ داری پرنسپل اور صدر شعبہ کے صوابدید پر چھوڑ دی جائے تاکہ جب بھی اور جہاں سے بھی ممکن ہو وہ متعلقہ سامان کی فراہمی کے لئے بندوبست کر سکیں۔ پرانے طریقہ کار کے مطابق ٹنڈر طلب کرنے اور مختلف انتظامی شعبوں کی وساطت سے خریداری کرنی پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے غیر ضروری تاخیر ہو جاتی ہے۔ جو طلبہ اساتذہ اور کالجوں کے مفاد کے خلاف ہے۔

نظام امتحان میں تبدیلی

گذشتہ تیس سالوں میں تعلیم کے مجموعی عمل میں دیگر حجملہ خرابیوں کے علاوہ جو
سب سے بڑی اور بنیادی خامی پیدا ہوئی ہے وہ میری نظر میں ٹیچنگ کا ٹیسٹنگ
TESTING سے علیحدہ ہونا ہے۔ ایک سرسری سی نظر واضح کر سکتی ہے کہ کس
طرح کلاس روم کی پڑھائی ایک الگ عمل بن کر رہ گئی ہے اور اس کا جائزہ یعنی امتحان
اپنی جگہ ایک علیحدہ عمل تعلیم کے مکمل تنزل میں ایک اور بنیادی خامی اور نقص ان سالوں
میں یہ پیدا ہوا ہے کہ نہ صرف امتحانی عمل پڑھائی سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ بلکہ اسے
مجموعی تعلیمی عمل میں مکمل طور پر پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ میری نظر میں امتحان
کا بے معنی اور بے مقصد بن جانا جیسا کہ یہ آج کل ہے اتنا ہی خطرناک ہے جتنا کہ
پڑھائے جانے والے سلیبس کا غلط چناؤ یا ان بنیادی مقاصد کا مبہم ہونا جن کو
مدنظر رکھ کر سلیبس کا چناؤ کیا جاتا ہے یا اساتذہ جو کہ سلیبس کے مندرجات
میں روح ڈالنے یا اسے مردہ کرنے کے براہ راست ذمہ دار ہوتے ہیں۔

میری ان گزارشات سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اجتماعی تعلیمی عمل میں جس

چیز کو مرکزی حیثیت سے تمام ترقی یافتہ ممالک میں نہ صرف تسلیم کیا جا چکا ہے بلکہ اس کو باقاعدہ سائنس کی شکل دی جا چکی ہے۔ ہمارے لئے وہ (امتحان) ایک فضول عمل۔ ایک ڈگری یا ڈپلوما کے حصول کا ذریعہ اور ایک طرح کی خانہ پُری ہو کر رہ گیا ہے۔ ان تمام ممالک میں سائنس اور ادب و زبان پڑھانے والے اساتذہ اور ماہر تعلیم مسلسل اس کوشش میں رہے ہیں۔ کہ تعلیمی عمل کو زیادہ محرک اور با عمل اور با مقصد بنانے کے لئے کس طرح اور کیوں کر (TESTING) معاون ہو سکتی ہے سائنس اور انگریزی زبان کی نت نئی ٹیسٹنگ (TESTING) پر ہزاروں کتابیں فوری طور پر مل سکتی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں (TESTING) کا کام ٹھیکیداری کی بنا پر بورڈ کے ذمہ لگا دیا گیا ہے۔ سائنس کے اساتذہ کو ٹیوشن پڑھانے سے فرصت نہیں۔ اردو زبان کے اساتذہ کو اپنی شاعری اور دیگر تخلیقی امور سے فرصت نہیں۔ انگریزی ادب پڑھانے والے اساتذہ اپنی ہی انا کا شکار ابھی تک اس مفروضے سے باہر نہیں نکلے کہ انگریزی ادب پڑھانے سے مراد انگریزی زبان نہیں ہے۔ کہنے سے مراد یہ ہے کہ چاہے وہ اسکول یا کالج کا لوکل امتحان ہو یا یہ اہتمام بورڈ یا یونیورسٹی کی طرف سے ہو اس کا (PATTERN) ایک ہی ہے اور اسے تبدیل کرنے کی چنداں کوشش نہیں کی جا رہی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ساری قوم تعلیمی تنزل کا رونا رو رہی ہے۔ میری نظر میں اگر (TESTING) نے یہ موجودہ شکل اختیار کر لی ہے تو اس کی ذمہ داری براہ راست تعلیم کے ماہرین اور اساتذہ پر ڈالی جا سکتی ہے۔ میں یہاں اپنی ان گزارشات میں امتحانی عمل کا صحیح مقام اور اس کی اہمیت اور اس کے اجتماعی اثرات اپنے گیارہ سالہ تدریسی تجربے اور انگلینڈ میں اپنی تحقیق کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا

روایتی سلیبس اور اس میں امتحان کی حیثیت

ہمارے ہاں مروجہ تعلیمی عمل کچھ اس طرح ہے کہ تعلیمی پالیسیاں بنانے والے

اپنے سامنے سب سے پہلے ان چند قومی اور نظریاتی مقاصد کو رکھتے ہوئے اُن مضامین اور موضوعات کی تلاش میں نکلتے ہیں جن کے ذریعے ان مقاصد اور نظریات کو طلبا تک پہنچایا جا سکے۔ یعنی پہلی (STAGE) وہ قومی اور نظریاتی مقاصد ہیں اور دوسرا مرحلہ سلیبس کا چناؤ ہے۔ تیسرے مرحلے پر ان کی تنظیم (ORGANIZATION) کی ضرورت پیدا ہوتی ہے اور اس کے لئے تعلیمی ادارے تعلیمی عمارات، اساتذہ کا چناؤ، ان کی تربیت اور دیگر اخراجات بروئے کار آتے ہیں۔ چوتھے مرحلے یعنی سب سے آخر میں ہمارے ہاں (TESTING) یا اپنی زبان میں امتحان آتا ہے جس کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کس حد تک وہ بنیادی مقاصد اور نظریات جو کہ قوم نے تعلیم کے ان پڑھانے کو شروع میں دیئے تھے اور جن کے حصول کے لئے قوم نے اپنا پیٹ کاٹ کر رقوم مہیا کی تھیں، وہ کس حد تک قوم کے نوجوانوں تک پہنچے ہیں اور کس حد تک ان کے اثرات نوجوان ذہنوں پر مرتب ہوئے ہیں۔ ایک گراف کے ذریعے یہ ساری بات یوں لکھی جا سکتی ہے۔
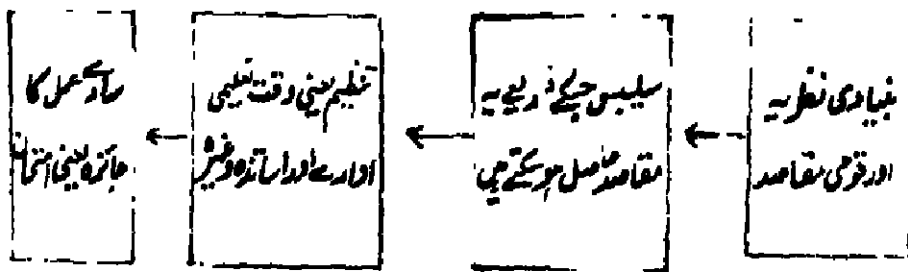
ریلف ٹیلر کا کری قلم (CURRI CULUM) کے متعلق یہ نظریہ انگلینڈ اور دوسرے ممالک میں تو صرف چند سال ہی تعلیمی پالیسی بنانے والوں کے لئے مشعل راہ رہا۔ مگر ہمارے ہاں یہ اب تک حرف آخر ہے۔ وہاں بہت جلد اس (LINEAR-APPROACH) کے نقائص معلوم کر لئے گئے۔ مثلاً اس کی بنیادی خامی ہے کہ اس میں چاروں مدارج اپنے طور پر ایک مکمل یونٹ ہوتے ہیں اور ان کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا ربط نہیں ہوتا دوسرے بنیادی مقاصد اور نظریئے مبہم اور غیر واضح ہوتے ہیں اور ان کے حصول کے

لئے کسی طرح کا سلیبس بنایا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ نظریئے اور مقاصد اپنے (TARGET) کو واضح طور پر سامنے نہیں لاتے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ مقاصد صرف سلوگن ہی کی حد تک رہتے ہیں اور عموماً سیاستدان اور اساتذہ کے ذاتی نظریات میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایک اور بنیادی خامی اس (APPROACH) میں یہ ہے۔ کہ سارے کا سارا تعلیمی عمل صرف اور صرف امتحان پاس کرنے اور ناجائز و جائز طلبا کو پاس کرانے تک محدود ہو کر رہ جاتے۔

اب طلباء جن کی تخلیقی اور عقلی نشوونما اور جن کے کردار کی صحت مندانہ ساخت کے لئے ایک قوم یہ سارا تعلیمی عمل اختیار کرتی ہے۔ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ اس قوم کے ہونہار طلباء کا مقصد حیات اس طرح کے سسٹم میں صرف اور صرف امتحان پاس کرنا ہی رہ جائے۔ چونکہ ہمارے ہاں امتحان دو سال بعد صرف چند دنوں کی مشقت کا عمل ہے۔ جس میں پوچھے جانے والے سوالات عموماً ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں یعنی (ESSAY) ٹائپ اور جن کے جوابات کسی طالب علم سے اس بات کے متقاضی نہیں ہوتے کہ وہ کلاس میں دو سال تک حاضر رہے۔ اپنے استاد کے وضاحتی عمل کو سنے اور استفادہ کرے یا مجوزہ سلیبس کو بغور پڑھے۔ امتحان آج کا طالب علم کالج اور اسکول سے بے نیاز ہو کر اور کتابوں سے گرد اڑائے بغیر اور استاد کو صرف ایک جیک اسپیکر گردانتے ہوئے اعلیٰ طور پر پاس کر سکتا ہے اب اگر ایسا طالب علم استاد کی عزت نہ بھی کرے اور مخصوص ذرائع استعمال کرتے ہوئے امتحان پاس کر کے بعد معاشرے میں باعزت مقام حاصل کر لے تو اسے کیا پڑی ہے کہ وہ تعلیمی ادارے کے تقدس اور اہمیت کو پہچانے۔ استاد کے افکار کو سنے اور ان بنیادی نظریات و مقاصد کو سمجھنے کے لئے سلیبس کو بغور پڑھے جن کے حصول کے لئے قوم رقم اور وقت دونوں مہیا کرتی ہے۔ اس عمل میں اگر آج کا استاد ریسرچ سے عاری، محنت سے گریزاں اور بے عملی کا شکار ہے تو اس کی وجہ بھی واضح ہے۔ سارے تعلیمی عمل اور سلیبس میں اساتذہ اور طلباء دونوں کے

(INVOLVEMENT) نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب استاد بغیر پڑھے پڑھا سکتا ہے اور طالب علم بغیر پڑھے امتحان پاس کر سکتا ہے تو دونوں کی کیا ضرورت ہے کہ وہ محنت اور علم کے صحیح معنے سمجھنے کی کوشش کریں۔ دونوں خاص طور پر طلبا اس تعلیمی عمل میں ٹک بی ہوئی کریم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کو کسی مقام پر یہ احساس نہیں ہوتا کہ انہیں ہر قدم پر اور ہر مقام پر ایک ٹیسٹ سے گزرنا ہے اور یہ کہ ان کی اگلے مدارج میں ترقی ان کی مکمل طور پر مخصوص کردہ کتب اور ریسرچ پر مبنی ہے۔

امتحان کا موجودہ مقام

امتحان کو تعلیمی عمل میں چوتھے نمبر پر رکھنا اور وہ بھی اس طرح کہ اُس کا پہلے تینوں مدارج سے کوئی رشتہ برقرار نہ رہے۔ میری نظر میں اتنا بے عمل اور فضول ہے جتنا کہ ایک فوج کا جنگ پہلے لڑ لینا اور ملٹری سراغ رسانی بعد میں کرنا۔ آج کے دور میں امتحان کو اولین حیثیت دی جا چکی ہے اور اس (LINEAR APPROACH) کو (WHEELER APPROACH) سے تبدیل کیا جا چکا ہے۔ نقشے کی رُو سے اس کی شکل یوں ابھرتی ہے۔
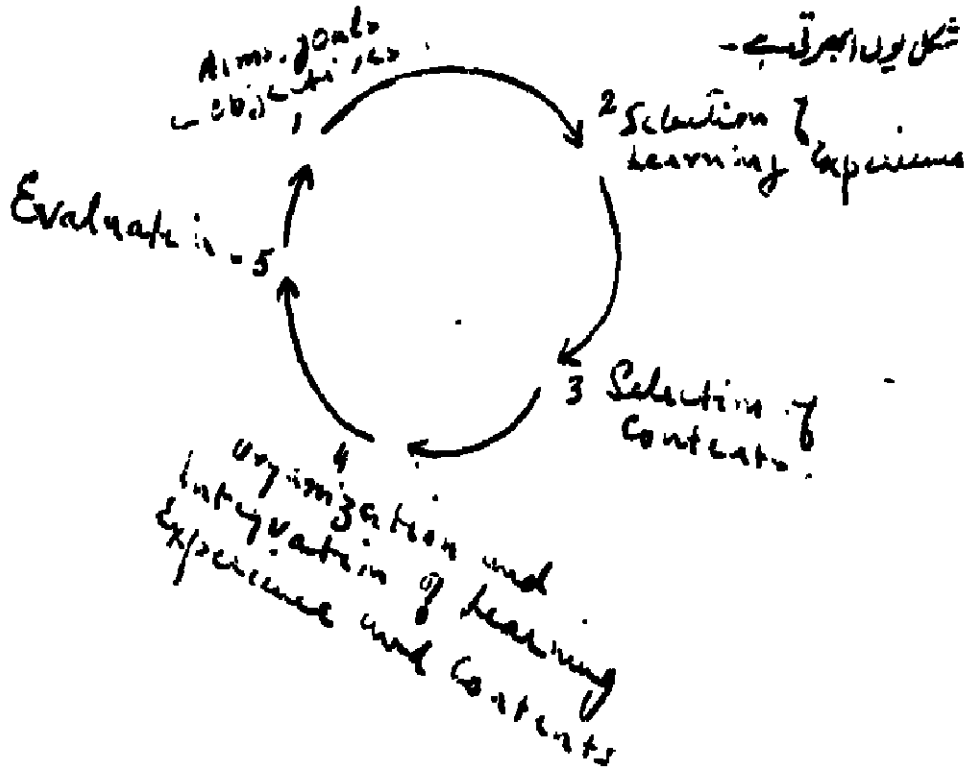
اس (CYDICAL) اپروچ میں ود ایک خامیوں کے علاوہ خوبیاں بہت ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس میں ہر درجہ پہ مقاصد کی ایک لمبی چیک لسٹ بنانی پڑتی ہے اور یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ بنیادی مقصد کس حد تک حاصل ہوا ہے۔ اگر نہیں تو خامی کہاں ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تعلیمی مقاصد (STUDENT-OR ENTED) ہوتے ہیں۔ نہ کہ (TEACHER ORIENTED) یعنی اس میں طالب علم مرکز نگاہ ہوتا ہے۔ نہ کہ استاد۔ بنیادی مقاصد واضح الفاظ میں ٹارگٹ کی صورت میں سامنے لائے جاتے ہیں اور ٹیسٹنگ ہر مرحلے پہ سارے تعلیمی عمل میں موجود رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ایک پہیئے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ہمارے ہاں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ اساتذہ کے (BEHAVIOUR) کو مد نظر رکھ کر سارا تعلیمی عمل وضع کیا گیا ہو نہ کہ طالب علم کو۔ طالب علم کی حیثیت ہمارے ہاں اس کورے کپڑے سے زیادہ نہیں جس پر کوئی رنگ ریز طرح طرح کے پھول بوٹے والی مہریں لگاتا جائے۔ طالب علم خود کوئی رائے نہیں رکھ سکتا۔ اس کا یہ فرض سمجھا گیا ہے کہ اپنے ذہن کی سلیٹ صاف رکھے تاکہ استاد جو چاہے اس پر لکھتا جائے۔ طالب علم کو اپنی کوشش یا اس کی صلاحیتوں کو متحرک بنانے کا کوئی اہتمام ہمارے تعلیمی نظام میں سرے ہی نہیں۔ امتحان کا تبدیل شدہ نظریہ یہ سب تبدیلیاں لا سکتا ہے۔ دوسرے ممالک میں طلبا کی سوچ ہمارے طلبا سے مختلف نہیں۔ صرف وہاں ایک امتحانی نظام ایسا ہے جو طلباء کو متحرک رکھتا ہے۔ لہذا ٹیسٹنگ (TESTING) کے متعلق سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسکو اس سے اٹھا کر تعلیمی عمل میں اس طرح سمو دیا جائے کہ ٹیچنگ اور ٹیسٹنگ ایک ہو جائیں سمسٹر سسٹم اس کی صرف ایک شاخ ہے اسکی عملی شکل نہیں۔

دوسرے یہ کہ امتحانی سوالات کے پوچھنے کا طریقہ کار یعنی (PATTERN) فوری طور پر تبدیل کر دیا جائے۔ یہ ایک مشکل کام ہے اور سوالات کو نئے اور جدید علوم کی روشنی میں وضع کرنے کے لئے فنی مہارت اور ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ مگر ایسے لوگ جو کہ (الا ماشاءاللہ) ٹریننگ بیرونی ممالک سے کرتے ہیں۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں موجود

ہیں ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ (ESSAY) ٹائپ سوالات کے ساتھ ساتھ (OBJECTIVE) ٹائپ سوالات بھی پوچھے جائیں اور سوالات اس طرح کے ہوں کہ صرف وہ طلبا ان کا جواب دے سکیں جنہوں نے سلیبس کو مکمل طور پر پڑھا ہو اور سطحی نظر سے پڑھنے کا عمل ان کے لئے کارگر نہ ہو، بلکہ سمجھ اور فہم ہی ان کی مددگار ہو۔

تیسری اہم بات امتحانات کے انعقاد کے عمل اور مارکنگ (MARKING) کے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں میری چند قابلِ عمل تجاویز حسب ذیل ہیں۔ میں صرف کالج کی سطح پہ بات کر رہا ہوں۔

۱۔ ہر کالج خود اپنے طلبا کے امتحان کے انعقاد کا اہتمام کرے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ہر کالج اپنے لوکل امتحان منعقد کرواتا ہے۔ بورڈ یا یونیورسٹی ہر کالج میں اپنا نمائندہ بھیجے جو امتحان کے دوران وہاں موجود رہے۔ کالج کا پرنسپل بلا واسطہ اور اس کا مقرر کردہ آفیسر بالواسطہ امتحان کے صحیح انعقاد کا ذمہ دار ہو۔ کالج کے دیگر اساتذہ نگران عملے کے فرائض دیں گے۔

۲۔ ہر کلاس ٹیچر جس نے کہ وہ کلاس اور مضمون پڑھایا ہو، خود اس کلاس کے طلبا کی مارکنگ کرے۔ مگر ایوارڈ (AWARD) دیتے وقت اسے مخصوص جگہوں پر اپنے ریمارکس دینے ہوں گے۔ جو کہ طالب علم کے علمی لیول (LEVEL) اس کی ذہانت کردار اور سال کے دوران حاضری اور عمومی سلوک کے متعلق ہوں گے۔ چونکہ استاد نے وہ جماعت دو سال تک خود پڑھائی ہو گی۔ لہذا اس کے ریمارکس زیادہ قابلِ اعتماد اور صحیح ہوں گے۔ بہر حالت میں استاد لیے دیئے گئے (AWARD) کا خود ذمہ دار ہوگا۔ غیر ذمہ دارانہ کام کا اثر اس کی (A.C.R) اور دیگر تجویز کردہ محکمانہ سزاؤں کے مطابق ہو۔

۔ یہ دوکل مارکنگ (MARKING) بعد میں اس شہر کے کسی دوسرے کالج کو

اساتذہ کے پاس جائے گی اور اس کالج کی اس پہلے کے پاس اسکول کل ماڈریشن کا نام (LOCAL MODERATION) دیا جا سکتا ہے۔ اگر دونوں ممتحین کے ایوارڈ میں واضح فرق ہو تو مستقل بورڈ کے مقرر کردہ (SUBJECT EXPERTS) کے پاس جائے۔

۴۔ اس سارے عمل میں اساتذہ پر اعتماد کرنا ہوگا اور انہیں ذمہ دار بنانا ہوگا اگر کوئی استاد ذمہداری کا اہل ثابت نہ ہو تو تادیبی عمل بھی اتنا ہی سخت ہو اور یہ اساتذہ پر بالکل واضح ہو۔

یہ سسٹم انگلینڈ جیسے ملک میں جاری ہے۔ وہاں بڑے سے بڑا سیاسی عمل تو ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ مگر تعلیمی شیڈول متاثر نہیں ہو سکتا۔ وہاں طلبا ریاں بے راہ روی کا شکار بھی نہیں۔ استاد کی عزت ہے۔ کیونکہ استاد ایماندار اور با اختیار ہے۔ ہمارے ہاں بھی تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ سائنس پڑھانے والے اساتذہ طلباء کی طرف سے نسبتاً کم (IN DISCIPLINE) کا شکار ہوتے ہیں۔ وجہ صاف ہے۔ ان کے پاس عملی امتحان کے ۳۰ نمبر ہوتے ہیں اور طلبا کو ان کے ناجائز اختیار کا بھی احساس ہوتا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ استاد کو باعمل اور با اختیار بنانے کے لئے یہ اقدام ضروری ہیں۔ صرف ضرورت اس عمل کی ہو گی کہ ان کا ناجائز استعمال نہ ہو (LOCAL MODERATION) اور استاد کے اپنے ریمارکس اس بات کا واضح ثبوت ہوں گے کہ استاد نے اپنے اختیارات کو غلط استعمال نہیں کیا۔

آج کے تعلیمی دور کا سب سے بڑا مسئلہ طلبا کو راہ راست پر لانا اس کی تخلیقی اور عقلی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور ان کے اندر ایک قومی شعور اور صحت مندانہ کردار پیدا کرنا ہے۔ دوسرے اساتذہ کو متحرک، باعمل اور ریسرچ پسند بنانا ہے۔ یہ سب کچھ تعلیمی عمل میں صرف ایک تبدیلی لانے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ صرف سلیبس میں چند شاعروں کو نکالنا اور دوسروں کو ان کی جگہ شامل کرنے یا اسلام پر چند مضامین

شامل کرنے یا سائنس کے چند اسباق نکال کر دوسرے ڈالنے سے تعلیمی میدان میں کوئی واضح تبدیلی کا تصور کرنا ایک غلط خیال ہے۔ جیسے کہ میں نے عرض کیا ہے کہ امتحانی نظام کے متعلق تین بنیادی تبدیلیاں لانی ہوں گی -

پہلے امتحان کو آخری مرحلے سے ہٹا کر تعلیمی عمل میں مسلسل سمونا - دوسرے پوچھے گئے سوالوں کا نمونہ تبدیل کرنا اور تیسرے اس کے انعقاد اور ایوارڈ دینے کے لوکل سسٹم کو جاری کرنا -

اس طریقے سے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نہ صرف طلبا اور اساتذہ دونوں کا بھلا ہوگا - بلکہ مجموعی طور پر پورے تعلیمی منظر میں ایک تبدیلی ظہور پذیر ہو گی - ایسے مسائل جیسے کہ استاد کی عزت - ادارے کا تقدس - طلبا کی سیاسی بے راہ روی اور قوم کے مقرر کردہ قومی اور نظریاتی مقاصد جو کہ اب حاصل نہیں ہو رہے سے کافی حد تک چھٹکارا حاصل ہو جائے گا -

محمد جمیل عالی

زبان اور علمی، فکری عمل

ایک بار مجھے ماہرین معاشیات کے ایک ایسے اکٹھ میں شرکت کا اتفاق ہوا جو پاکستان کی ہمہ جہت تعمیر و ترقی میں معاشرتی مہارت و بصیرت کے ساتھ اپنی رضاکارانہ شمولیت کے پیش نظر ایک سوشیولوجیکل فورم تشکیل دینا چاہتے تھے۔ شرکائے اجلاس زیادہ تر ایسے اصحاب تھے۔ جو پہلے ہی کہیں نہ کہیں بعض سرکاری اداروں میں اپنے ماہرانہ خدمات انجام دے رہے تھے۔ فورم کے اغراض و مقاصد اور اس کے دستوری ڈھانچے کی تیاری کا موضوع زیر بحث تھا اور گفتگو انگریزی زبان میں ہو رہی تھی میں نے ذرا جرأت کر کے گذارش کی کہ اگر ہم حقیقی قومی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس فورم کے دستور میں واضح اور قطعی طور پر یہ بات شامل کر لینی چاہیئے کہ ہمارے تبادلۂ خیال اور علمی و تحقیقی سرگرمیوں کی زبان اردو ہوگی۔ کیونکہ معاشریات سے تعلق رکھنے کی بناء پر قومی زبان کے سلسلہ میں ہم پر دوسروں سے کہیں زیادہ بڑھ کر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ میری اس جسارت پہ اکثر شرکاء نے حیرت اور ناپسندیدگی کے ملے جلے

اثر کے ساتھ میری طرف دیکھا اور اپنے اپنے ردعمل کا اظہار کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ زبان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ واقعہ میں نے اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ المناک حقیقت پوری طرح واضح ہو سکے کہ قومی معاشرتی مسائل اور ان کے حل سے براہ راست علمی و فکری تعلق رکھنے والے حضرات بھی قومی زبان کے بارے میں کوئی حوصلہ افزا جذبہ نہیں رکھتے۔ میں جب اردو کے قومی زبان ہونے کی بات کرتا ہوں تو اس میں محض جذباتیت کو کوئی دخل نہیں۔ بلکہ اس کے پیچھے صدیوں کے اس معاشرتی اور ثقافتی عمل کی ٹھوس منطق کارفرما ہے۔ جس کے نتیجہ میں اردو معرض وجود میں آئی اور بالخصوص گزشتہ دو تین صدیوں سے مسلسل ہمارے اجتماعی اور قومی مقاصد کی جدوجہد میں فکری اور تحریکی عمل کی زبان بنی رہی۔ مزید یہ کہ پاکستان کی علاقائی زبانوں نے اردو کی تشکیل و ترقی میں جو مثبت کردار ادا کیا ہے اس سے انکار بھی معاشرتی عمل کی اپنی منطق کی نفی کے مترادف ہوگا۔ زبان اور ثقافت کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے انفرادی فکری عمل کا سوال ہو یا پھر معاشرے کے اندر فکری عمل کے جاری ہونے کا مسئلہ ہو، ایسی زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جو افراد اور معاشرے کی ثقافت سے قریب تر ہونے کی خصوصیت رکھتی ہو۔ چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ پاکستانی صورت حال میں علمی ابلاغ و تفہیم اور فکری عمل کے سلسلے میں اردو زبان کی اہمیت سے جتنی آشنائی ماہرین معاشریات کو ہونی چاہئیے کسی دوسرے سے اس کا اتنا تقاضا نہیں کیا جا سکتا۔

زبان صرف ذخیرۂ الفاظ اور اصطلاحات کا نام نہیں ہوتا۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت جملوں کے ساختیاتی ڈھانچے کو حاصل ہوتی ہے۔ جسے آسانی کے لئے آپ گرامر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر سوچتے وقت آپ کے ذہن میں فعل، فاعل اور مفعول کی ترتیب کچھ اور ہو اور بولتے یا لکھتے وقت آپ کو دوسری ترتیب کا لحاظ رکھنا پڑے تو فکر و بیان یا فکر و تحریر میں کامل ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ

بنیادی تضاد اور کشمکش ہے جو ہمارے انفرادی اور اجتماعی فکری عمل کی فطری نشوو نما میں ایک رکاوٹ کا باعث بنی ہوئی ہے اور جس کے نتیجے میں ہماری اکثر ذہنی کاوشوں میں ایک الجھاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ آپ اردو زبان میں علمی و فکری اظہار و بیان کی ابتدا کیجئے بتدریج آپ محسوس کریں گے کہ آپ نہ صرف دو مختلف لسانی نظاموں کی ذہنی کشمکش سے آزاد ہوتے چلے جائیں گے۔ بلکہ آپ کی فطری نوک بصیرت بھی آپ کے فکری و تجزیاتی اور استنتاجی عمل کو توانائیوں سے ہمکنار کرتی چلی جائے گی۔ اس عظیم قومی و اجتماعی جہاد میں نہ صرف ملک کے معاشریئین بلکہ تمام علوم کے ماہرین کو ایک ہمت اور ولولے کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔ یہ بات بالخصوص ان اساتذہ کے لئے قومی امتحان کا درجہ رکھتی ہے جنہوں نے اپنے اپنے علوم کو انگریزی زبان میں سیکھا اور پڑھا ہے اور ایک دیرینہ عادت کی وجہ سے اب انہیں بعض اردو اصطلاحات اجنبی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ زبان کے سلسلہ میں اصطلاحات بنیادی مسئلہ نہیں ہوتیں۔ اگر کوئی متبادل اصطلاح اردو میں موجود نہیں تو انگریزی اصطلاح کو مناسب ترمیم کے ساتھ یا بعینہٖ استعمال کیا جا سکتا ہے اور یہ کام ایسی ایسی زبانیں بھی سرانجام دے چکی ہیں اور دے رہی ہیں جو علمی سرمائے میں کئی اعتبار سے اردو سے بھی پیچھے ہیں۔ اصل مسئلہ تو مفاہیم اور جملوں کا تشکیلی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ اصطلاحیں تو صرف علامتیں ہیں۔ اردو زبان کو علمی و فکری عمل اور اور ابلاغ و تفہیم کا ذریعہ بنانے کا کام ایک تحریکی جذبے کے ساتھ شروع ہو جائے تو اس طرح سے عمل میں اردو اصطلاحات خود بخود معیار پذیر ہوتی چلی جائیں گی۔ اس عمل کو تیز کرنے کے لئے ایم اے۔ ایم ایس سی کی سطح پر حوصلہ افزائی کے مناسب قواعد و ضوابط کے ساتھ طلباء سے معیاری کتب کے تراجم بھی کروائے جا سکتے ہیں اور تقریباً ایک صدی پیشتر جامعہ عثمانیہ میں اس کا کامیاب تجربہ بھی ہو چکا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم قومی سطح پر مختلف علوم میں ترقی کریں اور علمی و فکری اشتراک باہمی کے ذریعہ آگے بڑھیں تو ہمیں لازماً ایسی زبان اختیار کرنا پڑے گی جو ایک طرف تو ہمارے فطری انفرادی فکری عمل سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو اور دوسری طرف ملک کے ہر حصے سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کی مشترکہ زبان ہو تاکہ وہ ایک دوسرے کی علمی و فکری کاوشوں تک براہ راست رسائی حاصل کر سکیں اور یوں اجتماعی قومی سطح پر علمی و فکری عمل کی رفتار اپنی امکانی حدود تک تیز تر ہو سکے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی زبان پاکستانی صورت حال میں سوائے اردو کے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

عبدالرشید

تعلیم کا مقصد

گاہے گاہے جرائد و ریڈیو اور دیگر جماعتوں کی جانب سے معیار تعلیم کے خلاف نظام تعلیم کی فرسودگی درس گاہوں کی غیر تسلی بخش کارکردگی، اساتذہ کی طرف سے فرائض میں عدم توجہی اور عدم دلچسپی، سکولوں اور کالجوں میں داخلے کی مشکلات وغیرہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اور ان تعلیمی مسائل کے لئے اساتذہ، والدین، حکومت کے ارباب، پبلشر، دکاندار اور طلباء ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرا کر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں اور ہر طبقہ اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کر کے دوسرے کے سر الزام تھوپ دینا ہی کافی سمجھتا ہے۔ چونکہ تعلیم کے بارے میں شکایات گزشتہ کئی برسوں سے منظر عام پر آتی رہی ہیں۔ اس لئے یہ بات واضح ہے کہ ہماری تعلیم میں یقیناً خامیاں موجود ہیں اور اس سے وہ نتائج حاصل نہیں ہو رہے ہیں۔ جن کی ہم توقع رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں چاہئے کہ ہم نہایت خلوص دل سے اس مسئلے کا دیانتدارانہ اور ناقدانہ انداز سے جائزہ لیں اور دیکھیں کہ تعلیم سے متوقع نتائج حاصل نہ ہونے کے اسباب و علل کیا ہیں۔ اور ہماری تعلیم میں موجودہ خامیوں کا تدارک کیسے ممکن ہے۔

سب سے پہلے ہمیں دیکھنا ہے کہ تعلیم سے ہماری کیا مراد ہے اگر ہم تعلیم کو محض ڈاکٹر
در انجینئر بننے اور اعلیٰ عہدوں کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو پھر بہتر ہے کہ ہم درسگاہوں
سے مراد بیدا کرنے والی فیکٹریاں سمجھیں لیکن اگر تعلیم سے مراد مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا،
کردار کی تعمیر، شخصیت کا نکھار اور زندگی میں پیش آنے والے گوناگوں مسائل سے نبرد آزما
ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے تو پھر ہمیں یہ تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیئے
کہ موجودہ تعلیم سے بہتر نتائج حاصل نہیں ہو رہے ہیں۔ تعلیم محض نصابی کتب کو ازبر کرنے
کا نام نہیں۔ بلکہ اچھی تعلیم کے لئے طالب علم کی ذہنی استعداد کے ساتھ ساتھ گھر اور معاشرے
ماحول کا بھی عمل دخل ہے اور اس ماحول کو بنانے میں اساتذہ، والدین، حکومت اور ذرائع
ابلاغ اہم کردار ادا کرتے ہیں اس لئے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اپنے فرائض کس
حد تک پورے کر رہے ہیں اور وہ کون سے عوامل ہیں جو ان کی کارکردگی میں رکاوٹ کا سبب
ہیں۔ اگر تصویر کا ایک رخ دیکھا جائے اور فرداً فرداً ہر طبقے سے تبادلۂ خیال کیا جائے تو
معلوم ہوتا ہے کہ سب اچھا ہے اور ہر طبقہ نہایت جانفشانی اور فرض شناسی سے بچوں کی تعلیم
و تربیت جیسے اہم کام کو بطریق احسن سرانجام دے رہا ہے۔ مثلاً ہر حکومت کے پاس یہ
معقول دلیل رہی ہے کہ بجٹ کا ایک اچھا خاصہ حصہ تعلیم کے لئے مختص ہے اور حقیقتاً
حکومت ملکی ترقی و درآمدات اور دیگر ضروری مسئلوں کو ثانوی حیثیت دیتے ہوئے
وسائل سے زیادہ رقم تعلیم پر خرچ کرتی ہے بظاہر بات معقول اور درست ہے۔

والدین یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے وسائل سے بڑھ کر بچوں کے اوپر روپیہ خرچ کرتے
ور انہوں نے بچوں کو جو آسائشیں اور سہولتیں مہیا کر رکھی ہیں۔ وہ ان کے زمانے میں مفقود تھیں
اس کے باوجود اگر ان کے بچوں کی مناسب تعلیم و تربیت نہیں ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس
ذمہ دار صرف اساتذہ ہیں۔ اسی طرح اساتذہ کلاس میں بچوں کی کثرتِ تعداد، والدین کی
دلچسپی و عدم توجہی دوسرے محکموں کے مقابلے میں محکمۂ تعلیم میں مراعات کی کمی، ترقیوں کا فقدان
معاشرے میں استاد کا مقام اور اسی قبیل کی دیگر مشکلات و مسائل کا تذکرہ کر کے ہر قسم کے الزام
سے اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتے ہیں۔ طلبا نصاب کو غیر ضروری بوجھ کتابوں کی نایابی و

مالی تعطیلات کے علاوہ زیادہ تر سکولوں اور کالجوں کا چند رہنا اساتذہ کی عدم توجہی امتحان لینے والے اداروں کی زیادتیاں اور اسی قسم کی جائز مشکلات کا ذکر کر کے اپنے آپ کو ہمدردی اور شفقت کا موجب ٹھہراتے ہیں۔ اخبارات، ریڈیو، اور ٹیلیویژن وغیرہ تعلیمی معنوں اور تعلیمی پروگراموں کو پیش کر کے تعلیمی میدان میں اپنی خدمات کا لوہا منواتے ہیں الغرض انفرادی وہ ہر طبقہ کی خدمات قابل صد ستائش ہیں۔ اور کہیں بھی تنقید کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

لیکن اگر ہم تصویر کے دوسرے رخ کو بنظر غائر دیکھیں تو ہمیں تعلیمی میدان میں مسائل اور خامیوں کا ایک باہم مربوط اور لامتناہی سلسلہ نظر آئے گا۔ اور ہم جائز طور پر محسوس کریں گے کہ ہم سبھی بہت سی کوتاہیوں میں برابر کے شریک ہیں اور انفرادی طور پر کسی طبقے کو کلیتاً ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

چونکہ تعلیم کا زیادہ تعلق اساتذہ اور والدین سے ہے اس لئے سب سے پہلے میں ان کے بارے میں ایک تفصیلی جائزہ پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ تدریس کا پیشہ ایک مقدس فریضہ ہے اور بچے جو کہ مستقبل کا ایک قیمتی سرمایہ اور قوم کے لئے منابع گرانبہا ہیں اساتذہ اسی کے امین ہیں اور اگر کوئی شخص اس امانت میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے تو واقعی اس کا یہ فعل ناپسندیدہ ہی نہیں بلکہ قبیح ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا آپ نے یہ امانت صحیح ہاتھوں میں سونپی ہے؟

گزرے ہوئے اچھے دنوں میں جب معاشرتی اقدار اس قدر روبہ انحطاط نہیں تھیں اور اساتذہ کو حقیقتاً اور عملاً ایک اعلیٰ وارفع مقام حاصل تھا۔ اس دور میں لوگ بھی تدریس کا پیشہ اختیار کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ بدقسمتی سے انگریزوں کے زمانے سے اساتذہ اور مولوی صاحبان کی تحقیر اور تخفیف کا عمل تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ آج کا استاد بھی معاشرے میں مظلومیت، بے بسی اور بیچارگی کا پیکر ہے۔ اور معاشرے سے رحم اور ہمدردی کا طلبگار۔ اس کی اغلباً وجہ یہ ہے کہ ایک طرف مادی ترقی اور اقدار کے فقدان نے انسانی عظمت و اخلاق کو مادیت کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دیا ہے اور تعلیم کا مقصد

میں پرکشش اور مراعات سے بھرپور عہدوں کا حصول ہوکر رہ گیا ہے والدین اور بچوں کے نزدیک
بس یہ مقصد فوری طور پر ایسی سنہری چابی کا حصول ہے جو ان کے لئے خزانوں کے منہ کھول
دے دوسری طرف سے بڑھتی ہوئی ضروریات زندگی اور اس مادی دور کے بے پناہ
مسائل نے استاد سے قناعت کی وہ پونجی چھین لی ہے۔ جس سے تدریس کے شعبے کا
تقدس اور عظمت قائم تھی۔ اگر اعداد و شمار کی روشنی میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ
[illegible] فارغ التحصیل [illegible] اور پرکشش ملازمتوں کے لئے تگ و دو شروع کر دیتے ہیں
جن کی قسمت کا ستارہ عروج پر ہوتا ہے ان میں سے بیشتر والدین کے اثر و رسوخ کی بنا
پر کچھ اپنی قابلیت کی بنا پر اعلیٰ ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں سب سے آخر میں

محکمہ تعلیم کی باری آتی ہے ایک پڑھا لکھا شخص ہر طرف سے ناامید و مایوس ہو کر بالآخر محکمہ تعلیم
کا رخ کرتا ہے وقتی طور پر وہ اسے بھی غنیمت سمجھتا ہے لیکن اپنے ساتھیوں کی قابل رشک
حالت دیکھ کر ہر وقت ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے آخر کار ہر طرف سے ناکام اور نامراد ہو کر محکمہ
تعلیم کی ملازمت کو اپنا مقدر سمجھ کر با دلِ نخواستہ راضی برضا ہو جاتا ہے نتیجتاً نہ تو اسے تدریس
سے دلی لگاؤ ہوتا ہے نہ ہی حالات اسے تدریس سے دل بستگی و وابستگی پیدا کرنے دیتے
ہیں مزید برآں آسامی کا عارضی ہونا ایڈہاک تقرری، رہائش کا مسئلہ اور اسی طرح کی بے شمار
رکاوٹیں اسے غیر یقینی کیفیت سے دوچار رکھتی ہیں اور وہ شاید کلاس روم میں موجود ہوتے
ہوئے بھی ذہنی طور پر کہیں اور ہوتا ہے یہ صورتِ حال صرف شعبہ تعلیم تک محدود نہیں بلکہ
اکثر و بیشتر محکموں کا یہی حال ہے کیونکہ ہمارے ہاں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں ان کی اہلیت
یا پسند کے مطابق ملازمت ملتی ہو غالباً یہی وجہ ہے کہ امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے
والا ہر طالب علم ڈاکٹر بن کر ملک و قوم اور دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہے لیکن آج تک
شاید ہی کسی نے استاد بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنے کی خواہش کا اظہار
کیا ہو۔

اب معاشرے میں استاد کے مقام کی عملی شکل ملاحظہ ہو کہ اگر آپ کسی شخص سے اپنا

تعارف بحیثیت مجسٹریٹ انکم ٹیکس آفیسر کسٹم آفیسر یا پولیس آفیسر کراتے ہیں تو آپ اپنے سامنے موجودہ شخص میں والہانہ احترام تسلیم اور آنکھوں میں ایک خاص چمک پائیں گے۔ لیکن وہی شخص استاد کے تذکرے پر یا تو منہ موڑے گا یا ناگواری کا اظہار کرے گا یا اپنے کسی بچے کے داخلے میں دشواری کا تذکرہ چھیڑ دیگا۔

استاد اور شاگرد کے تعلقات کا یہ عالم ہے کہ آج کے استاد کو اگر کوئی شاگرد کلاس سے باہر سلام کر دے تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا اور وہ اسے بہت بڑی کامیابی اور خوش قسمتی سمجھتا ہے ورنہ اکثر اسے شاگرد سے مختلف ریمارکس کی ہی توقع رہتی ہے اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ آج کے طالب علم کی کامیابی زیادہ تر نقل، ٹیسٹ پیپر اور والدین کے رسوخ کا نتیجہ ہے اس لئے وہ ذہنی طور پر استاد کی عظمت تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ فنی تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ نسبتاً بہتر پوزیشن میں ہوتے ہیں لیکن ان میں سے بھی کئی ایک کسی نہ کسی عنوان سے ملکی اور گروہی سیاست میں ملوث ہو کر اپنی توانائیاں بکھیڑوں اور جوڑ توڑ میں ضائع کر دیتے ہیں۔ مذکورہ عوامل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک استاد زیادہ تر ذہنی انتشار احساس کمتری اور احساس محرومی کا شکار رہتا ہے۔ درتعلیمی میدان میں وہ خدمات سرانجام نہیں دے پاتا۔ جس کی اس سے توقع کی جاتی ہے اس کا واحد حل یہ ہے کہ محکمۂ تعلیم کو معاشی لحاظ سے پرکشش بنایا جائے تاکہ لوگ اس شعبے میں خدمات سرانجام دیکر فخر محسوس کریں نہ کہ پچھتاوا اور پشیمانی۔ نیز پرائمری سکول ٹیچر، کالج کے لیکچرار اور یونیورسٹی کے پروفیسر کا طبقاتی امتیاز ختم کرکے اساتذہ کی ملازمت کا ایسا ڈھانچہ بنایا جائے کہ وہ کسی بھی تعلیمی درجے میں اپنی موزونیت اور شوق کے مطابق تدریس کے فرائض بطرز احسن سرانجام دے سکے۔ ایک پرائمری کے استاد اور یونیورسٹی یا کالج کے پروفیسر میں تفاوت ختم کیا جائے۔ اساتذہ کے انتخاب کو مشکل اور معیاری بنایا جائے۔ اور ISSB کی طرز کا ادارہ قائم کیا جائے جو اساتذہ کو اچھی طرح جانچنے کے بعد ان کی موزونیت کے لحاظ سے ان کا انتخاب کرے اور مناسب تربیت کے بعد انہیں تدریس جیسا اہم کام سونپا جائے۔ نیز اساتذہ کو اپنے دائرہ کار میں آزادی ہو اور انہیں زیادہ سے

[illegible] اختیارات حاصل ہوں۔ مختصر یہ کہ تعلیم کو دنیا کے حصول کے لئے زیادہ اہمیت دی جائے۔

اکثر والدین کے نزدیک بچوں کو بہترین لباس، بہترین غذا، اور زندگی کی تمام [illegible]ئش مہیا کرنا اہم فریضہ ہے چاہے اس کے لئے کتنے ہی ناجائز ذرائع اختیار کیوں نہ کرنے پڑیں۔ والدین کا فرض بچوں کی جائز و ناجائز خواہشات کو پورا کرنا اور انکو بیساکھیوں کے سہارے زندگی میں آگے بڑھانا نہیں ہے بلکہ بچے میں خود اعتمادی اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے جن گھرانوں میں مذہب سے بیگانگی، غیر ملکی تہذیب سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ، اخلاقی اقدار کا فقدان، جھوٹ اور "خدا کا فضل ربی" کی غلط تعبیر کا رواج ہو، وہاں بچے بھی لازماً متاثر ہوں گے۔ اور بڑے ہو کر انہی راہوں پر چلنے کی کوشش کریں گے، وہ والدین جو بچے سے استاد کی شکایت سن کر سیخ پا ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایک معمولی استاد کو سرزنش کرنے کی جرأت کیونکر ہوئی۔ یا بچے کے ذہن میں اپنے عمل سے یہ ڈال دیتے ہیں کہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے میں وہ اس کی ہر طرح سے معاونت کریں گے۔ چاہے وہ نقل کر کے امتحان پاس کرنے کا مسئلہ ہو یا کسی ادارے میں داخلے کا یا اعلیٰ ملازمت کے حصول کا۔ ایسے والدین بچے کے ساتھ ہمدردی کی بجائے دشمنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بچہ ذہنی طور پر حساس ہونے کی بنا پر گھر میں واقع ہونے والی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا اثر لیتا ہے اس لئے بچے کو ایک صاف ستھرا، ذہنی آلائشوں اور اخلاقی پستیوں سے پاک ماحول فراہم کرنا والدین اور مقدس فریضہ ہے۔

مادی لحاظ سے اس ترقی یافتہ دور میں جہاں تجارت میں لگائے جانے والے سرمایہ سے فوری اور زیادہ منفعت حاصل کرنے کا رجحان ہے اسی طرح تعلیم پر خرچ کی ہوئی رقم [illegible] پر منفعت واپسی کا رجحان اکثر و بیشتر والدین میں پایا جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ سال [illegible] ایک بچے پر اچھا خاصہ روپیہ خرچ ہوتا ہے اور امتحان میں بچے کی ناکامی والدین کے [illegible] ایک صدمہ ہے اور تعلیم سے متعلق لوگوں پر انکا اظہار ناراضگی، تنقید اور شدید [illegible] بے فطری بات ہے لیکن اسکا بالآخر نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پرائمری درجے سے لیکر

یونیورسٹی تک امتحانی نتائج ہی تعلیمی محور بن گئے ہیں۔ اساتذہ والدین کی جلی کٹی باتیں سننے اور محکمانہ باز پرس کے خوف سے ایسی راہیں نکال لیتے ہیں جن سے امتحانی نتائج تمام عملی مشکلات کے باوجود پچھلے سالوں کی طرح شاندار رہتے ہیں اور چونکہ اداروں کی کارکردگی کو پرکھنے کا معیار بھی نتائج ہی ہیں۔ اس لئے اداروں کے سربراہ نہ صرف اساتذہ کی پردہ پوشی کرتے ہیں بلکہ اس اہم قومی خدمت میں ان کے ممد معاون بن جاتے ہیں اور یہ سلسلہ یونیورسٹی کی سطح تک چلتا ہے مزید برآں امتحان لینے والے ادارے امیدواروں کی زیادہ تعداد کو ناکام قرار دینے کی صورت میں نہ صرف عوام اور اخبارات کا ہدف تنقید بنتے ہیں۔ بلکہ ان کا اپنا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا وہ بھی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ کچھ رعایتی نمبر دیکر کامیاب امیدواروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے نتیجتاً تعلیمی معیار پرائمری سطح سے جو اونچا ہونا شروع ہوتا ہے تو یونیورسٹی تک پہنچتے پہنچتے اتنا اونچا ہو جاتا ہے کہ ایک گریجوایٹ کو ملازمت کے لئے درخواست لکھنے میں ہچکچاہٹ ہوتی ہے اور جب یہی فارغ التحصیل طلبہ حکومت کی انتظامی مشینری میں سرگرم عمل ہو کر خدمات جلیلہ سرانجام دیتے ہیں تو حکومت کے تمام منصوبے کامیاب رہتے ہیں۔ اور ترقی کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے راقم الحروف یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اگر کسی سال بورڈ یا یونیورسٹی کے نتائج معیار کے مطابق پانچ یا دس فیصد بھی ہو جائیں تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ آخر تعلیم کو محض نتائج کی حد تک محدود کر کے بچوں کی ذہنی صلاحیت کو زنگ آلود کرنے اور انہیں محض "طوطے" بنانے کا کیا فائدہ ہے اور کونسی خدمت ہے اسی ضمن میں درسی کتب کا ذکر نہ کرنا چشم پوشی ہوگی۔ ہمارے ہاں مختلف تعلیمی مدارج کے لئے رائج درسی کتب ٹیکسٹ بک بورڈ کی نگرانی میں تیار ہوتی ہیں۔ اولاً تو یہ کتابیں تقریباً ایک تہائی یا نصف تعلیمی سال گذرنے کے بعد دستیاب ہوتی ہیں۔ اور اس دوران اساتذہ اور طلبہ گومگو کی کیفیت سے دوچار رہتے ہیں۔ اور یہ قیمتی وقت صریحاً ضائع کا شکار ہو جاتا ہے دوئم ان کتابوں کی چھپائی کاغذ کوالٹی اور نفس مضمون کا انتخاب اور ترتیب انتہائی غیر معیاری ہوتے ہیں۔ سوائم ابتدائی جماعتوں کی کتابیں زیادہ تر یونیورسٹی کے اساتذہ لکھتے ہیں۔ جنہیں شاید کبھی ان جماعتوں

ٹزیب سے گزرنے کا بھی اتفاق نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نصاب میں شامل
بیشتر موضوعات بچوں کے ذہنی ادراک سے ماورا ہوتے ہیں۔ اور زبان بھی خاصی مشکل ہوتی
ہے۔ مثلاً آپ کبھی غور سے دیکھیں تو ششم جماعت کی کتاب زبان کے لحاظ سے
آٹھویں یا نویں جماعت کی نسبت مشکل محسوس ہوگی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ کتابوں کے سلسلے میں ٹیکسٹ بورڈ کی اجارہ داری قائم
رہنے کی بجائے اساتذہ کو کھلی دعوت عمل دی جائے اور انہیں چھپائی کے سلسلے میں زیادہ
سے زیادہ سہولتیں دی جائیں تاکہ تقابل کا جذبہ پیدا ہو اور بہتر کتب مارکیٹ میں آئیں۔

امتحان لینے والے ادارے بھی ٹیکسٹ بورڈ والا اصول مدنظر رکھتے ہوئے
متنی پرچے بنانے کی ذمہ داری عموماً ایسے اساتذہ پر ڈالتے ہیں جن کا ان کا اصول سے
تعلق نہیں ہوتا۔ چنانچہ امتحان کے دوران اس قسم کی خبریں اکثر اخبارات کی زینت بنتی ہیں کہ پرچہ
بہت مشکل تھا۔ پرچہ آؤٹ آف کورس تھا۔ پرچے میں ایک ہی باب سے زیادہ سوالات پوچھے
گئے ہیں وغیرہ" مذکورہ بالا حقائق کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طلبا اور اساتذہ ایسے نسخے ایجاد کرنے
کی ترکیبیں لگ جاتے ہیں جن کی مدد سے کسی نہ کسی طرح بہتر نتائج حاصل ہو سکیں۔

پاکستان کی تاریخ میں ہر حکومت تعلیم کے معاملے میں فکرمند رہی ہے جس کا بین
ثبوت نئی تعلیمی پالیسیاں ہیں اسی طرح بجٹ کا اچھا خاصہ فیصد تعلیمی اخراجات کے لئے مختص کیا
جاتا ہے ماہرین تعلیم بڑی محنت اور کاوش سے تعلیمی منصوبے بناتے ہیں لیکن اگر ناقدانہ انداز
سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نہ تو توقع کے مطابق خواندگی کے تناسب میں اضافہ ہوا ہے اور
نہ ہی ثانوی اور اعلیٰ سطح پر تعلیمی معیار بہتر ہوا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں
کے فارغ التحصیل طلبا کی غیر ممالک میں وہ پذیرائی نہیں جو غیر ملکی یونیورسٹیوں کے طلبا کی ہے اس
کے باوجود کہ ذہانت کے لحاظ سے ہمارے طلبا کسی سے کم نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ حکومت جو خطیر رقم تعلیم کی مد میں خرچ کرتی ہے کسی خامی کے باعث اس سے مطلوبہ
نتائج حاصل نہیں ہو رہے ہیں اگر ملک میں خواندگی کا تناسب زیادہ ہوتا تو شاید آج ہم صحیح سیاسی
شعور کے فقدان اور دیگر بے شمار مسائل کا شکار نہ ہوتے تعلیم عام ہونے سے شاید انتظامیہ

کی با اثر شخصیتوں کا حلقہ اپنا اثر قائم نہ رکھ سکتا۔ لیکن ملک لازمی طور پر ترقی کرتا اور ہر شعبہ میں موزوں اور ذہین افراد کی کھیپ تیار ہو جاتی ۔ ماہرین کو تعلیمی پالیسی بناتے وقت دو مقاصد مد نظر سامنے رکھنے چاہئیں۔ اولاً خواندگی کے تناسب میں فوری اضافہ - خواندگی کے تناسب میں فوری اضافہ ابتدائی اور ثانوی سطحوں پر زیادہ سے زیادہ تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے سے ہو سکتا ہے دوئم اعلیٰ تعلیم کو محدود کر کے معیار کو بڑھانا۔ بدقسمتی سے ایک تو حکومت کے پاس آمدنی کے لئے بے پناہ وسائل نہیں ہوتے کہ وہ اتنے بڑے پیمانے پر تعلیمی اخراجات پورے کر سکے۔ دوسرے صاحب ثروت لوگ تعلیمی میدان میں سرمایا فراہم کرنے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ تیسرے تعلیمی اداروں کے قومیانے سے اساتذہ کی شرائط ملازمت بے شک بہتر ہو گئی۔ لیکن تعلیمی سطح پر بہرحال نقصان ہوا ہے اور بچوں کی خاصی تعداد تعلیم سے محروم ہو گئی ہے۔ آبادی کی شرح اور ناخواندگی کے تناسب کو مدنظر رکھتے ہوئے پرائمری اور ثانوی سطح پر اداروں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کی ضرورت ہے اس کے لئے لوگوں کو نجی ادارے کھولنے کی ترغیب دی جائے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے کیونکہ تعلیمی اداروں کی کمی کلاسوں میں طلبا کی کثرت کا باعث بنتی ہے اور اس سے تدریسی عمل اور تعلیمی معیار بری طرح متاثر ہوتا ہے اعلیٰ تعلیم کے لئے صرف ذہین اور موزوں طلبا کو لیا جائے اسی طرح ڈاکٹری، انجینئرنگ اور اسی قبیل کے اور شعبوں کی بنیاد اہلیت اور بچے کا رجحان ہونا چاہیئے۔ نہ کہ والدین کی خواہش،

اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پری میڈیکل گروپ میں داخلہ لینے والے اور کامیاب ہونے والے طلبار کی بہت کم تعداد میڈیکل کالج تک پہنچ پاتی ہے طلبا کی اکثریت بہتر مستقبل کی تلاش میں بھٹکنے اور اپنی قوت و توانائی کو بے مصرف خرچ کرنے کے بعد بالآخر کہیں نہ کہیں کھپ تو جاتی ہے لیکن ان کے دلوں میں معاشرے سے نفرت اور انتقامی جذبہ وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہتا ہے اور ہمارا معصوم نوجوان قوم و ملت کے لئے سود مند ہونے کی بجائے نقصان کا موجب بنتا ہے ہمارا ملک جن حالات و مسائل کا شکار ہے۔ ان کا تقاضہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل

سنہرے خواب دیکھنے کی بجائے حقائق و تلخیوں کو سمجھے اور اس میں مصائب نامساعد حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کرے۔

یہ ایسی صورت ممکن ہے جب ہم ایک ایسا تعلیمی ڈھانچہ ترتیب دیں کہ ہماری نئی نسل کے سامنے ایک واضح نصب العین ہو اور وہ صوبائی اور دیگر ہر طرح کے تعصب سے بالاتر ہوں ایثار اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہوں غالباً یہ ہمارے مسائل کا حل ہے اور یہی ہمارے تعلیم کا بنیادی مقصد ہونا چاہیئے۔

ہمارے تعلیمی اداروں کا تقدس بحال ہو اور تعلیمی ادارے [illegible] اکھاڑے بننے کی بجائے خالصتاً تعلیمی ادارے ہوں جہاں سے طلبا ذہنی [illegible] تربیت، ایثار، جذبۂ حب الوطنی اور ایسی دیگر خصوصیات سے [illegible] ہو کر زندگی کے میدان میں داخل ہوں۔ ایسی صورت میں وہ لازماً زیادہ بہتر طریقے سے ملک کو درپیش مسائل حل کر سکیں گے۔

ڈاکٹر محمد حمید العزیز

ہماری تعلیمی ضروریات اور فنی تعلیم

اس وقت سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت انسانی علوم کو جو وسعت حاصل ہوئی ہے۔ اس نے ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اڑن کھٹولے کی کہانی اب پریوں کی داستان نہیں رہی بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جسے میں یا آپ جھٹلا نہیں سکتے۔ اس کے مظاہر زمین و آسمان پر ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ اسے ایک اتفاق سمجھئے کہ میں ایک ایسے شہر میں پیدا ہوا جہاں برصغیر میں سب سے پہلے ہوائی جہاز کی پرواز کی نمائش ہوئی۔ بچپن میں روزانہ ایک مقررہ وقت پر گنگا کے پرسکون پانی میں ہم اس اڑن کھٹولے کا عکس دیکھنے کا اہتمام کرتے اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ اس پر خود ہزاروں میل کا سفر کیا اور پھر اسے زمان و مکان سے نبرد آزما ہوتے بھی دیکھا۔ انسانی ترک و تاز کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے جو بات انہونی معلوم ہوتی تھی وہ آج ایک حقیقت ہے۔ چنانچہ آج دنیا کی ترقی یافتہ قومیں اپنے علم و فن کی بدولت تاروں کی رہ گزر سے آگے اپنی برتری کا پرچم لہرانے میں مصروف ہیں۔ ماہ و مریخ کی باتیں ایسی ہیں جیسے کسی زمانے میں بلخ و بخارا کی باتیں

.س زمانے میں شاید بجا را کا سفر زیادہ صبر آزما ہوا لیکن آج خلائی سفر کی دشواریاں
بھی دور ہوتی جا رہی ہیں۔

تعمیر و ترقی کے اس آئینہ میں جب ہم اپنی شکل دیکھتے ہیں تو کچھ دھندلی سی نظر آتی
ہے۔ ابھی ہم اس مقام پر نہیں پہنچے جہاں بعض ہم عصر زن چمن پہنچ چکے ہیں۔ اس کی
ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید ہمارے بال و پر میں ہنوز طاقت پرواز پیدا نہیں ہو سکی
یا شاید ابھی ہم پرواز کی سمت متعین نہیں کر سکے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے
کہ ابھی ہماری رسائی علم و حکمت کے ان مدارج تک نہیں ہو سکی۔ جو ہمیں شعور کی
ایسی پختگی عطا کر سکے کہ ہم بھی زمان و مکان سے گذر جانے کا اہتمام کر سکیں۔

اس مقام تک جہاں اس وقت دنیا کی ترقی یافتہ قومیں پہنچ چکی ہیں ایک جست
میں پہنچنا ممکن نہیں۔ اس کے لئے انسانی اور مادی وسائل کو بروئے کار لانے کی ضرورت
ہے جو علم و فن کے فروغ کے بغیر محال ہے اس کے حصول کے لئے صرف اوپر کے
چند تکنیکی ماہر اور کارکن ہی کافی نہیں۔ اس کے لئے عوام کی تعلیم و تربیت بھی
ضروری ہے اور عوام کی صحیح تعلیم و تربیت کا اہتمام اس وقت تک ممکن نہیں،
جب تک ناخواندگی دور کر کے اعلیٰ تعلیم کے ان شعبوں کو منظم نہ کیا جائے۔ جو
جدید علمی معلومات کی مدد سے سماجی اور اقتصادی فلاح کا دائرہ وسیع کر سکیں۔
ترقی پذیر ملکوں کا یہ ایک عظیم مسئلہ ہے جسے صرف ایک تعلیمی مسئلہ سمجھ کر اس کی علیحدہ
توضیح صحیح نہیں۔ اس کے لئے اس کے سماجی، دینی اور فکری سیاق و سباق کو فراموش
نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ قوم کے مجموعی ثقافتی سرمائے کو ہر شعبۂ
زندگی سے اس طرح مربوط کیا جائے کہ ان سب کو ملا کر حال و مستقبل کا ایک نادر
گلدستہ تیار کیا جا سکے۔ تعلیم اور قومی معیشت، معاشرتی یک جہتی، فکری پرداخت
سب کا ایک دوسرے سے تعلق ہے اور اسی ہیولیٰ سے قوم کا کالبد تیار ہوتا ہے۔
ان عناصر کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا صحیح نہیں۔

اس قسم کا ارتباط پیدا کرنے کا کام خاصا مشکل ہے استعماریت نے ہمارے قرائے

ذہنی کو ماؤف کر دیا۔ اور ہم فکر و نظر کی وہ شوخی پیدا کرنے سے قاصر ہیں جو ہمیں یزداں
اور شاہین شکار بناتی ہے۔ اس کے حصول کے لئے ہمیں اپنے کاروبار حیات میں ایک انقلاب
لانے کی ضرورت ہوگی۔ فکر کے انداز کو بدلنا ہوگا اور اپنے اسلوب کار میں آفاقیت
پیدا کرنی ہوگی۔ کیا یہ انقلاب لانا مشکل ہے؟ مرداں چنیں کنند۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں
انقلاب آ بھی سکتا ہے اور انقلاب لایا بھی جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعے کا
اعادہ بے محل نہ ہوگا۔ یہ کوئی دس گیارہ سال پرانی بات ہے۔ اس وقت میں لندن
یونیورسٹی میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک تقریب میں
میں سر جان سارجنٹ (SIR JOHN SARGENT) سابق کمشنر تعلیم حکومت
ہند نے پاکستان اور ہندوستان کے تعلیمی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے ایک بڑی
بات کہی۔ انہوں نے فرمایا۔

THE SOLUTION OF THE EDUCATIONAL PROBLEMS OF INDIA AND PAKISTAN LIES IN TAPPING THE UNTAPPED INTELLIGENCE OF SCORES OF OTHERWISE OBSCURE PEOPLE.

یعنی پاکستان اور ہندوستان کے مسائل تعلیم کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ ان کے
ذہنوں سے کام لیا جائے جن سے اب تک کوئی کام نہیں لیا گیا۔
دور جدید میں کسی قوم کی تعمیر و ترقی اور سماجی و اقتصادی فلاح کے لئے

اس کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں ہو سکتی۔ جن ذہنوں سے کام نہیں لیا جاتا۔ وہ رفتہ
رفتہ بیکار ہو جاتے ہیں اور ان کی صلاحیتیں فلاح ملک و ملت کی بجائے کسی
اور چیز میں صرف ہو جاتی ہیں۔ اس لئے جب قومی تعمیر و ترقی کی بات کی جائے تو
سب سے پہلے اس اصول کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ کہ قومی معیشت کی ضروریات
کے مطابق مختلف قسم کی صلاحیتوں کو کس طرح بروئے کار لایا جائے۔ اقوام

متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق اقتصادی ترقی کے لئے سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ ایسے نظامِ تعلیم کو حاصل کیا جائے جو قوم کی سماجی و اقتصادی، معاشی اور فنی ضروریات کو پورا کر سکے "[2]

لہٰذا یہ چند عام چلتے پھرتے الفاظ ہیں لیکن ان سے ترقی پذیر ملکوں کی اقتصادی ترقی کی منزل متعین ہو جاتی ہے۔ پاکستان کے تیسرے پنج سالہ ترقیاتی منصوبے میں بھی اسی نظریے کو سامنے رکھا گیا ہے، جس کی وضاحت منصوبے کے پیش لفظ میں اس طرح کی گئی ہے[3]

"اسلامی سوشلزم کے قیام کے لئے بنیادی بات مساوی مواقع کی فراہمی ہے۔ اس اصول کے تین بنیادی نکات ہیں۔ اول یہ کہ تعلیم عام، مفت اور لازمی کر دی جائے۔ دوم یہ کہ ہر سطح پر امتیازی وظیفے فراہم کئے جائیں۔ سوم یہ کہ ہر سطح پر ملازمت کے لئے مقابلے کے مواقع میسر ہوں۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب تعلیم اور سماجی منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ ایک ایسے تعمیر و ترقی کے یکساں مواقع بہم حاصل ہوں"

اس پالیسی کے مطابق تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ایک طرف متوازن تعلیمی ترقی کا اہتمام کیا گیا ہے اور دوسری طرف تعلیمی ترقی کو قومی زندگی کے دوسرے شعبوں سے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔ اس باہمی ارتباط کا مقصد یہ ہے کہ کسی شعبے میں ترقی غیر متوازن اور غیر مربوط نہ ہو۔

تعلیم کو دوسرے شعبوں سے مربوط کرنے کا جو منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ اس میں

---

(2) UNITED NATIONS REPORT ON THE UNITED NATION CONFERENCE OF CIT, P. 17

(3) THE THIRD FIVE YEAR PLAN 1965--70 P. V.

پر مجموعی طور پر تین ارب تین کروڑ (۳۰۳،۰۰،۰۰،۰۰۰) روپے صرف ہونگے اس میں ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ اور فنی تعلیم کے مصارف بھی شامل ہیں۔ تربیت اساتذہ کی مد میں تیرہ کروڑ اسی لاکھ (۱۳،۸۰،۰۰،۰۰۰) روپے ہیں اور فنی تعلیم کے لئے تریسٹھ کروڑ ستر لاکھ (۶۳،۷۰،۰۰،۰۰۰) روپے تھے

فنی ضروریات کے مطابق اس منصوبے کی تکمیل کے لئے جو تخمینہ پانچ سال کے لئے لگایا گیا ہے۔ اسے افرادی قوت کے لحاظ سے چار سطحوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۵)

۱۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ جن کے پاس یونیورسٹی ڈگری ہے۔
۲۔ تربیت یافتہ جن کے پاس ڈپلوما ہے (ایسا ڈپلوما جو بالعموم ہائی اسکول کے بعد دو یا تین سال کی تربیت حاصل کرنے پر ملتا ہے۔)
۳۔ ایسے تربیت یافتہ جن کے پاس صرف سرٹیفیکیٹ ہے۔ (ایسا سرٹیفیکیٹ جس کی مدت تربیت ہائی اسکول کے بعد تین سال سے کم ہو۔
۴۔ ایسے تربیت یافتہ جن کے پاس منظور شدہ سرٹیفیکیٹ نہیں ہے (ایسا سرٹیفیکیٹ جس کی تربیت کے لئے ہائی اسکول تک تعلیم ضروری نہیں۔)

تیسرے پنج سالہ منصوبے کے مطابق پہلی سطح پر ۱۹۷۰ء تک پہلی ۱۲،۱۰۰ مزید انجینیروں کی ضرورت ہوگی۔ منصوبے کے اختتام تک ان کی متوقع تعداد چھ ہزار ہو جائے گی۔ اس طرح گویا منصوبے کی تکمیل کے بعد بھی ۷،۱۰۰ انجینیروں کی کمی ہوگی اسی طرح ڈپلوما کی سطح پر ۳۷،۲۰۰ افراد کی ضرورت ہوگی۔ تخمینے کے مطابق یہ

---

(4) THE THIRD FIVEY EARPLAN. PP. 214-215

(5) THE THIRD FIVE YEAR PLAN. OP. CIT, P. 220.

کی تقریباً ۲۶,۶۰۰ ہوگی۔ بینکنگ اور اکاؤنٹنسی میں بھی حالات کچھ اسی قسم کے ہیں۔ تربیت یافتگان کی متوقع تعداد ۲,۸۰۰ ہے۔ جو متوقع ضرورت کو پورا نہیں کرسکے گی۔ دوسری درمیانی سطحوں پر حالات اور بھی پیچیدہ ہیں۔ متوقع ضروریات کے پیش نظر ... ۳۰,۰۰۰ تربیت یافتہ افراد کی ضرورت ہوگی اور تربیت یافتگان کی متوقع تعداد ۱۲,۵۰۰ ہوگی[6]

یہ افرادی قوت اور قومی ضروریات کا ایک سرسری جائزہ ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کام خاصا مشکل ہے۔ اگر صحیح منصوبہ بندی کے بعد مادی اور انسانی وسائل کو اس کے حصول میں نہ لگایا گیا تو یہ قومی ہدف (TARGETS) کسی طرح نہیں کئے جاسکتے۔ تعلیم و تربیت کے باب میں جو رقم فنی تعلیم کے لئے مخصوص کی گئی ہے، وہ ۶۳,۷۰,۰۰,۰۰۰ روپے ہے۔ مغربی پاکستان کے لئے یہ رقم ۲۷,۰۰,۰۰,۰۰۰ روپے ہے اور مشرقی پاکستان[a] کے لئے ۳۶,۰۰,۰۰,۰۰۰ روپے۔ رواں مصارف ۱۲,۵۰,۰۰,۰۰۰ روپے ہوں گے۔ جن میں سے ۲,۵۰,۰۰,۰۰۰ روپے مغربی پاکستان کے فنی اداروں پر تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے مطابق اس مد میں جو رقم مخصوص کی گئی تھی۔ اس پر کہاں تک عمل درآمد ہوا اور اب آگے بڑھنے کا نقطۂ آغاز کیا ہے۔ اس کے متعلق کوئی بات اس وقت تک نہیں کہی جاسکتی جب تک اس منصوبہ کی کامیابی اور ناکامی کا مکمل جائزہ نہ لیا جائے۔

اس وقت میں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی ضروریات پر بحث نہیں کروں گا، اس لئے نہیں کہ ہماری تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں ان کی اہمیت نہیں، بلکہ اس کے لئے موضوع کا تقاضا صرف فنی تعلیم کی ضروریات کا جائزہ

---

[a] یہ مضمون بنگلہ دیش کے قیام سے قبل لکھا گیا

(6) IBID, P. 221.

(7) IBID, P. 214.

لینا ہے۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے کے تخمینے کے مطابق میں نے جو عرض کیا ہے
اُس سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور پر
ہم ابھی فنی تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ جو ادارے فنی تعلیم کی ترویج کے لئے قا
کئے گئے ہیں۔ وہ ابھی اس معیار کو نہیں پہنچ سکے کہ اس دور کے تقاضوں کو پ
طور پر پورا کر سکیں ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں یہ ادارے ابھی ابتدائی مر
حلے ہیں اور ان کی تعداد بھی اتنی کم ہے جو ہماری بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہیں دے
مغربی پاکستان کی فنی تعلیم گاہوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قومی ضروریات کے لحاظ سے
یہ تناسب بہت کم ہے۔ جدول نمبر ۱ اور جدول نمبر ۲ سے اسکی وضاحت ہو جائیگی ۵

جدول نمبر ۱

(مغربی پاکستان میں پولی ٹیکنیک اداروں کی تعداد ۱۹۶۶ء)[۱]

صنف	تعداد (پولی ٹیکنیک)	تعداد طلبا و طالبات
طلبا	۱۸	۷،۳۰۴
طالبات	۱	۷۵
میزان	۱۹	۷،۳۷۹

جدول نمبر ۲ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ در اصل مغربی پاکستان
میں فنی تعلیم کا عددی خاکہ ہے۔ جس میں اداروں کی تعداد
سے لے کر طلبا اور اساتذہ کی تعداد اور رواں مصارف کے اعداد و شمار درج ہیں۔

5) BUREAU OF EDUCATION, LAHORE.

جدول نمبر ۲

	۱۹۶۲-۶۳ء	۱۹۶۳-۶۴ء	۱۹۶۴-۶۵ء	۱۹۶۵-۶۶ء	۱۹۶۶-۶۷ء
تعداد ادارہ	۸	۹	۱۳	۱۶	۱۹
تعداد درخواست دہندگان	-	۵۷۰۸	۷۰۰۵	۸۹۱۱	۹۲۵۷
تعداد طلبہ جو داخل ہوئے	-	۲۰۱۵	۲۲۰۰	۲۷۰۱	۳۱۳۱
تعداد طلبہ و طالبات	۳۲۳۱	۵۶۹۵	۵۱۲۰	۳۵ طالبات	۷۴۱۹
	-	-	-	۷۳۸۴	-
تعداد اساتذہ	۳۵۹	۳۹۷	۴۱۰	۴۵۰	۵۶۰
خرچ (ہزار روپیہ میں)	۵۲۲۶	۵۲۸۲	۳۸۶۶	۳۳۴۲	۹۴۳۳

ب ا۔ کمرشل سنٹر

	۱۹۶۲-۶۳ء	۱۹۶۳-۶۴ء	۱۹۶۴-۶۵ء	۱۹۶۵-۶۶ء	۱۹۶۶-۶۷ء
تعداد ادارہ	۱۱	۲۲	۲۲	۳۰	۲۳
تعداد درخواست دہندگان	-	۲۵۱۹	۲۳۹۶	۲۶۸۹	۳۷۷۹
تعداد طلبہ جو داخل ہوئے	-	۱۸۵۸	۱۹۱۷	۱۹۹۳	۲۸۴۴
تعداد طلبہ و طالبات	۷۵۴	۱۹۳۲	۲۳۱۸	۲۸۴۱	۳۶۵۰
تعداد اساتذہ	۴۲	۹۳	۱۰۱	۹۶	۱۱۱
خرچ (ہزار روپیہ میں)	۳۰۹	۷۴۱	۸۶۴	۸۴۱	۱۵۰۸

پاکستان کے فنی اداروں سے اس سے مختلف ہیں۔ چونکہ ملکی صنعت کا فنی تربیت گاہوں سے ابھی یہ رابطہ قائم نہیں ہو سکا کہ صنعتی ضروریات کے مطابق فنی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ اس لئے دونوں کے اپنے اپنے راستے ہیں۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ ہمارے یہاں ہر بات اٹکل سے ہوتی چلی جاتی ہے جس کا نتیجہ خاصا دل شکن ہوتا ہے۔ جو افراد ان فنی اداروں میں تربیت پاتے ہیں انہیں ملازمت نہیں ملتی تو وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں نہ انہیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے اور نہ ملکی صنعت ان کی تربیت سے کوئی فائدہ اٹھاتی ہے اور غور کیجئے تو یہ کتنا بڑا قومی ضیاع ہے۔

ابھی چند دن کی بات ہے۔ پرنسپل لاہور پولی ٹیکنیک نے ایک جلسۂ عام میں وزیر تعلیم کی خدمت میں طلبا کی ان دشواریوں کا ذکر کیا جو انہیں بعد از حصول سند تلاشِ معاش کے سلسلے میں پیش آتی ہیں۔ اسی جلسے میں ایک طالب علم نے ایک کوڑھی کا سوانگ بھرا اور بڑی دیر تک محض یہی صدا لگاتا رہا "بھائیو میرے پاس ایک پالی ٹیکنیک کا ڈپلوما ہے۔ مجھے دیکھو میں نے ڈپلوما کیا ہے" بظاہر یہ سوانگ از راہِ تفنن پیش کیا گیا تھا لیکن اس کا مقصد ان دشواریوں کو بے نقاب کرنا تھا جو ٹیکنیکل سرٹیفیکیٹ یا ٹیکنیکل ڈپلوما کے حاملین کو پیش آ رہی ہیں۔

پاکستان کے فنی اداروں میں ہر فن (TECHNOLOGY) کی تعداد کسی منطقی اصول کے تحت مخصوص نہیں۔ اس لئے بعض اوقات طالب علم از خود ایک راہ اختیار کر لیتا ہے اور اسے اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب حصول ملازمت کی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم اپنی ذہنی افتاد کے پیش نظر تکمیل فن کی منزل متعین نہیں کرتا۔ اس کا تمام تر انحصار حالات پر ہوتا ہے اسے کون سا مضمون پڑھنا اور کس پیشے میں جانا ہے۔ اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے اور شائد ہمارے نظام کار میں اس بات کا کسی سائنٹیفک اور اصولی بنیاد پر طے کرنا

ممکن بھی نہیں، اس لئے کہ اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ ملک کی فنی اور صنعتی ضروریات کیا ہیں۔ حصولِ سند کی خاطر کسی فن میں اختصاصِ فن کی صورت نکالی جاتی ہے اور بس۔

جدول نمبر ۴ میں مغربی پاکستان کے فنی اداروں کے فن وار (TECHNOLOGYWISE) اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں[1] اس میں مختلف فنون کی تقسیم، منصوبہ بندی کے کسی اصول کے مطابق ضرور کی گئی ہوگی۔ بلکہ اگر ان کے فیصدی تناسب کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا۔

جدول نمبر ۴۔

مغربی پاکستان میں طلبا اور طالبات کی ٹیکنالوجی کے لحاظ سے تقسیم

۱۹۶۶ - ۶۷ء

ٹیکنالوجی (TECHNOLOGY)		تعداد ٹیکنالوجی کے لحاظ سے		فیصدی تقسیم ٹیکنالوجی کے لحاظ سے	
		طلبا	طالبات	طلبا	طالبات
آٹو ڈیزل	AUTO DIESEL	۲۰۵	-	۲٫۶۷	-
سول	CIVIL	۱۶۳۷	-	۲۲٫۶۱	-
الیکٹریکل	ELECTRICAL	۱۷۲۶	-	۲۳٫۶۲	-
میکینکل	MECHANICAL	۱۵۶۸	-	۲۱٫۶۱	-
ریڈیو	RADIO	۳۱۰	-	۴٫۱	-
پاور (طاقت)	POWER	۹۲	-	۱٫۲	-
ٹول ڈرائنگ	TOOL DRAWING	۱۱۶	-	۱٫۵	-
ڈرافٹ و ڈیزائن	DRAFT & DESIGN	۱۷۱	-	۲٫۳	-
ٹیکسٹائل (پارچہ بافی)	TEXTILE	۱۴۷	-	۱٫۹	-

[1] بیورو آف ایجوکیشن (دفتر تعلیمات)، سابق حکومت مغربی پاکستان لاہور۔

	تعداد (ٹیکنالوجی کے لحاظ سے)		فیصدی تقسیم (ٹیکنالوجی کے لحاظ سے)	
	طلبا	طالبات	طلبا	طالبات
ائیر کنڈیشننگ AIR CONDITIONING	۲۹۱	-	۱٫۶۹	-
آٹو موبائل AUTO MOBILE	۴۶۱	-	۱٫۶۲	-
کیمیکل CHEMICAL	۱۴۲	-	۱٫۶۹	-
کامرس (تجارت) COMMERCE	-	۳۵	-	۰٫۶۴
مشین شاپ MACHINE SHOP	۱۱۱	-	۱٫۶۴	-
میٹل ویلڈنگ MACHINE WELDING	۱۶۶	-	۲٫۶۳	-
فونڈری FOUNDRY	۹۶	-	۱٫۶۲	-
ٹیلی ویژن TELEVISION	۹۵	-	۱٫۶۳	-
لکڑی کا کام WOOD WORK	۴۰	-	٫۶۵	-
میزان TOTAL	۴۳۸۴	۳۵	۹۹٫۳۶	٫۶۴

طاقت (POWER) اور پارچہ بافی (TEXTILE) کا فیصدی تناسب سب سے کم ہے یعنی دونوں کا الگ الگ تناسب ۱۵ ہے اور مجموعی تناسب کل کا ۳۰٫۰ فیصدی ہے ممکن ہے اس میں کوئی گہرا ٹیکنیکی فلسفہ مضمر ہو۔ لیکن بظاہر یہ تقسیم غیر متوازن سے معلوم ہوتی ہے۔ میں یہ بات حاضرین فن کے حضور پیش کر رہا ہوں۔ میری اس جسارت کو گستاخی پر محمول نہ کیا جائے بلکہ ایک عام انسان کے لئے اس میں جو ابہام ہے اسے دور کر دیا جائے تاکہ فنی تعلیم کا یہ خاکہ کچھ بھینگا سا نظر نہ آئے۔
ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم کا انداز اور اس کا منہج بدل گیا ہے۔ ابتدائی ثانوی اور فنی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک ہر سطح کا اپنا معیار ہے اور یہ سب ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ایک کی بنیاد پر دوسری کی عمارت تعمیر ہوتی چلی جاتی ہے ہمارے نظام تعلیم میں ابھی وہ فکری تبدیلی پیدا نہیں ہوئی کہ ہم تعلیم کی متوازن

ترقی کا صحیح تصور اپنے ذہن میں پیدا کر سکیں۔ جو اہل علم اور اہل رائے اعلیٰ تعلیم سے متعلق ہیں۔ انہیں ساون کے اندھے کی طرح ہر چیز ہری نظر آتی ہے۔ یہ بات بڑی حسنت ہے لیکن بات یہی ہے کہ ان کی نگاہ میں ابتدائی، ثانوی اور فنی تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس لئے بات اوپر سے چلتی ہے، حتیٰ کہ نصاب کی تدوین کو سلسلہ بھی اوپر سے شروع ہو کر نیچے کی طرف آتا ہے۔ وہی تقاطر والی بات لیکن تنظیر ہو، تو جانیں اور تقطیر ہوتی نہیں۔

ہمارے نظام تعلیم کے اس نقص پر اکثر تنقید بھی ہوتی رہتی ہے اور اصلاح حال کی کوشش ت بھی۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی محسوس نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اصلاح کے لفظ میں بڑی جاذبیت ہے۔ خواہ اصلاح " قطع گیسو کے باؤ" ہی پر کیوں نہ منتج ہو، چنانچہ اصلاحی کاوشوں میں اب ایک اور انداز فکر کارفرما نظر آنے لگا ہے بعض مصلحین نے سوچا کہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ اوپر کی اصلاح سے مراد نیچے کی اصلاح بھی ہے۔ تعلیمی نقطۂ نگاہ سے یہ بات صحیح نہیں اس لئے اس خیال کی بھی اصلاح کی جائے اور تجدید کار کی کوئی نئی راہ نکالی جائے۔ چنانچہ بڑے غور و خوض کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ قرین مصلحت یہی ہے کہ اس نظریئے کو ترک کر کے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر لیا جائے "کچھ نہ سہی تو جدت ہی سہی"۔ اس طرح ایک دو سال سے اصلاح نصاب کی جو مہم چلی تو ہم نے پہلے بی ایڈ کے نصاب کی اصلاح کی۔ اس کے بعد ایس۔ وی، جے۔ وی کے نصاب کی اور اب شائد ایم۔ ایڈ کا نمبر آ جائے۔ اسی طرح پہلے انٹر سائنس کے نصاب کی اصلاح کی پھر ہائی اسکول کے سائنس کے نصاب کی اور پھر بی۔ ایس۔ سی کے نصاب کی۔ اس ادارے میں نارمل کرو (NORMAL CURVE) کا اکثر ذکر ہوتا رہتا ہے اور شائد عمل بھی۔ معلوم نہیں اس نصابی واردات کا CURVE بنائیں تو کون سا بنے گا۔

تعلیم میں توازن سے میری مراد یہ ہے کہ کسی شعبے کو فراموش نہ کیا جائے۔ ابتدائی، ثانوی، فنی اور اعلیٰ تعلیم کی توسیع و ترقی اپنی اپنی افادیت اور اہمیت

کے مطابق ہو، نہ یہ کہ ایک کا دوسرے پر غلبہ ہو۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ جو صنعتی اور اقتصادی ترقی ہو رہی ہے۔ اس میں ثانوی تعلیم کا بڑا رول ہے۔ لیکن کس قسم کی ثانوی تعلیم کا؟ اس ثانوی تعلیم کا جو ہم اپنے ثانوی مدارس میں فراہم کرتے ہیں یا اس ثانوی تعلیم کا جو قومی زندگی کے ہر شعبے کو ایک نیا ولولہ عطا کر سکے؟ یقیناً جواب یہی ہوگا کہ ہم ایک ایسی ثانوی تعلیم کے آرزومند ہوں گے جو ہمارے شعور کو آفاقی بنا سکے۔ لیکن اگر سارے نظام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ثانوی مدارس میں ابھی کوئی فکری تبدیلی پیدا نہیں ہوتی اور اگر ہم ان میں کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو اکثر اداروں کی خوشہ چینی ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ بھی ایسی جس سے اپنا بھونڈا پن واضح ہو جاتا ہے۔

برطانیہ اور امریکہ میں اس وقت جامع مدارس (COMPREHENSIVE SCHOOLS) کا غلغلہ ہے۔ توسیع و ترقی کے خیال سے ہم نے بھی جامع مدارس کا خاکہ مرتب کر لیا اور انہیں چلانے کی کوشش بھی کی۔ یہ کوشش برحق، لیکن ابھی تک ہم نے یہ نہیں سوچا کہ ان مدارس کا عمومی مدارس کے نظام کار سے کیا تعلق ہوگا؟ خود ان کا نصاب کس حد تک قومی ضروریات کا کفیل ہوگا؟ ان مدرسوں میں پڑھانے والوں کی علمی اور فنی تربیت کا معیار کیا ہوگا؟ اور ان کا من حیث المجموع ہمارے نظام تعلیم پر کیا اثر پڑے گا؟ ابھی یہ ادارے اپنے ابتدائی مدارج میں ہیں۔ اس لئے ان کے خدوخال کے ابھرنے میں وقت لگے گا۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں داخلے کا ایک خاص معیار مقرر ہوگا اور صرف ذہین طلبا (TALENTED STUDENTS) ہی کو ان میں بازیابی حاصل ہو سکے گی۔ جامع مدارس کی اس تعریف سے ایک بات کی وضاحت ضرور ہو جاتی ہے کہ جامع مدارس برطانوی اور امریکی جامع مدارس سے مختلف ہوں گے۔ لیکن ابھی یہ بات قطعی طور پر واضح نہیں کہ آگے چل کر ان کی ہیئت کیا ہوگی۔ جب کسی ادارے کو صرف ذہین طلبا کے لئے مخصوص کرنے کا اعلان کیا جاتا ہے تو اس سے کچھ شکوک پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ مدارس نام نہاد انگریزی

سٹ اسکولوں کا بدل بن جائیں گے یا ان میں فی الواقع وہ جامعیت پیدا ہوجائے گی جو اس قسم کے مدارس کا مطلوب و مقصود ہے؟ اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن نئے اداروں کا قیام ایک ندرت ضرور ہے اور ندرت ہی کیا کم ہے۔ آخر اس پر فخر کیوں نہ کیا جائے۔

صنعتی ممالک میں جامع مدارس علمی اور فنی ضروریات کے ملتقیٰ سمجھے جاتے ہیں۔ ایک ہی ادارے میں انواع و اقسام کے مضامین کی تدریس کا انتظام ہوتا ہے تاکہ ہر مزاج اور ذہنی سطح کے طالب علم کو اس کی اپنی افتاد کے مطابق اپنی ذہنی وابستگی کا سامان مل جائے۔ برطانیہ میں اس وقت جامع مدرسہ کا جو تجربہ ہو رہا ہے، وہ برطانیہ کے نئے ماحول اور نئے تقاضوں کا امین ہوگا۔ جن میں ہر قسم کے مضامین کی تدریس کا اچھے سے اچھا انتظام ہوگا۔ ان میں فلسفہ، ادب، اور تاریخ جیسے علمی مضامین بھی شامل ہوں گے اور نجاری، حدادی اور معماری جیسے فنی مضامین بھی۔

روس میں فنی تعلیم کی عظیم ذمہ داری ان کے ثانوی مدارس پر عائد ہوتی ہے۔ آٹھ سالہ ثانوی مدرسہ اگرچہ عمومی تعلیم کے لئے مختص ہے۔ لیکن اس کے نصاب اور منصوبات کار سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں فنی تعلیم کو خاصی فوقیت حاصل ہے۔ یہ ادارہ غیر مکمل عمومی ثم فنی مدرسہ (INCOMPLETE GENERAL AND POLYTECHNICAL SCHOOL) کہلاتا ہے جو روس کے اشتراکی اقتصادی نظام کی اہم کڑی ہے اور جس میں سات سے پندرہ یا سولہ سال کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں[12] اس کے مضامین تدریس تین حصوں میں منقسم ہیں، جن میں وہ تمام مضامین شامل ہیں جو ایک ہمہ گیر تعلیم کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں یعنی سائنس آرٹس، تربیت جسمانی اور دستی اور فنی تربیت۔ ان اداروں میں کام کی سالانہ اوسط

(12) SHAPOVALENKO, S. G. POLYTECHNICAL EDUCATION IN THE USSR, UNESCO. 1963. PP. 82-107.

مضامین	ہر درجے کے مضامین کے ہفتہ وار پیریڈ				کل تعداد
	۹	۱۰	۱۱	کل	
معاشی جغرافیہ	-	٢	٢	٤	١٤٨
سیاسیات	٤	٤	٢	١٠	٣٨٢
ہیئت	-	١	-	١	٣٩
کیمیا	٢	٣	٢	٧	٢٦٥
حیاتیات	٣	-	-	٣	١١٧
ٹیکنیکل ڈرائنگ	٢	-	-	٢	٧٨
بیرونی زبان	٢	٢	٣	٧	٢٦١
تربیت جسمانی	٢	٢	٢	٦	٢٣٦
میزان	٢٤	٢٤	٢٤	٧٢	٢٧١٢
عمومی ٹیکنیکل مضامین	١٢	١٢	١٢	٣٦	١٣٥٦
کل میزان	٣٦	٣٦	٣٦	١٠٨	٤٠٦٨
اختیاری مضمون	٢	٢	٢	٦	٢٢٦

اس نصاب کا مقصد ایسی تعلیم کا مہیا کرنا ہے، جو علمی یا فنی اختصاص میں طلبا کو مدد کر سکے۔ جو طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں اور جو کسی فن یا پیشہ ورانہ تربیت کے خواہاں ہیں۔ ان کے لئے اس کو جو نتیجے موجود ہوں۔ جدول نمبر میں ایک دیہی ثانوی مدرسے کا وقت نامہ درج ہے۔ [5]

---

(5) IBID, P. 100

مضامین	ہر درجے کے مضامین کے ہفتہ وار پیریڈ				کل تعداد
	۹	۱۰	۱۱	کل	
اصول علم السیاسیات	۰	۰		۲	۶۳
معاشی جغرافیہ	-	۳/۲	۲/۳	۵	۱۵۵
طبیعات	۵	۵	۳/۲	۱۳٫۵	۳۸۰
ہیئت	-	۱	-	۱	۳۰
کیمیا	۳/۲	۳	۳	۸٫۵	۲۶۱
حیاتیات	۴	-	-	۴	۱۲۰
ٹیکنیکل ڈرائنگ	۳/۲	۰	-	۲٫۵	۷۵
بیرونی زبان	۳	۳	۳	۹	۲۷۶
تربیت جسمانی	۲	۲	۳	۷	۲۱۶
میزان	۳۱	۲۸	۲۹	۸۰	۲۶۹۸
زرعی پیداوار کے اصول اور پروڈکشن کی تربیت (نظری اور عملی)	۵	۸	۷	۲۰	۶۱۴
میزان	۳۶	۳۶	۳۶	۱۰۸	۳۳۱۲
موسم کے اعتبار سے پروڈکشن کا کام					
دن	۵۴	۵۴	۱۸	-	۱۲۶
گھنٹے	۳۲۴	۳۲۴	۱۰۸	-	۷۵۶
کل میزان	-	-	-	-	۴۰۶۸
اختیاری مضمون	۲	۲	۲	۶	۱۸۴

ان دونوں قسم کے مدرسوں کے علاوہ روس میں ایک تیسری قسم شبانہ فنی مدارس کی ہے۔ اس میں ان طلبا کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہے۔ جو آٹھ سالہ ثانوی مدرسے کی تکمیل کے بعد کسی صنعتی ادارے میں ملازم ہیں یا کسی ثقافتی یا سماجی کام میں مصروف ہیں۔ جدول نمبر ۸ سے اس مدرسے کے پروگرام اور نظام اوقات کی وضاحت ہو جائے گی۔[۱۶]

جدول نمبر ۸

شبانہ (شفٹ موسمی) ثانوی عمومی تعلیمی مدارس کا وقت نامہ

مضامین	ہر درجے کے ہفتہ وار پیریڈ			کل تعداد
ادب	۲	۳	۲	۶
ریاضی	۳	۳	۳	۹
تاریخ	۱	۲/۱	۲	۵ر۴
اصول علم السیاسیات	-	-	۱	۱
معاشی جغرافیہ	-	۲/۱	۱/۲	۳
طبعیات	۳	۳	۲	۸
ہیئت	-	۰/۱	-	۵ر۰
کیمیا	۱/۲	۲	۲/۱	۵
حیاتیات	۲/۱	-	-	۱ر۵
ٹیکنیکل ڈرائنگ	۱/۲	-	-	۱ر۵
بیرونی زبان	۲/۱	۱/۲	۲	۵
میزان	۱۵	۱۵	۱۵	۴۵

(16) IBID, P. 101

مضامین	ہر درجے کے ہفتہ وار پیریڈ			کل تعداد
اختیاری مضامین پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے	۲	۲	۲	۶
تالیفی (ٹیوٹوریل)	۳	۳	۳	۹
کل میزان	۲۰	۲۰	۲۰	۶۰

ان تینوں ادوار کا بنیادی مقصد طلبا میں اعلیٰ فنی استعداد پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ لیکن فنی مضامین کے ساتھ ادب ، ریاضی ، تاریخ ، اصول ، علم السیاسیات معاشی جغرافیہ ، طبیعیات ، ہیئت ، کیمیا ، حیوانیات جیسے مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنی زندگی میں توازن قائم کر سکیں ۔[۱۷]

بات لمبی ہے ۔ اسے جتنا طول دینا چاہیں دے سکتے ہیں ۔ ذکر محبوب اور کاکل پیچاں ، سو طرح مضمون باندھئیے ، لیکن تعمیر و ترقی کی بات کچھ اور ہوتی ہے کچھ سبز باغ بھی ، لیکن زیادہ مبنی بر حقیقت ۔ میں نے اس وقت آپ کے سامنے جو اعداد و شمار پیش کئے ہیں ۔ شائد آپ ان سے گھبرا گئے ہوں ۔ لیکن اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ آپ کے سامنے محض رامش و رنگ کی باتیں نہ کروں بلکہ یہ بھی بتا دوں کہ دوسرے کہاں ہیں اور ہمیں منزل تک پہنچنے میں کیا کیا دشواریاں پیش آنے والی ہیں اور آپ کو ذہنی طور پر آمادہ کر سکوں کہ یہ کام کرنے کا ہے اور آپ سب نے کرنے کا ہے ۔ بالخصوص ان لوگوں کے کرنے کا جو خوش و ناخوش فنی تعلیم کے مدرس بن چکے ہیں یا بننے والے ہیں ۔ فنی تعلیم کا مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے ۔ اسے آپ جس طرف لے جانا چاہیں گے ، لے جائیں گے ۔ لیکن

---

(17) SHAPOVALENKO, S.G, OP. CIT, P.P. 92-101

مجھے یقین ہے کہ عزم و ہمت کے ساتھ آپ ان خار دار وادیوں سے گزر جائیں گے اور ایک دن اس اندھیرے میں وہ صبح اُمید نظر آجائے گی۔ جس کے ہم منتظر ہیں۔

زاہد رسول اختر

مقاصد تعلیم اور پاکستان

افزائشِ نسل کے ذریعہ جسمانی بقا کے تسلسل کو برقرار اور قائم رکھنا
تمام جانداروں کا خاصہ ہے۔ لیکن انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے۔ جسمانی بقا کو
اپنے لئے باعثِ تسکین خیال نہیں کرتا۔ وہ اس زندگی کا متمنی ہے جو اس کی فنا کے بعد بھی
قائم رہے۔ وہ جسمانی زندگی کے ساتھ ساتھ رسم و رواج، معاشرتی زندگی۔ اعتقادات
تفریحات اور اپنی کامیابیوں و ناکامیوں کی زندگی کی بقا کا بھی خواہاں ہے۔ انسان کی
سوچ کا ابتدا سے ہی یہ تقاضہ رہا ہے کہ اس کے بلند و بالا مقاصد، امیدوں اور
رسم و رواج کو بھی اس کی طرح زندگی حاصل ہو اور وہ اس کے مرنے کے بعد بھی
تابندہ رہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنی ذہنی، جسمانی اور تخلیقی قوتوں
کو بروئے کار لا کر اس کے لئے کوئی ذریعہ تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ انسان کی
اس تلاش کو تسکین دینے کے لئے صرف تعلیم ہی ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ کیونکہ اپنے
وسیع تر معنوں میں تعلیم ایک لگاتار معاشرتی تجدید کا نام ہے۔ یہ اس عمل کا نام ہے

کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی بہتر نشو و نما ملک کو ترقی کی راہوں پر گامزن کر سکتی ہے۔ ہمارا ملک ابھی اس سے محروم ہے اور ہمارے طلبا ء کی صحیح سمت میں تربیت نہیں کی گئی۔ جس کی وجہ سے طلبا ء برادری، سیاسی اداروں کا شکار ہو چکی ہے اور تابِ ملکی وقار کی راہ میں حائل ایک خلیج ہے جس کو پاٹنا اس دور میں ناممکن نظر آتا ہے۔ ہمارے طلباء تعلیم سے اس لئے بھی دور ہیں کہ ان کو اپنے سامنے ایک واضح مقصد نظر نہیں آتا اور وہ اپنے آپ کو ایک دائرے میں قید خیال کرتے ہیں اور اس لئے وہ ملک کی ترقی کے لئے واضح لائحہ عمل اختیار نہیں کر سکتے۔

مذکورہ بالا باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان آج تک اپنے تعلیمی مقاصد کو حقیقتاً پورا نہیں کر سکا اور اس لئے یہ ملک دوسروں کا دست نگر ہے۔ ملکی ترقی کے لئے مقاصد تعلیم کا حصول ضروری ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے علمی ثقافتی، تمدنی اور تہذیبی ترقی ضروری ہے تاکہ اس سے ہم ملک کے دوش بدوش چل سکیں اور اس منزل کو پا سکیں جس کے لئے لاکھوں جانوں کے نذرانے پیش ہوئے اور تب ایک نئی مملکت دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئی اور جس کا وجود سدا قائم رہنے کے لئے بنا ہے۔

طلبا، معاشرہ، اساتذہ

قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں تاریخ کے اوراق پر نقش ہو گئی ہیں۔ اگر کوئی قوم ترقی کے زینے طے کرتی ہوئی اوجِ ثریا پر پہنچ گئی تو بھی تاریخ کے دامن میں سما گئی اور اگر کوئی ضلالت و گمراہی کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی تو بھی تاریخ نے اسے اپنے پہلو میں جگہ دی۔

لیکن جہاں تک ان عروج و زوال کے اسباب کا تعلق ہے۔ ہر دور کے تقاضے مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب بھی کسی قوم کی نسلِ نو گمراہی کے سمندر میں گر جائے تو پھر اس کا سطحِ زمین پر قائم رہنا خیالِ خام بن جاتا ہے۔

مشاہدہ گواہ ہے کہ پرانی نسل اپنی ذمہ داریاں نبھا گئی لیکن جب نسلِ نو سامنے آئی تو۔ ع

نہ ہاتھوں میں جنبش نہ پاؤں میں زور

ہماری دنیا میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ تعلیمی نظام ہاری ہوئی فوج کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ جب اس کی ذمہ داری کا سراغ لگایا جائے تو اساتذہ ہدفِ تنقید

طلبا اور والدین کو گردانتے ہیں اور جب طلبا کی طرف رجوع کیا جائے تو اعتراضات کے ترکش اساتذہ پر خالی کرتے نظر آتے ہیں اور جب دونوں کو اس کی ذمہ داری کا احساس دلائیں تو اشارہ معاشرہ کی طرف ہوتا ہے۔ غرض یہ ایک مثلث سی بن گئی جس کے گرد مسائل گردش کرتے ہیں۔
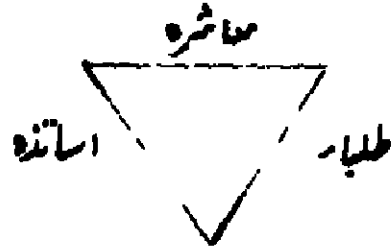
لیکن کوئی ان مسائل کا حل سوچنے کو تیار نہیں۔ کوئی اس کے اسباب و علل پر نظر نہیں ڈالتا۔ سب یہ کہہ کر جان چھڑالتے ہیں کہ جیسا ہے ویسا چلنے دو۔ لیکن کب تک۔ کیا اس کو اسی طرح چلنے دیا جائے گا۔ کیا یہ اسی طرح دم توڑ دے گا۔ نہیں ہرگز نہیں بلکہ اس کا خون ہماری ہی گردن پر آئے گا۔

عام طور پر یہی سننے میں آتا ہے کہ طلبا کو اپنی ذمہ داری پہچاننا چاہیئے اساتذہ اور والدین کو اس طرف توجہ دینا چاہیئے۔ مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ ان مسائل کو حل کس طرح کیا جائے۔ آج کے دور میں اگر ہم ان مسائل پر نظر دوڑائیں تو ذہن مفلوج ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ وہ طالب علم جو کبھی کائنات کی تقدیر بدل دیتا تھا۔ ستاروں اور چاند کی تسخیر اس کے پیش نظر ہوتی تھی۔ مسلسل تلاش اس کا طرۂ امتیاز ہوتا تھا جستجو اس کی رگ رگ میں خون بن کر دوڑتی تھی۔ مگر آج کا طالب علم کائنات کی تقدیر بدلنے کی بجائے اپنی تقدیر بدلنے پر زیادہ زور دیتا ہے۔ خواہ وہ کسی میدان میں بھی ہو۔ ستاروں اور چاند پر کمندیں تو افسانوی گفتگو بن کر رہ گئی ہیں۔ وہ تو حسینوں پر کمندیں ڈالنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ تلاش کا سفر اب بھی جاری ہے۔ مگر ناجائز دولت کی تلاش جستجو اب بھی اس کے رگ رگ میں خون بن کر دوڑ رہی ہے مگر کسی اعلیٰ JOB کی۔ یہ تغیر کیوں آیا۔ کیا ہمارے ذہن مفلوج ہو گئے؟ کارخانۂ قدرت میں نعوذ باللہ ناانصافی نے جگہ پیدا کر لی ہے؟ کیا اب مستقبل کی فکر ختم ہو گئی ہے؟

ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کی بنیادی وجہ تہذیب مغرب کے اثرات ہیں۔ آج عصر
حاضر معیار زندگی بلند کرنے کی جستجو جنم لے رہی ہے۔ والدین بجائے طلبا کی پرورش
وتربیت کرنے کے اپنے معیار کو بلند کرنے کی جستجو میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔
اولاد کس ڈگر پہ جا رہی ہے اس سے غرض نہیں۔ کاروبار میں کمی واقع نہ ہو خواہ اولاد
معاشرہ میں کوئی روپ ہی کیوں نہ دھار لے۔

اور اگر اساتذہ کا موازنہ کریں تو ایک زمانہ وہ تھا کہ اس مسند پہ وہی لوگ جلوہ افروز
ہوتے تھے جو اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے تھے جنہیں درس وتدریس کے بارے میں
علم تھا۔ جو بچوں کی نفسیات کو سمجھتے تھے۔ جن کا مقصد علم تقسیم کرنا تھا۔ تنخواہ جن کی
منزل نہ تھی۔ بلکہ زندگی اسے سمجھتے تھے۔ جو اعلیٰ انسان معاشرے کو دیے جاتے۔
مگر آج کا معیار کہ اس میدان میں ایسے ایسے لوگ آ گئے ہیں کہ جن سے اس مقدس پیشے
کے ماتھے پہ ندامت کا پسینہ آ گیا ہے۔

ادب و آداب رکاوٹ نہ بنتے تو عرض کرتا کہ آج کا استاد کسی طور استاد کہلانے
کا حقدار نہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج طلبا کے طبقے میں اساتذہ کے خلاف نفرت
کی روایت نے جنم لے لیا ہے۔ طلبا کا ذہن اپنی تکمیل کے زینے طے کر رہا ہوتا ہے
جہاں اسے کہیں رکاوٹ محسوس ہو وہ پھر اس طرف راغب نہیں ہوتا۔ میرا مقصد
توہین اساتذہ نہیں۔ اب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اساتذہ جو اپنے میدان میں شہسوار
ہوتے ہیں۔ آج کے گمراہ طالب کے دل میں بھی اس کا احترام ہوتا ہے۔ لیکن وہ اساتذہ
جو طلبا کے ذہنوں کو مطمئن نہیں کر سکتے سب سے بڑے ذمہ دار ہیں گرتے ہوئے معیار
تعلیم کے لئے بے اختیار زبان پہ یہ شعر آ جاتا ہے۔

عجب دستور محفل ہے نرالا دور ہے ساقی!
جسے پینا نہیں آتا اسی کا جام ہوتا ہے

آج کے استاد کو محض تنخواہ کے حصول سے غرض ہے۔ کلاس میں آ کر ۴۰ منٹ کا
لیکچر پیدا کیا اور کلاس سے باہر۔ طلبا کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں آیا کسی کے

پلے پڑا یا نہیں اس سے کوئی غرض نہیں۔

دوسرا بڑا سبب ٹیوشن کی حرص و ہوس نے پیدا کیا ہے۔ اساتذہ (گو کہ سارے ایک لکیر کے فقیر نہیں ہوتے) زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے ہیں کہ طلباء ٹیوشن پڑھیں۔ مدیہ کچھ ایسا نشہ ہے کہ ایک دفعہ سر چڑھ جائے پھر اترنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ چلیں اگر ٹیوشن کا مقصد بھی تعلیم علم ہوتا تو برداشت کر لیتے مگر ٹیوشن اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر پڑھاتے جاتے ہیں کہ فلاں کے والد بزرگوار فلاں عہدہ پہ ہیں سہولت ہوگی۔ کیا یہی شیوہ تھا ہمارے بزرگوں کا۔ ؎

خطا معاف لے ہیں وہ راہنما ہم کو
جو منزلوں سے لگا ہیں چرائے پھرتے ہیں

کیا طلباء کو ہدف تنقید بنانے کی بجائے اساتذہ ان مسائل پر توجہ دے سکتے ہیں؟

اور اس مثلث کا تیسرا حصہ وہ معاشرہ ہے جس میں اساتذہ اور طلباء دونوں زندگی گذار رہے ہیں۔ جہاں تک معاشرے کا تعلق ہے تو اس پر سینکڑوں مفکروں نے جی بھر کے خیالات کا اظہار کیا۔ مگر وہی بات کہ اس کا ذمہ دار کون؟ سب دامن بچاتے ہیں۔

اے کاش ہم اس وقت کو یاد کریں۔ جب معاشرہ ایک منبع عدل وانصاف ہوتا تھا۔ خلوص و وفا کے پھول ہر طرف کھلے نظر آتے تھے۔ مگر آج وہ زمانہ ہے کہ جس کو دیکھو اپنے معیار کو بلند کرنے کی فکر میں لگا ہے۔ آج کا معاشرہ وہ معاشرہ ہے کہ۔ ؎

لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

انگریز برصغیر چھوڑ گیا۔ مگر اس نے وہ اثرات چھوڑے کہ جس نے آج تک ہمارے معاشرے کو پھر سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ وہ معاشرہ جس کے وہ پروردہ ہیں لب گور پہنچ چکا ہے۔ وہ معاشرہ جس میں ۹۸ فیصد ایسے ہیں جو نشہ کرتے ہیں۔

وہ معاشرہ جس میں ۸۰ فیصد طالبات خودکشی کو تیار رہتی ہیں۔ وہ معاشرہ جس
میں نہ والدین کی تعظیم ہے نہ اساتذہ کی تکریم نہ بھائیوں کی محبت ہے اور نہ بہنوں
کا پیار، لیکن اس کے برعکس اگر ہم اپنے معاشرے پر نظر دوڑائیں تو جو معاشرہ
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں دیا اس کی نظیر کائنات کے کسی گوشے
میں نہیں ملتی۔ وہ معاشرہ جس میں والدین کے حقوق منفرد، اساتذہ کی تعظیم و تکریم
الگ۔ حقوق العباد کے فرائض یگانہ، آپس میں خلوص و محبت بے نظیر تھی۔

لیکن ہم نے اس معاشرہ کو چھوڑ دیا اور وہی انگریزوں کے معاشرے میں
ڈھلنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ؎

خدا ہی ملا نہ وصال صنم   ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

ہم نے معاشرہ کا وہ رنگ بدلا کہ جس سے تعلیمی میدان تو جدید تقاضوں سے
روشناس ہوگیا۔ مگر اخلاقی میدان میں شکست کھا گیا۔ اخلاق کے تمام تقاضے
بالائے طاق رکھ دیئے گئے۔ اب اس معاشرہ میں طالب علم آزاد ہے اور جو جی
میں آئے کریں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اساتذہ بھی اسی معاشرے کی زد میں آئے
اور اس جملے پر کہ "جو ہوتا ہے ہونے دو" پر طلبا کو چھوڑ دیا۔

اب اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس معاشرہ میں پروان چڑھنے
والا تعلیمی نظام کیوں کر ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ان تمام باتوں سے
یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نہ ہی پست تعلیمی نتائج کے ذمہ دار اساتذہ ہیں نہ والدین اور
نہ ہی طلباء بلکہ صرف اور صرف وہ معاشرہ ہے جس کی ہم پیروی کر رہے ہیں۔

مندرجہ بالا گفتگو سے ایک مسئلہ حل ہو گیا ہے کہ تمام نزاعات کی جڑ ایک معاشرہ
ہے۔ اب معاشرہ مورد الزام ٹھہرایا تو پھر کیوں نہ دونوں قوتیں یعنی طلبا اور اساتذہ
مل کر اس ملزم کا قلع قمع کریں۔

معاشرہ بناتے، خود کوئی چیز نہیں، انسانوں کے کردار اور طریقہ ہائے رہن سہن
سے بنتا ہے تو اس معاشرہ کو سیدھا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دولت کی دوڑ

چھوڑ دیں۔ ظاہری نمود و نمائش کے ایوان ڈھا دیں۔ فرنگی اثرات سے چھٹکارا حاصل کریں اور اس معاشرے کو جنم دیں جو مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ مانا کہ اس کاوش کی مخالفت میں کئی شخصیتیں دلائل کے انبار لگا دیں گی۔ لیکن بہر حال جب انقلاب آتا ہے تو ذہن کے ساتھ ساتھ دھن بھی بدل جاتا ہے۔ پھول بدلتا ہے تو چمن بدل جاتا ہے اگر یہ بدلے تو وطن بدل جائے گا۔ لیکن کوئی کوشش کرے تو، کوئی طبقہ میدان عمل میں آئے بھی تو؟

معاشرہ پر ایک اثر ہماری نصابی کتب کا بھی ہے۔ وہ زبان جو کبھی اپنے لڑکپن میں شباب کے خواب دیکھا کرتی تھی شباب ملا تو در در کی ٹھوکریں نصیب میں آئیں۔ اور اس کی جگہ اس زبان نے لی یا یوں کہوں اس معاشرہ کی زبان نے لے لی جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے اس کو اس طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی ترویج کو سالوں پر محیط کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی۔ تاکہ وہ طالبعلم جو زیادہ تر اسی زبان میں تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ اپنی تعلیم کو مزید جاری رکھ سکے۔ سرمایہ داروں کے حکمرانہ ٹھاٹ باٹ کو اب دم توڑ دینا چاہیئے اور یہاں کے طلباء کو اپنا حق ملنا چاہیئے۔ وہ طلباء جنہوں نے اس کی بنیادوں میں اپنا لہو شامل کیا تھا۔ آج اپنا حق مانگتے ہیں۔ دوسرے فرنگی زبان کے جو اثرات ہمارے نصاب پر مرتب ہوتے ہیں وہ بھی قابل توجہ ہیں C.S.F میں لگی ہوئی Model Test Papers ایک خالص فرنگی معاشرہ کی عکاسی کرتی ہے۔ لیکن افسوس ہے ہمارے نظام تعلیم پر کہ اگر ذہن نے پرواز بھی کی تو وہیں تک کیا یہ ہماری تعلیمی ترقی کے زوال میں شامل نہیں۔

نصابی کتب کی تبدیلی بھی معاشرہ کے چہرہ پر جمی ہوئی گرد صاف کر سکتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان سب اقدام کے بعد ہمارا تعلیمی معیار ترقی سے ہمکنار نہ ہو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دھن کے ساتھ ساتھ ذہن بھی بدلنا ہوگا۔ الفاظ کے پیرائے میں الجھانے کی بجائے عملی اقدام بھی کرنا ہوگا۔

ہمارا تعلیمی نظام اس مریض کی مانند ہے جو آخری سانس لے رہا ہے۔ اگر اب بھی ارباب اختیار نے اس کی طرف توجہ نہ دی تو یاد رکھیئے۔ ہم ہمیشہ ایسے ہی جہالت و گمراہی کے سمندر میں غرق رہیں گے۔

اے ہم نفسو صبح مسرت کو صدا دو
یہ سوختہ جاں منتظر ضرب نہاں ہے

یاور سعید

تعلیمی مسائل

کیا ہمارا تعلیمی نظام مؤثر ہے؟ کیا اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ ہمارے ملک کے نوجوانوں کو اس قابل بنا سکے کہ وہ آئندہ چل کر اعتماد کے ساتھ ملک کی باگ ڈور سنبھال سکیں؟ کیا یہ طلبا کی طبیعت اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کے ہم آہنگ ہے؟ یہ چند سوالات ہمارے لئے ہمیشہ الجھن کا سبب بنے رہتے ہیں۔ طالبعلموں، اساتذہ اور والدین کے اذہان میں اکثر یہ سوال گونجتے رہتے ہیں اور آج کل کے تعلیمی بحران اور طلبار کے اندر پائی جانے والی بے چینی کا سبب بھی یہی سوالات ہیں۔

آج سے ۴۲ سال قبل پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی ہماری اقدار بھی آزاد تھیں۔ جو کہ انگریز کی سو سالہ غلامی میں زنگ آلود ہو گئی ہو گئی تھیں۔ جن کے گرد زنجیروں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ ان زنجیروں کے ٹوٹنے پر جو جھنک پیدا ہوئی وہ ہماری تاریخی روایات کی گونج تھی۔ جس نے ہمیں اس

نال کیا کہ ہم دنیا کے سامنے سر اٹھا کر کھڑے ہو سکیں۔ مگر اس زمانے میں جو نظام
تعلیم بنایا گیا۔ اس پر انگریزی روایات کی چھاپ تھی۔ جو کہ ایک افسوسناک تاریخی
امر ہے۔ بلاشبہ یہ "فرنگیانہ ذہنیت" رکھنے والوں کا ہی کمال تھا کہ انگریزی کو
ہم پر مسلط کر دیا گیا۔ پھر اچانک تیس سال بعد خبر آتی ہے کہ ملک میں اردو طرز
کا تعلیمی نظام نافذ کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک خوش آئند چیز ہے۔ مگر اصل مسئلہ
اردو نظام تعلیم نافذ ہونے کا نہیں ہے۔ بلکہ ان خرابیوں کا سدباب ہے۔ جو
کسی جونک کی طرح ۳۲ سال سے ہمارے نظام تعلیم سے چپکی ہوئی ہیں اور جو طلباء
کا خون چوس رہی ہیں۔ صرف قومی تشخص حاصل کر لینے کے دعوے سے نہ تو ایک
پاک معاشرہ وجود میں نہیں آتا اور نہ ہی قومیں دعویٰ کرنے سے اپنے مقاصد
میں کامیاب ہوتی ہیں۔ اگر اس نئے نظام تعلیم میں وہی خامیاں موجود رہیں۔ جو
ہمیشہ سے طلبا کے ارمانوں کا خون کرتی آ رہی ہیں اور جن کا ذکر میں آگے چل کر
کروں گا۔ تو پھر اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئے نظام تعلیم
کو طلباء کی ضروریات اور صلاحیتوں کے پیش نظر مرتب کیا جائے۔ تاکہ اس بحران
اور بے چینی سے نجات مل سکے۔ جس کا طلباء ہمیشہ سے شکار ہیں۔

چند بڑی خامیوں میں سے ایک نصاب کی ترتیب اور تزئین ہے۔ ہر
سال نصاب میں نئی تبدیلیاں کی جاتی ہیں جو کہ سراسر کسی ایک شخص کی طبیعت
کا عکس ہوتی ہیں اور جو کبھی بھی دیرپا ثابت نہیں ہو سکتیں۔ یہ نصاب طلباء کے
ذہنوں پر ٹھونس دیا جاتا ہے۔ چاہے اس کی ذہنی قابلیت اور صلاحیتیں قبول
کریں یا نہ کریں ایک طالب علم کو ایک سال میں بیک وقت ۲۶ کتابیں پڑھنی پڑتی
ہیں۔ اگر اس کا ذہن انہیں قبول کر گیا تو ٹھیک ہے ورنہ ساری عمر ضمنی امتحان
دیں اور کیفے ٹیریا میں بیٹھیں۔

اصل میں بنیادی خرابی ہمارے ہاں اس وقت شروع ہوتی ہے جب طلباء
پر اپنے لئے مضامین انتخاب کرنے کا کڑا وقت آتا ہے۔ ماں باپ کہتے ہیں کہ میڈیکل

ر۔ بٹھایا جاتا ہے آرٹس۔ معاشرے کا دباؤ ہے کہ انجینئرنگ میں داخلہ ہو اور طالب علم کی ذہنی صلاحیت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس انتخاب میں اس کی اپنی رائے بہت کم شامل ہوتی ہے۔ یہ تو بعد کا مسئلہ ہے۔ اصل خرابی اس وقت شروع ہوتی ہے جب بچہ نرسری میں داخلہ لیتا ہے۔ داخل ہوتے ہی اس پر پانچ چھ کتابیں مسلط کر دی جاتی ہیں۔ اے فار ایپل اور بی فار بے بی پڑھایا جاتا ہے آ سے آم اور ب سے بابا رٹوایا جاتا ہے۔ اب اسے یہی سبق پڑھنا ہے اور آئندہ سال اسے ایک دم انگریزی، اردو، جغرافیہ، سائنس، سوکس اسلامیات اور ڈرائنگ سے نمٹنا پڑتا ہے۔ چھ سال کے بچے کے لئے یہ بوجھ ناقابل برداشت ہے۔ اس پر کتابیں مسلط کر دی جاتی ہیں۔ اب اگر اس کا دل جغرافیہ یا سوکس میں نہیں لگتا تو یقیناً وہ اس مضمون میں فیل ہو گا اور اسے نکمے کا خطاب مل جائے گا۔ حالانکہ فطرتاً اور اصولاً یہ ہونا چاہیئے کہ بچے کی دماغی صلاحیتوں کو پرکھا جائے اور اس کے ذہنی رجحان کا پتہ چلایا جائے اور بجائے اسے کسی چیز کو پڑھنے پر مجبور کرنے کے اس فیلڈ میں جس میں اس کا شوق زیادہ ہے زیادہ توجہ دلائی جائے۔ ایڈیسن کے پڑھائی سے بھاگنے کی وجہ یہی تھی کہ اس کا نصاب جو کہ رائج الوقت تھا۔ اسکی ذہنی صلاحیتوں سے ہم آہنگ نہ تھا اور اگر اسے اسکول میں واقعی ہی بیٹھنا پڑتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ کبھی بھی بلب ایجاد نہ کر پاتا۔ ہمارے ہاں ابھی ایڈیسن کے زمانے کا نظام تعلیم رائج ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر ایڈیسن آج کل کے دور میں کسی مغربی ملک میں پیدا ہوتا تو یقیناً ایک سو کی بجائے دو سو ایجادات ظہور پذیر ہوتیں۔ کیونکہ اس کی ذہنی صلاحیتوں کو سمجھنے کے لئے آج کل ان ممالک میں اس کو وہ ماحول میسر آ جاتا جس کی اسے تلاش تھی۔

اس بنیادی خامی کے علاوہ ایک اور بڑی خرابی طریقہ امتحان میں ہے۔ سال بھر کے نصاب کا نچوڑ صرف تین گھنٹوں میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ پورا سال

طالب علم اپنے آپ کو فارغ سا محسوس کرتے ہیں اور اسی احساس کے تحت وہ
پڑھائی سے غیر جانبداری کا اعلان کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ سارا سال اپنی
نصاب کی کتابوں میں مصروف رہے تو ہمارے ملک کے صاحب اقتدار لوگوں کو بھی
ان کے متعلق فکر میں غلطاں ہونے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اب ہوتا یوں ہے
کہ طالب علم امتحانات سے دو ماہ قبل کتابوں کی گرد جھاڑتا ہے اور انہیں
کھولنے کی زحمت گوارہ کرتا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ معیار تعلیم روز بروز گرتا
جا رہا ہے بلکہ طالب علموں کی ذہنی صلاحیتوں کو بھی آہستہ آہستہ زنگ لگتا
جا رہا ہے۔

میرے خیال میں ہر دو مہینے کے بعد طلباء کی قابلیت کا امتحان ہونا چاہئیے
اس سے طالب علم اپنے آپ میں مصروف رہتا ہے۔ یہی چند ایک بنیادی خرابیاں
ہیں جن کی وجہ سے آج کل کا طالب علم ایک عجیب اور بے نام سی بے چینی اور
انتشار کا شکار ہے۔ نظام تعلیم کا جھول ہی ہے جو آگے چل کر ۹۰ فیصد
طلباء کو دفتروں میں کلرکی کرنے پر مجبور کرتا ہے یا پھر انہیں کیفے ٹیریا کے
ماحول کا عادی بنا دیتا ہے۔

مبشر افقی

طلباء کے مسائل

کسی قوم کی تعمیر و ترقی کے لئے طلبا ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس پہ قوم کی فلاح و ترقی کی عمارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس لئے طلباء کو کسی قوم کے مستقبل کا معمار خیال کیا جاتا ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے شاندار ماحول فراہم کرنا ضروری ہے اور اس سلسلہ کی سب سے اہم کڑی ملک کے تعلیمی ادارے ہیں۔ جن میں اسکول کالج اور یونیورسٹیاں وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔ جن کی تعلیم و تربیت ان نونہالوں کو مستقبل کا معمار بنا سکتی ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے ۳۲ سال گزر جانے کے باوجود اکثر درس گاہوں کا ماحول ہماری امنگوں اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس لئے طلبا پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ وہ غیر ذمہ دار اور ملی شعور سے بے بہرہ ہیں۔ وہ مذہب سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں اور اخلاقی حد بندیوں کو نظر انداز کر کے غیر اخلاقی افعال کی طرف راغب ہیں۔ یہ سب ایک حد تک درست ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناقص بیج بو کر اچھے پھل کی توقع کرنا فضول ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارول

کا ماحول طلبا کو قومی تقاضوں کے مطابق تعلیم و تربیت دینے سے قاصر ہے۔
اکثر درس گاہیں ایسی ہیں جن پر ہر سال لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔
اور جن کا نظارہ متوسط اور ادنیٰ درجے کے لوگ دور ہی سے کر پاتے ہیں۔ ان
اداروں میں انگریزی کو بہت اونچا مقام حاصل ہے اور ان درس گاہوں کے
طلبا اور اساتذہ بھی انگریزی طرز معاشرت سے کسی حد تک مغلوب نظر آتے
ہیں۔ غیر ملکی زبان سیکھنا کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اپنی
تہذیب و تمدن کو بھلا دیا جائے۔ طلبا کو ایسا ماحول میسر ہونا چاہیئے۔ جس میں
وہ اپنی قومی زبان پر فخر کریں اور اپنے تہذیب و تمدن پر ناز کریں۔

تعلیمی اداروں میں نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیاں
بھی سارا سال جاری رہتی ہیں۔ لیکن ان سرگرمیوں میں مقصدیت کم اور نمائش
کا پہلو زیادہ روشن ہوتا ہے۔ غیر نصابی سرگرمیوں کی اہمیت سے بھی انکار
نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کے امتزاج
کے بغیر طلبا کا کردار پوری طرح نہیں نکھر سکتا۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں
ایسی سرگرمیوں کی از حد ضرورت ہے۔ جو طلبا کے کردار اور شخصیت کو نکھار
کر انہیں فرض شناس، محنتی اور محب وطن ثابت کر سکیں۔ محض چند ڈراموں
کو اسٹیج کرنا یا جذباتی موضوعات پر بحث و مباحثہ ہی کافی نہیں بلکہ ایسی سرگرمیوں
کو فروغ دینے کی ضرورت ہے جو قومی امنگوں کے مطابق ہوں۔

یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں کہ ہمارے معاشرہ میں روز بروز برائیوں
میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ڈکیتی، قتل و غارت، اغوا اور اس قسم کی دوسری
وارداتیں ہر ایک کے لئے تشویش کا باعث بن رہی ہیں۔ اگر طلبا کی اخلاقی
[illegible] ترتیب پر ہی توجہ دی جائے تو ان برائیوں کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔
[illegible] حاصل کرنے کے لئے مذہب ایک بہترین ذریعہ ہے ہمارے دلوں
[illegible] لگاؤ ہوگا اتنا ہی ہمارا اخلاق بلند ہوگا۔ ڈگری کلاسز کی سطح تک

اسلامیات ایک اختیاری مضمون ہے اور بہت کم طلباء اس کا مطالعہ کرتے ہیں
بے شمار طلبا اس سے فیض یاب نہیں ہو رہے۔ کیا ان کی مذہب سے بیگانگی ان
کے کردار پر منفی اثرات نہیں ڈالے گی؟ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ جہاں
تک ممکن ہو سکے طلباء کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے۔ اساتذہ
کا کام محض نصابی کتابوں کو پڑھا دینا ہی نہیں بلکہ ان کا ایک فرض طلباء کی
اخلاقی تربیت بھی ہے۔ اس کے علاوہ ممتاز دانشوروں اور عالموں کی تقاریر
بھی طلبا کے کردار پر خوشگوار اثر ڈال سکتی ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ مستقبل
کے معمار محنتی اور دیانتدار ہوں اور ان کے دلوں میں خوفِ خدا ہو تو ہمیں
درس گاہوں کے موجودہ ماحول کی اصلاح کے لئے مناسب اقدام کرنا پڑیں گے۔

تعلیمی نظام کی خامیاں

ہمارے تعلیمی نظام کا ایک نقص یہ ہے کہ ہمارے یہاں تعلیمی ادارے دو قسم کے ہیں ایک اردو میڈیم اور دوسرے انگلش میڈیم، انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے زیادہ تر بچے امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اردو اسکولوں میں غریب بچوں کی کثرت ہے اور یوں ان اسکولوں کی وجہ سے معاشرہ دو طبقوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔ یعنی امیر و غریب۔ امیروں کے لئے معاشرے میں رہنے کی اور سہولتیں ہیں اور غریبوں کیلئے اور۔ یہ معاشرتی ناانصافی ہے۔

اس کے علاوہ اسکولوں کے دو طبقوں (اردو اور انگلش میڈیم) میں ہونے کا ایک اور نقصان ہے اور وہ یہ کہ جو طالب علم اردو میڈیم میں پڑھتے ہیں ان کے لئے میٹرک کے بعد کالج میں جانے پر بے شمار مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ کالج کی تمام پڑھائی انگریزی میں ہوتی ہے۔ خاص کر سائنس پڑھنے والے طالب علم جب کالج میں جاتے ہیں تو وہ پروفیسر حضرات کے لیکچر انگلش میں ہونے کی وجہ سے بالکل نہیں سمجھ پاتے۔

داخلہ کے وقت پیش آتے ہیں ۔

ہمارے اکثر تعلیمی اداروں اور خاص کر دیہی علاقوں میں اکثر اساتذہ ایسے ملیں گے جو خود نان میٹرک ہیں اور میٹرک کی کلاسوں کو پڑھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اساتذہ کو تعلیم دینے کے لئے باقاعدہ تربیت بھی نہیں دی جاتی جس کی وجہ سے بچوں کی ابتدائی تعلیم ہی اچھی نہیں ہونے پاتی ۔ چونکہ اساتذہ کا تقرر اہلیت کی بجائے سفارش کی بنیاد پر ہوتا ہے ۔ لہذا اچھے اور محنتی لوگ اس میدان میں نہیں آ سکتے ۔

اکثر اسکولوں کے استاد بچوں پر اپنا رعب جماتے ہیں ۔ ان سے پیار اور محبت سے پیش نہیں آتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے استاد کی شخصیت سے گھبراتے اور خوف کھاتے ہیں ۔ لہذا وہ اگر پڑھائی کے مسئلے میں کوئی مشکل محسوس کریں تو وہ اسے صرف اس وجہ سے استاد تک نہیں پہنچا سکتے کہ وہ اس کی شخصیت سے گھبراتے ہیں اور ان پر اس کا رعب جما ہوتا ہے ۔

غلط تربیت اور والدین میں احساس ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے طلباء کے دلوں میں اساتذہ کا ادب و احترام نہیں رہتا ۔ وہ ان کی عزت نہیں کرتے ۔ ان کی بات نہ غور سے سنتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرتے ہیں ۔ جس سے بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں ۔

تعلیم کا زوال

آئے دن اخبارات میں گرتے ہوئے تعلیمی معیار پر مضامین لکھے جاتے ہیں جن میں تعلیمی معیار کے گرنے کی وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ گرتے ہوئے تعلیمی معیار کی کئی ایک وجوہات ہیں:-

جب بھی کوئی رزلٹ آتا ہے تو اخبارات میں یہ خبر ہوتی ہے کہ اس مرتبہ رزلٹ ۴۰ فیصد رہا یا کبھی کبھار ۴۵ فیصد۔ یہ تناسب صرف میٹرک تک ہی محدود ہے۔ انٹرمیڈیٹ اور ڈگری میں یہ اور بھی کم ہو جاتا ہے یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ انٹر میں فرسٹ ڈویژن کتنے ہوتے ہیں۔ سیکنڈ ڈویژن اور تھرڈ ڈویژن کتنے اور پھر فیل کتنے ہوتے ہیں۔ بی۔ اے، بی ایس سی کا تناسب بھی ہر سال ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یہ امر کافی تشویشناک اور توجہ طلب ہے۔

اس مسئلے کے حل کے لئے کبھی تو ماہرین تعلیم کا اجلاس بلایا جاتا ہے تو کبھی تعلیمی سیمینار منعقد کئے جاتے ہیں۔ مگر ان سے اب تک کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا

ہوتا یہی ہے کہ ہر سال نصاب میں رد و بدل کر کے اسے پہلے سے زیادہ طویل بنا دیا جاتا ہے۔ مگر پھر وہی نتیجہ سامنے آتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ماہرین تعلیم کیوں اس پر قابو نہیں پا رہے؟ کیا ان میں اتنی صلاحیت موجود نہیں کہ وہ اس مسئلہ کا حل سوچ سکیں۔ کسی بھی ملک کی ترقی کا دارومدار اس کے تعلیمی نظام پر ہے۔

ہمارے ملک کو آزاد ہوئے ۳۲ سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ لیکن نظام تعلیم وہی ہے جو برطانوی حکومت نے رائج کیا تھا۔ انہوں نے تو آج اپنا تعلیمی نظام تبدیل کر لیا ہے۔ مگر ہم لکیر کے فقیر کی طرح اس پر ابھی تک کاربند ہیں۔

ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک نظام تعلیم میں ابتری کی چند ایک بنیادی وجوہات ہیں:-

ایک تو یہ کہ کورسز بہت طویل ہوتے ہیں۔ وہ مقررہ مدت میں پڑھائے نہیں جا سکتے۔ دوسرا یہ کہ نصابی کتب بہت دیر سے مارکیٹ میں آتی ہیں۔ تیسرا غیر ضروری سیاست جو تعلیمی اداروں میں گھسی ہوئی ہے۔

اس کی مثال ایسے دی جا سکتی ہے کہ ۱۹۷۷ء میں میٹرک کا نصاب تبدیل کیا گیا تھا۔ پرانے نصاب کی جگہ نئے نصاب نے لے لی۔ مگر اس نصاب کی کتب بھی فوراً بازار میں دستیاب نہ ہو سکیں۔ میٹرک میں بیالوجی کی ۲ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس وقت ایک جلد تو مارکیٹ میں آ گئی مگر دوسری کتاب اس وقت آئی جب امتحانوں میں صرف دو ماہ کا عرصہ باقی تھا۔ اساتذہ نے جیسے تیسے کر کے وہ کتاب تو پڑھا دی مگر جب پرچہ آیا تو ۲۵ فیصد پہلی کتاب میں سے تھا۔ اور ۷۵ فیصد اس کتاب سے جو دیر سے آئی تھی۔ چنانچہ طالب علموں کا اس مضمون میں فیل ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

اب آیئے نصاب کی طوالت کی طرف اس کی مثال ایسے دی جا سکتی ہے کہ نصاب کا اجراء کرتے وقت سال بھر کی چھٹیوں کو بھی مد نظر رکھا جانا چاہیئے۔ کہ کیے

چھٹیاں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ نصاب ختم ہی نہیں ہو سکتا اور اساتذہ بھی مجبوراً
ضروری چیزیں پڑھا دیتے ہیں۔ اس لئے طلبا کو بھی منتخب مطالعہ کرنا پڑتا ہے
چنانچہ ان حالات کے پیش نظر رزلٹ ٹھیک کیسے آئے -

اب ذکر ذرا سیاست کا۔ سیاست یعنی غیر ضروری سیاست جو تعلیمی اداروں
میں گھسی ہوئی ہے۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ پچھلے چند برسوں میں اسے تعلیمی
اداروں میں داخل کر دیا گیا۔ معیار تعلیم کے گرنے میں بھی سیاست کا ہی ہاتھ ہے
سیاست ہی کی وجہ سے طلباء کا اخلاق بری طرح متاثر ہوا ہے۔ وہ طلباء جو
کبھی اساتذہ کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ آج کل ان کی ذرا برابر پروا
نہیں کرتے ہونا یہ چاہیئے تھا۔ کہ سیاست کو تعلیمی اداروں میں داخل ہی نہ ہونے
دیا جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور نتیجۃً تعلیمی معیار بری طرح متاثر ہوا۔

محمد علی خان ہوتی

محمد علی ہوتی سے ایک گفتگو

س : جب سے پاکستان بنا ہے کئی تعلیمی پالیسیاں سامنے آئی ہیں۔ ویسے تو ہر پالیسی اچھی ہوتی ہے۔ اور تعلیمی پالیسیاں بھی بہت پُرکشش رہی ہیں۔ مگر ان پر صحیح طور پر عمل درآمد نہ ہونے کی کیا وجہ ہے ؟

ج : دراصل ان پر صحیح طور پر عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ ملک کے سیاسی حالات میں وہ تلوّن ہے جس کا پچھلے تیس برس سے ہمارا ملک بُری طرح شکار ہے۔ ایک حکومت اگر کوئی اچھی چیز بناتی تھی تو دوسری آ کر اسے ختم کر دیتی اور کسی نئی چیز کو تشکیل دیتی جسے آئندہ حکومت ختم کر دیتی۔ اس وقت مجھے فارسی کا وہ محاورہ یاد آ رہا ہے کہ "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" جو بھی آتا ہے نئی عمارت بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض پالیسیوں کا کامیاب اطلاق نہ ہونے کی دوسری وجہ وہ تجاویز اور سفارشات تھیں جن پر عمل کرنا ہی ناممکن تھا۔ مگر انشاءاللہ موجودہ پالیسی آئندہ دس سال تک کامیابی سے ہمکنار رہے گی۔ گو ترمیم کا امکان ضرور ہے۔ مگر کیوں نہ ہو آخر قرآن کی طرح حرفِ آخر تو نہیں۔ مگر پھر بھی

ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ پالیسی سابقہ پالیسیوں کے مقابلے میں قدرے بہتر ہے۔ سابقہ پالیسیوں میں تعلیم کے خصوصی مقاصد کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ مگر اس پالیسی میں تعلیم کے قومی مقاصد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

س : تعلیمی نظام کو سائنٹیفک بنیادوں پر استوار کرنا آج کے دور میں ازبس ضروری ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے پیش نظر کیا اقدامات ہیں ؟

ج : آج کے دور میں ہم کیا کوئی بھی ملک سائنس کی تعلیم کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہم نے جہاں آرائش کی اہمیت پر زور دیا ہے تو وہاں سائنس پر بھی بے حد توجہ دی ہے۔ بجٹ کا بھی خاصہ حصہ سائنسی تعلیم ہی پر صرف کیا جائے گا۔ قائداعظم یونیورسٹی سائنس کی یونیورسٹی ہے اور یہاں سائنسی تحقیق کا بہت کامیابی سے کام ہو رہا ہے۔ اسی طرح انٹرمیڈیٹ تک ہم نے سارا کورس سائنس میں تبدیل کر دیا ہے مگر ہمیں سائنس کے لائق طلبا سے ایک شکایت ضرور ہے۔ اگر وہ ہماری یہ شکایت دور کر دیں تو سائنس کی تعلیم از خود ترقی پذیر ہو سکتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہر لائق طالب علم جو فرسٹ ڈویژن لیتا ہے یا ٹاپ کرتا ہے اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ انجینئرنگ کالج میں یا میڈیکل کالج میں داخلہ لے۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ایم۔ایس۔سی کر کے کسی کالج یا یونیورسٹی میں شعبۂ تعلیم و تدریس سے منسلک ہو جائے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ایک عام سا ڈاکٹر یا انجینئر بننے سے بہتر ہے کہ وہ اس شعبے کو اختیار کر کے ملک و قوم کی بہتر طور پر خدمت انجام دے، یا ہو جائے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کرے اور اپنے ملک کا نام روشن کرے۔ ایسے طلبا سے عاجزانہ گزارش اور اپیل ہے کہ وہ اس لائن کو اختیار کرنے کی طرف توجہ دیں۔

س : آپ تعلیمی انحطاط کی ذمہ داری طلبا، اساتذہ، والدین یا انتظامیہ میں سے کسی پر عائد کرتے ہیں ... ؟

ج : کسی ایک فریق پر ذمہ داری ڈالنا غلط ہے۔ بہت سے عوامل کارفرما

ہوتے ہیں۔ مگر ہم چند سالوں سے دیکھ رہے ہیں کہ طلبا کی توجہ پڑھائی سے ہٹ رہی ہے۔ وہ ہنگاموں کے لئے زیادہ بے چین رہتے ہیں۔ چھوٹی سی بات پر مسائل کھڑا کر دیتے ہیں اور چھٹی کے بہت شوقین نظر آتے ہیں۔ اگر میں یہ بھی کہوں کہ ان کا ایک ایک لمحہ بلین ڈالر کا ہے تو وہ بھی کم ہے۔ یہ وقت بے حد قیمتی ہے انہیں چاہیئے کہ یہ صدق دل سے اور پورے خلوص کے ساتھ خوب محنت کریں تو پہلی ذمہ داری تو سٹوڈنٹس پر ہے۔ پھر والدین کا بھی اس انحطاط میں بہت ہاتھ ہے۔ ایسے بھی والدین ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ ان کا بچہ کون سی کلاس میں پڑھتا ہے۔ اگر ادارے کی جانب سے بچے کی رپورٹ گھر آئے تو ماں باپ کی عدم توجہی ہوتے ہوئے لڑکے کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ لہذا شکایت ماں باپ تک پہنچ ہی نہیں پاتی اور پہنچ بھی جائے تو ایسے بھی والدین دیکھے گئے ہیں جو ان معاملات پر توجہ نہیں دیتے۔ اگر والدین اور طلبا کا یہ رویہ ہو استاد بےچارے کیا کریں وہ تو یہی کہیں گے کہ بچہ پڑھتا نہیں۔ والدین پرواہ نہیں کرتے تو ہم کیا کریں اور جہاں تک انتظامیہ کا تعلق ہے تو وہ طلبا کو کان سے پکڑ کر پڑھانے سے تو رہی۔ ہاں البتہ وہ اپنے فرائض اس حد تک انجام دے سکتی ہے کہ طلباً کو تعلیم کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرے۔ تجربہ گاہیں، کتب خانے اور تعلیمی اداروں کی اہمیت پر زور دے۔ ہمارا کام تو عمارت بنانا ہے اسے استعمال میں لا کر مدرسے کی شکل تو طلبا ہی کو دینی ہوتی ہے۔ اب باہر سے عمارت تو بہت اچھی ہو اور اندر کچھ نہ ہو تو پھر تو میرے خیال میں کوئی فائدہ نہیں۔

س: بے مقصد اور منزل کے تعین کے بغیر تعلیم حاصل کرنے کے بعد طالب علم کے لئے میدانِ زندگی میں جو مشکلات انتظار کرتی ہیں یعنی معاشی مسائل کو حل کرنے کے لئے مناسب ملازمتیں موجود نہیں ہوتیں کیا وہ علم کی تحصیل میں ایک رکاوٹ نہیں ۔۔۔؟

ج: دراصل تعلیم کا صحیح مقصد بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ مگر ہم تعلیم حاصل

رہے ہیں۔ محض معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے۔ حالانکہ ایک مرتبہ امام غزالی سے
کسی نے تعلیم کا مقصد پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ علم کا مقصد تعارفِ انسانی ہے
یعنی اپنے آپ کو جاننا۔ من عرفہ نفسہٗ فقد عرفہ ربہٗ ۔ جس نے
اپنے آپ کو پہچانا تو یقین جانئے اس نے خداوند تعالیٰ کو پہچان لیا۔

ویسے جہاں تک پیشہ ورانہ تعلیم کا تعلق ہے تو ہم نے موجودہ پالیسی میں اس
کمی کو بہت حد تک دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے دیہاتوں
میں MOSQUE SCHOOLS کا انتظام کیا ہے۔ جن سے کم از کم اتنا تو ضرور
ہوگا کہ بچہ پرائمری تک تعلیم حاصل کرکے اپنے لئے کچھ نہ کچھ تو کما ہی سکے گا۔ اس
کے علاوہ محلہ اسکول۔ ٹریڈ اسکول۔ ایگریکلچر اسکول وغیرہ بھی ٹیکنیکل ایجوکیشن کے
فقدان کو دور کرنے کے سلسلہ میں بہت سود مند اور مددگار ثابت ہوں گے۔

س: اساتذہ کی صحیح معنوں میں تربیت اور سوسائٹی میں انہیں مناسب مقام
دینے کے سلسلہ میں آپ کے پیشِ نظر کیا اقدامات ہیں۔۔۔؟

ج:۔ اساتذہ کی تربیت کے لئے ہم نے فری سروس ٹریننگ اور ان سروس
ٹریننگ ریفریشر کورسز کا انتظام کیا ہے۔ ایک سال میں تقریباً ۲۰ فی صد اساتذہ کو
ان سروس ٹریننگ دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ہم نے حال ہی میں ایک کمیٹی بھی
تشکیل دی ہے۔ جو اساتذہ کو مزید سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلہ میں مختلف تجاویز
اور سفارشات پر غور کرے گی۔ اس کے علاوہ نئی پالیسی میں اساتذہ کے لئے ورٹیکل
پروموشن کے مواقع بھی فراہم کئے ہیں۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ ایک پرائمری کا استاد
ساری عمر پرائمری ہی کو پڑھاتا پڑھاتا ریٹائر ہو جاتا تھا۔ مگر اب ہم نے ان اساتذہ کو
جو یونیورسٹی میں لیکچر دینے کے خواہش مند ہوں یہ سہولت دی ہے اور اس طرح
پرائمری کا ایک استاد بھی ایم اے کرکے یونیورسٹی میں لیکچرار یا پروفیسر ہو
سکتا ہے۔

س: ایک تجویز ہے۔ اظہار رائے چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہر استاد کے سپرد

تخلیقی کام کرنا چاہیئے۔ وہ اپنے علم کی روشنی کلاس کے بند کمرے میں محض گنتی کے کچھ طلبا تک ہی محدود رکھتے ہیں (یہ اکثر کی بات ہے۔ ورنہ بہت سے ادیب تعلیم و تدریس سے منسلک ہیں۔) اور اگر ان کے تخلیقی کام کی حوصلہ افزائی ان کی کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت کی طرف کی جائے تو اس طرح اساتذہ کے درمیان جو ایک بامقصد مقابلہ جنم لے گا اس سے جو خوشگوار نتائج سامنے آئیں گے۔ وہ متعلقہ فیلڈز میں نئی تحقیقات اور بہت سی نئی باتوں کو سامنے لانے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

ج۔ یقیناً ... بہت اچھی تجویز ہے۔ یونیورسٹی کا بنیادی مقصد ہوتا ہی یہی ہے۔ امتحان لینے والے ادارے تو بہت موجود ہیں۔ یعنی بہت سے بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن اس وقت یہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور جہاں تک تخلیق و تحقیق کا تعلق ہے تو یونیورسٹیز بخوبی یہ کام انجام دے رہی ہیں۔ ویسے بھی اگر کوئی استاد اس سلسلے میں کام کرنا چاہے تو پالیسی میں اساتذہ کو بہت ساری سہولیات مہیا کی گئی ہیں۔

س۔ نتیجہ کوئی معیار نہیں اصل چیز قابلیت کی کمی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج۔ جس طرح میں نے پہلے کہا ہے کہ آج کا طالب علم پڑھتا نہیں۔ اول تو اس کا مقصد علم حاصل کرنا نہیں بلکہ امتحان پاس کرنا ہے اور خاص طور پر پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں میں جانے والے سٹوڈنٹس کا تو نظریہ ہی یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح سے فرسٹ ڈویژن لے کر پیشہ ورانہ اداروں میں داخلہ لے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ طلباء میں اکثریت ان بچوں کی ہے کہ جو نقل مار کر یا خلاصے اور ٹیسٹ پیپر پڑھ کر امتحان دیتے ہیں۔

اس ضمن میں ہم نے یہ کہا ہے کہ پروفیشنل انسٹی ٹیوشنز میں داخلے کے لئے انٹرنس ٹیسٹ کو کلیئر کرنے کی شرط رکھی ہے۔ اس کے علاوہ طالب علم کی سابقہ کارکردگی کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ ٹھیک ہے کہ وہ کسی سے بہت خوب صورت کاغذ پر درخواست لکھوا کر لے آتا ہے۔ لیکن اگر اسے ایک کاغذ اور قلم دیا جائے اور کہا جائے کہ لکھو یہیں بیٹھ کر کیا چاہتے ہو تم تو وہ ہرگز نہ لکھ پائے گا۔ اس کا

کورس میں ضرور شامل رکھا ہے۔ کیونکہ اس زبان سے قطعی طور پر رابطہ تو ہرگز نہیں توڑا جا سکتا۔ کیونکہ یہ بین الاقوامی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبان بھی ہے۔ اس لئے چھٹی جماعت سے بچے اسے لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھیں گے۔ البتہ پرائمری تک انگریزی کا تسلط نہیں ہے۔ اردو کے علاوہ صوبائی زبانیں بھی رائج کی گئی ہیں۔

س: کالجوں میں مؤثر طور پر داخلی امتحانات یا سمسٹر سسٹم کو نافذ کر کے درس گاہوں کے نظم و ضبط کو بہتر بنایا جا سکتا ہے؟ آخر وزارت تعلیم ایسا کوئی قدم کیوں نہیں اٹھا رہی ہے؟

ج: بعض درس گاہوں میں سمسٹر سسٹم چل رہا ہے اور ہم اس سسٹم کی کامیابی کا بغور جائزہ لے رہے ہیں۔ اگر تو یہ نظام اطمینان بخش حد تک ہمارے ہاں کامیاب ہو جاتا ہے تو ہم اسے باقاعدہ طور پر تمام اداروں میں رائج کر دیں گے۔

س: کیا آپ کی نظر میں موجودہ تعلیمی پالیسی انقلابی حیثیت رکھتی ہے؟ یعنی اس کا اطلاق کیا طلباء و اساتذہ کے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوگا؟

ج: "مشک آں است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" ہم نے تو پالیسی بنائی ہے جنہوں نے اس کا بغور مطالعہ کیا۔ انہوں نے اس کے حق میں اخباروں میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ مبارکباد کے بہت سے خطوط بھی ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ ہم نے تو قوم کے سامنے پورے خلوص کے ساتھ ایک چیز پیش کی ہے۔ اب آپ ہی بہتر طور پر بتا سکتے ہیں کہ ہم کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔ منصف تو آپ کو ہونا چاہیئے۔

محرکِ گفتگو: عرفانہ احمد عارف

بریگیڈیر سید نصیر الدین سے ایک گفتگو

کیا آپ موجودہ تعلیمی نظام سے متفق ہیں؟

کسی بھی نظام سے سو فیصدی تو متفق ہونا ممکن نہیں کہ ہر نظام اپنے نقائص اور فوائد رکھتا ہے۔ موجودہ تعلیمی نظام سے بھی اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس میں نصابی صورت بھی ہے اور انتظامی بھی۔ کچھ بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت بھی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے یہاں انٹر کو TERMINAL کا درجہ حاصل ہے۔ انٹر کے بعد بچے میڈیکل، انجینئرنگ یا کسی دوسرے شعبے کا انتخاب کرتے ہیں۔ میری رائے میں انٹر کی بجائے میٹرک کو TERMINAL کی حیثیت حاصل ہونا چاہیے۔ تاکہ میٹرک کے فوراً بعد بچے اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق شعبوں کا انتخاب کرلیں۔ یوں کالجوں کا بوجھ بڑی حد تک کم ہو جائے گا۔ یوں بھی میٹرک تک پہنچتے پہنچتے بچے کے ذہنی رجحانات واضح ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لئے میٹرک کے بعد مزید دو سال کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

دوسری چیز ہمارے ہاں تعلیمی اداروں کی کمی کے سبب وجود میں آئی ہے۔ ملکی

زمانے کا تعین کرتا ہے مجموعی صورت حال میں سماج کا کوئی بھی طبقہ اپنی علیحدہ حیثیت برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ایک بگڑی ہوئی سوسائٹی میں کسی ایک گروپ کا اچھا ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ موجودہ تعلیمی صورت حال کو عام سماجی رویوں کے حوالوں ہی سے دیکھا اور جانچا جا سکتا ہے۔

س : ایک عام تاثر یہ ہے کہ ہمارا نصاب ہمارے موجودہ حالات سے لگا نہیں کھاتا۔ جس کی وجہ سے طلبا کی دلچسپی مجروح ہوتی ہے؟

ج : ایک حد تک مجھے اس رائے سے اتفاق ہے۔ خاص طور پر یونیورسٹی کی سطح پر یہ بات ایک مجموعی بے اطمینانی کا باعث مزید ہے۔ تعلیم کا بنیادی مقصد زندگی کے مختلف معاملات سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ ہمیں طلبا کو ایسا علم دینا چاہیے۔ جو ان کے گرد و پیش سے نہ صرف باخبر رکھے بلکہ ان کے اندر حالات کا مقابلہ کرنے کا جذبہ بھی پیدا کرے۔ چنانچہ اسی حوالے سے دیکھا جائے تو نصاب کا ایک بڑا حصہ اپ ٹو ڈیٹ نہیں ہے۔ حصہ کی بات میں نے اس لئے کی ہے کہ بعض مضامین کے سلسلے میں یہ بات اس انداز سے درست نہیں۔ مثال کے طور پر ادب میں کلاسیک پڑھانے سے وقت ضائع نہیں ہوتا۔ بلکہ ذہن ارتقاء کی طرف جاتا ہے۔ یہی صورت فلسفہ کی ہے۔ پرانی بات سے ایک تدریجی ارتقاء کی صورت نکلتی ہے۔ ذہن کی ارتقاء کے لئے پرانی باتیں سیڑھی کا کام دیتی ہیں۔ البتہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے باب میں صورت مختلف ہے۔

تعلیم کا بنیادی مقصد انسانی ذہن کے ارتقاء کو جاری رکھنا بھی ہے۔ جب ہم بچے کو ابتدائی علم سکھاتے ہیں تو وہ جاننے کے ایک عمل سے گزرتا ہے اور جاننے کی خوشی ایک عجیب لذت رکھتی ہے۔ یہی لذت تعلیم کا انعام بھی ہے۔ میں آپ کو ایک ذاتی واقعہ بتاتا ہوں جب میں اپنے بچے کو جمع تفریق سکھا رہا تھا تو میں نے اسے نو میں سے چھ نکالنے سکھائے۔ ایک وقت آیا کہ چھ میں سے ۹ نکالنے کا مرحلہ آیا یعنی سوال میں سے نو میں نے اسے بتایا کہ یہاں ہمیں دوسری طرف سے ایک لے کر سولہ بنانا پڑیں گے۔ یہ اکائی اور دہائی کا

مرحلہ تھا۔ مگر اسے میری بات سمجھ میں نہ آئی۔ میں اسے مسلسل سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر بات نہ بنی۔ ایک وقت وہ آیا کہ وہ کہنے لگا: "اچھا تو ایک ادھر سے لے کر یہ سولہ ہو جاتے ہیں" اس کا یہ "اچھا" کہنا دراصل اس ذہنی جست اور لذت کی علامت تھا جو ایک نئی چیز کے جاننے کے عمل میں اسے حاصل ہوئی تھی۔ سو یہ تجسس، یہ ذہنی جست، یہ لذت ہی علم کا حاصل ہے۔ چنانچہ ہمیں اپنے نصاب کی تدوین میں یہ مدنظر رکھنا پڑے گا کہ ہم بچوں کو کس حد تک یہ تجسس فراہم کرنے کی صورت پیدا کر پائے ہیں۔ نصاب قوم کے رجحانات کا آئینہ ہوتا ہے اور یہ بڑی اہم ذمہ داری کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے ہمارا نصاب اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اس کی بھی کئی وجوہات ہیں۔ جن میں بڑی وجہ قومی شعور اور نظریاتی اساس سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہ ہو کر نصاب کی تدوین ہے۔ یہ کام بہت ہی ذمہ داری اور احساس کا ہے۔

س : والدین اور اساتذہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں آپ نے اساتذہ کے بارے میں تو اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کیا والدین پر بھی اس تعلیمی انحطاط کی ذمہ داری عائد کی جا سکتی ہے؟

ج : یقیناً والدین بھی اس سے بری الذمہ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ والدین بہرحال بچے کی تربیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اچھے ماحول کی پیدائش میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ میرے نزدیک ایک اور وجہ بھی ہے وہ یہ کہ بہت کم والدین اپنے بچوں کی تربیت اور خاص طور پر ان کے تعلیمی سفر میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ دلچسپی لینے کا یہ مطلب نہیں کہ والدین صرف بچے کو اسکول میں داخل کرا کے ہر ماہ اس کی فیس ادا کر کے اور اسے کاپیاں کتابیں لے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ بلکہ یہ کہ وہ اس کے تعلیمی سفر اور تدریجی ارتقاء کے سلسلہ میں اساتذہ سے مسلسل رابطہ رکھیں۔ ہمارے یہاں عموماً یہ ہوتا ہے کہ بچے کو اسکول یا کالج میں داخل کرا کے والدین یہ سمجھتے ہیں کہ ان

کا فرض پورا ہو گیا۔ اب ساری ذمہ داری استاد کی ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں والدین اور اساتذہ میں رابطے اور تعاون کی روایت ہی نہیں ہے۔ کسی نے سنجیدگی سے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔ میرے والد گرامی محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھے۔ میں آپ کو ان کی دو باتیں بتاتا ہوں۔ ایک یہ کہ شام کو وہ مجھے پلنگ پر بیٹھ کر پڑھاتے۔ پلنگ یوں کہ اس زمانے میں میز کرسی کا رواج نہ تھا۔ وہ پلنگ کے سرہانے کی طرف اور میں پائنتی کی سمت بیٹھ جاتا۔ وہ ایک ہاتھ سے پنکھا جھلتے جاتے اور مجھے پڑھاتے بھی جاتے۔ ان کی یہ ذاتی دلچسپی یقیناً میرے اندر شوق کا جذبہ ابھرنے کا سبب بنتی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ میرے کھیل کود میں بھی اتنی ہی دلچسپی لیتے۔ شام کو پڑھائی سے فارغ ہو کر وہ اور چند دوسرے بزرگ کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے اور ہم بچوں کو کھیلتے دیکھتے۔ پڑھنے اور کھیلنے میں والدین کی یہ ذاتی دلچسپی بچے کے اندر شوق کے ساتھ ساتھ ہمت اور محنت کے جذبات کو ابھارتی ہے۔ بڑے اداروں میں تو والدین کو کسی حد تک "والدین کا دن" یا ایسے ہی دوسرے عنوانات کے حوالے سے شریک ادارہ کر لیا جاتا ہے۔ مگر عام تعلیمی اداروں میں اس کی روایت نہیں۔ اس لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ تعلیمی انحطاط میں اگر اساتذہ چالیس فیصد ذمہ دار ہیں تو والدین کا تناسب ساٹھ فیصد بنتا ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں والدین ہی سے اچھے عمل کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس لئے

بھی کہ استاد بہرحال اپنے مقام اور مرتبہ کے لحاظ سے اگرچہ معاشرے نے اسے یہ مرتبہ نہیں دیا، بہتر کردار کا مالک ہوتا ہے۔ اخلاق، کردار اور ایمانداری اس کے جزو ہیں۔ اس لئے اس سے قربانی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ آخر کسی نہ کسی کو تو پہل کرنا ہی پڑے گی۔ اگر سارے اچھائی کے لئے دیکھتے رہیں کہ پہل کون کرے گا تو بات نہیں بنے گی۔ استاد کی حیثیت اور اس کے مقدس پیشے کی روایت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ آگے بڑھے۔

س : آپ نے استاد کے مرتبے اور روایت کا ذکر کیا ہے تو سوال یہ ہے کہ آج کے اساتذہ میں سے کتنے اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ایک عام تاثر یہ ہے کہ جب لوگ تمام شعبوں سے مایوس ہو جاتے ہیں تو اس طرف آتے ہیں۔

ج : جزوی طور پر آپ کی یہ بات درست ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر میں اس سے کلی طور پر اتفاق نہیں کرتا۔ "پیدائشی استاد" ایک تصور اور مفروضہ ہے۔ بہت کم لوگ پیدائشی طور پر کوئی ذہنی رجحان رکھتے ہیں۔ عموماً تجربہ اور لگن ہی رجحانات کو پروان چڑھاتے ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ لوگ عموماً پہلے دوسری منفعت بخش ملازمتوں کے حصول کی کوشش کرتے ہیں تو یہ کوئی عجیب چیز نہیں، ہمارا انتظامی ڈھانچہ اور معاشرتی روایات ہی ایسی ہیں کہ ہر شخص پہلے CSS میں جانا چاہتا ہے پھر فوج کے لئے کوشش کرتا ہے۔ اس رویہ کا ذمہ دار فرد نہیں بلکہ وہ معاشرہ ہے جس نے بعض ملازمتوں کو قابل افتخار بنا دیا ہے۔ اور بعض کو نہیں۔ اس لئے کسی شخص کی ملازمت کے سلسلے میں یہ ترتیب نہ عجیب ہے اور نہ ہی غیر فطری۔ قدرتاً جب اس معاشرے کا کوئی فرد ملازمت کی خواہش کریگا جہاں پیسہ اور اختیارات ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ آپ کا معاشرہ ان دو چیزوں کی قدر کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایسے محکموں سے مایوس ہو کر تعلیم میں آ جائے تو کیا حرج ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا وہ یہاں آ کر خود کو ADJUST کر لیتا ہے۔ اگر وہ خود کو اس میں نہیں ڈھالتا تو پھر اس پر فرد جرم عائد کی جا سکتی ہے۔ میں خود

ایم۔ اے کرنے کے بعد ملی کر (؟) کالج میں لیکچرار مقرر ہوا تھا۔ ۵ سال وہاں پڑھاتا رہا۔ وہاں میں انٹر کا انچارج بھی تھا۔ ان ۵ سالوں میں کسی نے مجھ سے میرے کام کا حساب نہیں مانگا۔ بس ایک اخلاقی دباؤ تھا جس کے تحت میں روز شام کو دو ڈھائی گھنٹے لیکچرز کی تیاری کرتا تھا۔ یونیورسٹی کے تیز طرار لڑکے جن میں سے کئی فیل شدہ تھے اور میری عمر اس وقت ۱۹ سال تھی۔ مگر میری کلاس میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ وجہ یہ کہ میں تیاری

زور دیا جاتا تھا۔ ریفرنس، تفصیل اور ایک ایک جز کی تفسیر۔ لڑکوں کو سر اٹھانے کا
موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ پچھلے دنوں میں صرافہ بازار سے گزر رہا تھا تو ایک صاحب مجھے
مسلسل دیکھتے گئے۔ میں نے پوچھا "بھائی کیا بات ہے مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں"۔
بولے "آپ نصیر الدین ہیں" میں نے کہا "ہاں"۔ کہنے لگے "میں علی گڑھ میں
آپ کا شاگرد تھا اور آپ کے پڑھائے ہوئے سبق مجھے ابھی تک یاد ہیں"۔ اب میں آپ
کو ایک دوسری بات بتاتا ہوں کہ محکمۂ تعلیم میں آنا میرے مشاغل اور رویے کے برعکس تھا
کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میں تعلیم میں آؤں گا۔ شکار، بار ڈھانڈ کے کھیل اور
ایسے ہی دوسرے مشاغل۔ خود میرے تصور میں نہیں تھا کہ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے محکمۂ تعلیم
میں آؤں گا۔ یہ بات میں نے آپ کے سوال کے اس حصے کے حوالے سے کی ہے کہ پیدائشی
رجحان بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا پیدائشی رجحان ایسا نہیں
تھا۔ مگر میں نے اپنے آپ کو ایک بہتر استاد بنانے کے لئے کام کیا۔ پاکستان بننے کے
بعد میں ۱۹۴۸ میں آ گیا۔ یہاں پڑھانے کا طریقہ مختلف تھا۔ یہاں تلفظ، زبان اور
گرامر پہ زور دیا جاتا تھا۔ یونیورسٹی میں اس کی بجائے تفصیل پر زور تھا۔ میرا تلفظ
اتنا اچھا نہیں تھا۔ لیکن میں نے ایک ایک لفظ پر محنت کی، لہجہ کر، بول کر، ڈکشنری
دیکھ کر، نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ عرصہ میں وہ مشکل جو مجھے ابتدا میں محسوس ہوتی تھی دور
ہو گئی۔ اس ساری بات کا مطلب یہ ہے کہ محنت اور توجہ سے ہر چیز حاصل کی
جا سکتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص کسی وجہ سے کسی معاشی دباؤ یا موقع کی وجہ
سے تعلیم میں آ جاتا ہے تو کوئی ایسا حرج نہیں۔ ہاں اسے چاہیئے کہ وہ خود کو اس

ماحول میں ڈھالے اور سیکھنے کے عمل کو جاری رکھے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ ہمارے موجودہ
اساتذہ میں سے کتنے اس معیار پر پورے اترتے ہیں تو آپ خود اس کا جائزہ لے سکتے
ہیں۔ میں بہرحال کوئی ایسا مایوس بھی نہیں ہوں۔

س: بحیثیت استاد کبھی آپ کو اپنے افسروں سے کوئی شکایت رہی ہے؟

ج : میں اس معاملہ میں خوش نصیب رہا ہوں۔ میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہوا تو وہیں لیکچرار ہو گیا۔ میرے اپنے اساتذہ ہی میرے افسر بنے۔ ان کا رویہ میرے ساتھ بہت مشفقانہ تھا۔ افسری ماتحتی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ یوں ہی یونیورسٹی کا ماحول قدرے مختلف ہوتا ہے۔ استاد اور شاگرد کے درمیان بھی ایک تعلق رہتا ہے اور ماتحت اور افسر کے درمیان بھی۔ مجھے کبھی ایسی صورتحال کا تجربہ نہیں ہوا۔ جس میں افسری ماتحتی کا کوئی مسئلہ درپیش ہو۔

س : آپ نے جب موجودہ کینٹ کے تعلیمی اداروں کو اپنی تحویل میں لیا تو یقیناً آپ کے ذہن میں کچھ خواب، خاکے اور منصوبے ہوں گے۔ یہ کہاں تک پورے ہوئے ہیں

ج : ہمارا بنیادی مسئلہ ان اداروں میں تعلیم کے معیار کو بہتر بنانا تھا۔ ہم نے جب ان اداروں کو اپنی تحویل میں لیا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ ان اداروں میں سیاست بہت کارفرما ہے۔ ماحول بہت حد تک نامناسب ہے۔ لوگوں کی توجہ فرائض کی ادائیگی کی طرف نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے تعلیمی معیار مسلسل گرتا چلا جا رہا تھا۔ بہت سے تقرر اور تبادلے سیاسی وجوہات اور بنیادوں پر ہوئے تھے۔ دوسری طرف بنیادی سہولتیں کم تھیں۔ یعنی عمارتیں، لائبریریاں، لیبارٹریاں وغیرہ بری حالت میں تھیں۔ جہاں تک اساتذہ کے مسائل یعنی طبی سہولتیں، رہائش، جی پی فنڈ، ترقیاں اور دیگر فلاح و بہبود کا تعلق ہے۔ اس طرف کسی نے سنجیدگی سے توجہ ہی نہ دی تھی۔ پچھلے دو سالوں میں ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ ان مسائل کو حل کیا جائے۔ ان کے علاوہ کھیل کود کی سہولتیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اسکولوں کی صورت حال

اور عمارات کے وقوع میں اس کی گنجائش نہ تھی۔ ہم نے ان سب باتوں کو ذہن میں رکھ کر اپنے کام کا آغاز کیا اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ سب سے پہلی کامیابی تو یہ ہے کہ ہم نے سیاسی ماحول ختم کر دیا ہے۔ وجہ یہ کہ ہم خود سیاسی لوگ نہیں۔

یہ تاثر کہ فلاں کے توسط سے یہ کام ہو سکتا ہے اور فلاں کے ذریعہ نہیں ہو سکتا
ختم ہو گیا ہے۔ ہم نے ایک بنیادی اصول پر عمل کیا ہے کہ ہمارے یہاں سفارش نہیں
چلتی۔ ہر کام انصاف کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ پرنسپل بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔
ان دو سالوں میں ہمارا ایک بڑا کام لیکچراروں کی ترقیاں ہے۔ اب ہم وائس
پرنسپل صاحبان کے مسئلہ پر کام کر رہے ہیں۔ جی پی فنڈ کا مسئلہ تقریباً حل ہو گیا
اور ایک آدھ اسٹیشن کو چھوڑ کر باقی جگہوں پر فنڈ منتقل ہو گئے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک
نیا مسئلہ سامنے آیا۔ یہ پنشن سے متعلق تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ کیبنٹ ڈویژن کے
جس خط کے تحت ہم نے یہ ادارے اپنی تحویل میں لئے تھے۔ اس میں پنشن کا ذکر
رہ گیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس حکم میں ترمیم کے بغیر یہ معاملہ حل نہیں ہو گا۔ آپ
جانتے ہیں کہ ہمارے انتظامی ڈھانچے میں قدم قدم پر جو رکاوٹیں حائل ہیں اور
جو الجھا ہوا طریقہ کار ہے۔ اس میں کتنی دیر لگتی ہے۔ مگر ہم نے یہ مسئلہ بھی حل کر لیا
اور ضروری ترمیم ہو گئی۔ یہ باتیں بظاہر بہت چھوٹی اور معمولی نظر آتی ہیں۔ مگر
اپنی جگہ انتہائی اہم ہیں۔ فوج میں یہ اصول ہے کہ پہلے لوگوں کی فلاح و بہبود کرو،
ان کے مسائل حل کرو اور پھر ان سے کام لو۔ ہم نے اسی اصول کو اپنایا ہے اور کوشش
کر رہے ہیں کہ لوگوں کے مسائل حل ہوں۔ ہمیں بہت حد تک کامیابی بھی ہوئی اور
ایک جگہ ناکامی بھی۔ مثال کے طور پر رہائش کے مسئلے میں ہم ابھی تک کچھ بھی نہیں
کر سکے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ اساتذہ کو اس کا استحقاق ہی نہیں ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ لوگوں کے مسائل حل ہوں تو ہم ان سے کام کا
مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ سو ہم نے اس سلسلہ میں بھی کچھ اقدامات کئے ہیں۔ خاص طور
پر اسکولوں کی حد تک۔ مثال کے طور پر ہم نے نصاب کو ایک ایک مہینہ میں تقسیم کر کے
اس کی صف بندی کی ہے۔ تعلیمی کرڈر دوبارہ شائع کیا ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ اکثریت
اس پر عمل کر رہی ہے۔ وجہ یہ کہ ماحول میں ایک صحت مند تبدیلی آئی ہے اور لوگوں

کا اعتماد بحال ہوا ہے۔ ہمیں اسکولوں کی سطح تک زیادہ توجہ دینا پڑی ہے۔ کالجوں جیسا تجربہ اساتذہ نے اختیار کیا ہے۔ نیز ہمیں کالجوں میں خلوص اور فرض شناسی کا احساس پہلے ہی سے موجود ہے۔ اس لئے ہم نے ان کے معاملات میں خواہ مخواہ دخل اندازی نہیں کی۔

س : اس سلسلے میں آپ کو مشکلات بھی پیش آئی ہیں؟

ج : کوئی خاص نہیں۔ وفاقی وزارتِ تعلیم نے ہم سے بہت تعاون کیا ہے اور میں ان کا شکر گزار بھی ہوں۔ اداروں کے پھیلاؤ، عمارات کی درستی یا کسی بھی دوسرے معاملے کے لئے ہم نے جب بھی بجٹ مانگا، انہوں نے ہمیں دیا۔ اساتذہ کی کمی پوری ہو گئی ہے۔ کالجوں میں دو سو ۲۷ اسامیوں میں سے صرف ایک خالی ہے۔ البتہ سکولوں میں کہیں کہیں کمی ہے۔ وہ بھی سائنس کے اساتذہ کی وجہ سے، ان اقدامات کی وجہ سے بہت سے مثبت نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ در اصل ماحول کا تعلق ذہنی اور دلی کیفیات سے ہے۔ اعتماد کی فضا میں ایک خوشگوار اور صحت مند تبدیلی عمل میں آتی ہے۔ ہم نے غیر نصابی سرگرمیوں کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ اس سے بچوں کے اذہان صحت مند رجحانات سے آشنا ہوتے ہیں۔ غیر نصابی سرگرمیوں سے قانون کی عزت اور تعظیم کا جذبہ ابھرتا ہے۔

س : کسی بھی بحران میں عام طور پر پرنسپل کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہر قسم کے معاملات کو کنٹرول کرے۔ جب اصل صورت یہ ہے کہ پرنسپل کے پاس کسی قسم کا انتظامی اختیار نہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

ج : پرنسپل کے اختیارات دو قسم کے ہیں۔ ایک یہ کہ کتابیں خریدنا، لیبارٹری کا سامان حاصل کرنا، عمارات کی دیکھ بھال کے لئے مناسب انتظام کرنا وغیرہ۔

میں ان اختیارات کے حق میں ہوں کہ ان تمام معاملات کی دیکھ بھال مکمل طور پر پرنسپل

کے دائرۂ اختیار میں ہونا چاہئے۔ میں اس سلسلہ میں یہ [illegible] کئے
ہیں۔ پچھلے دنوں معائنے کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ ایک اسکول میں چپراسی صرف
اس لئے نہیں کہ پرنسپل کو چپراسی رکھنے کا اختیار نہیں۔ میں نے فوراً احکامات صادر
کئے کہ پرنسپل کو کلاس چہارم کے ملازمین کی بھرتی کے مکمل اختیارات ہیں۔ اسی طرح
میں نے پرنسپل کا مالی اختیار ۵ سو سے بڑھا کر ایک ہزار کر دیا۔ ہم اس معاملہ میں بخیل
نہیں ہیں اور [illegible] کو اپنا احکامات سے ہونا چاہتے ہیں۔ [illegible] پرنسپل
کو بہت اختیارات دیئے ہیں اور مزید اختیارات بھی دینے کے لئے تیار ہیں۔ یہ پہلی
قسم کے اختیارات کی بات تھی۔ دوسری قسم کے اختیارات میں طلباء اور اساتذہ اور
دیگر شاف کے خلاف تادیبی کارروائی جس میں ملازمت سے برطرفی وغیرہ بھی شامل
ہے۔ یہ اختیار پرنسپل کو منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ ذاتی طور پر میں پرنسپل سے یہ توقع
کرتا ہوں کہ وہ سوجھ بوجھ، تحمل، بردباری اور اخلاق سے مسائل کو سلجھائے۔ جو
پرنسپل یہ کہتا ہے کہ ماحول کو ٹھیک کرنے کے لئے اسے لوگوں کو برطرف کرنے یا تبدیل
کرنے کے اختیارات دے دیئے جائیں۔ میں اس پرنسپل کو ایک ناکام منتظم سمجھتا ہوں۔
پرنسپل کا کام سختی اور تادیبی کارروائیوں کی دھمکی دیتے ہوئے مسائل کو سلجھانا نہیں ہے
کامیاب پرنسپل وہی ہے جو [illegible] اخلاقی دباؤ سے ماحول میں
بہتری پیدا کرتا ہے۔ تادیبی کارروائیوں کا اختیار طلب کرنے والا پرنسپل میرے
نزدیک ایک ناکام منتظم ہے اور ایسے اختیارات کی طلبی اس کی ناکامی کی دلیل ہے۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کرنل ایم۔ اے سلیمی سے ایک گفتگو

س : آپ کی رائے میں ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم کس حد تک قومی تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے ؟

ج : بہت کم حد تک اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں نظام تعلیم کو ملک اور قوم کے بنیادی تقاضوں کے مطابق نہیں ڈھالا گیا۔ کسی ملک کا نظام تعلیم اس ملک کے بنیادی افکار اور قومی فلسفے کے مطابق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی یورپی ملک میں نظام تعلیم میں بنیادی چیز فرد کی آزادی ہوگی۔ کیونکہ ان کے یہاں سارا معاشرتی فلسفہ فرد کی آزادی کے گرد گھومتا ہے۔ ان کی تربیت میں بھی یہی عنصر کارفرما ہے۔ وہ اپنے بچوں کے اندر بھی انفرادی آزادی کا احساس بیدار کرتے ہیں۔ اسی طرح کسی کمیونسٹ ملک میں تعلیم کے نظام میں بنیادی شے طبقاتی جدوجہد اور طبقاتی تقسیم کے خلاف ایک لہر کی صورت میں نمودار ہوگی۔ اس روشنی میں جب ہم اپنے ملک کے نظام تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں تو مایوسی ہوتی ہے۔ ہمارا ملک ایک نظریاتی مملکت ہے۔ جس کا وجود ایک

نظریاتی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہمارے نظام تعلیم میں اس نظریئے کو بنیادی حیثیت حاصل ہونا چاہیئے تھی۔ مگر بدقسمتی سے ابھی تک ہمارا نظام تعلیم وہی ہے جسے انگریزوں نے نوآبادیاتی پس منظر میں اپنی مخصوص ضروریات کے تحت ترتیب دیا تھا۔ یہ نظام مکمل طور پر انگریزوں کے عزائم اور مقاصد کو تقویت پہنچاتا تھا۔ انگریز کو برصغیر میں کسی بڑے مفکر کی ضرورت نہ تھی۔ اپنے اس نوآبادیاتی نظام کو چلانے کے لئے اسے واجبی پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت تھی۔ جن کے پاس ڈگری تو ہو مگر ذہانت ایک حد سے آگے نہ بڑھے۔ آزادی کے بعد صورت حال مختلف ہو گئی۔ نظریاتی تقاضوں اور قومی یکجہتی کے ساتھ ساتھ نئے معاشی اور معاشرتی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے نئے فلسفے اور فکر کی ضرورت تھی۔ ایک نوآزاد ملک میں ایک آزاد شہری کے فرض شناسی، جمہوری روایتوں کے فروغ اور خاص طور پر یہ کہ شہری حقوق سے زیادہ فرائض کی اہمیت کو سمجھیں، یہ سارے مسائل ایک نئے تعلیمی نظام کے متقاضی تھے۔ مگر بوجہ یہ تبدیلی عمل میں نہ آسکی۔ ہم نے آزادی تو حاصل کر لی۔ مگر سسٹم تبدیل نہ کر پائے۔

س : نصاب کو نظام تعلیم میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے یہاں کئی تعلیمی پالیسیاں بنیں۔ مگر نصاب کے سلسلہ میں معمولی تبدیلیاں جن میں زیادہ سے زیادہ ایک مصنف کو نکال کر دوسرے کو شامل کرنا معمول رہا ہے کے سوا کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ آپ اس رائے سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟

ج : مجھے اس رائے سے اتفاق ہے۔ وجہ وہی ہے کہ کبھی بھی توجہ، تفکر اور محنت سے یہ کام نہیں کیا گیا۔ نصاب ترتیب دینے والے حضرات اس سلسلہ میں کوئی قابل قدر خدمت سر انجام نہیں دیتے۔ اس سلسلہ میں پہلے تو درجہ بندی ہونا چاہیئے کہ پرائمری میں ہمیں بچوں کو کیا بتانا ہے۔ مڈل میں کیا اور میٹرک میں کیا۔ اس کے بعد انٹر ڈگری اور پوسٹ ڈگری سلسلے ہیں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ ہم بعض معاملوں میں واضح نہیں ہیں یعنی ہمارے تصورات میں الجھاؤ ہے۔ پرانے اساتذہ

معاملہ اسی صورت میں عمل میں آسکتا ہے جب ہم سب سے پہلے تعلیم کے مقاصد کے بارے میں کوئی واضح تصور قائم کریں گے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تعلیمی نظام کو نئے سرے سے ایک آزاد نظریاتی مملکت کے پس منظر میں مرتب کرنے کی ضرورت اور اہمیت کے احساس کے ساتھ ساتھ اس پر عمل کرنے کی صورت بھی پیدا ہوگی۔

س : تعلیمی انحطاط میں آپ استاد کو کس حد تک ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

ج : مجموعی صورت حال میں دیکھا جائے تو صرف استاد اس انحطاط کا ذمہ دار نہیں، بلکہ سبھی اس میں شامل ہیں۔ مگر ایک دوسرے حوالے سے استاد کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا بھی جا سکتا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کیسے۔ تعلیم کے دو پہلو ہیں ایک تعلیم، دوسرا تربیت، جہاں تک تربیت کا معاملہ ہے اس کی مکمل ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ مگر تعلیم کے معاملہ میں استاد مکمل طور پر ذمہ دار ہے۔ یہ استاد کی شخصیت ہے جو طالب علم کو علمی باریک بینیوں سے آشنا کرتی ہے۔ ماں اپنے بچے کو محفل کے آداب تو سکھا سکتی ہے مگر کسی نصابی نکتے کی وضاحت نہیں کر سکتی۔ اس لئے تعلیمی معاملات میں استاد ہی ایک بہتر راہبر ثابت ہوتا ہے۔ اس حوالے سے استاد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے طلباء میں مضمون کا صحیح ذوق پیدا کرے، محض نصاب کی حد تک پڑھا دینا کوئی بات نہیں۔ اب یہ دیکھا جائے کہ کتنے استاد اپنے شاگردوں میں یہ ذوق پیدا کر پاتے ہیں تو مجھے افسوس ہے کہ یہ تعداد کوئی زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ مگر میں اس سلسلہ میں آنکھیں بند کر کے صرف اساتذہ کو مورد الزام نہیں ٹھہراؤں گا۔ ہمیں یہ بھی تجزیہ کرنا چاہیئے کہ آخر اساتذہ میں یہ رویہ اور رجحان کیسے پیدا ہوا۔ وہ عظیم اساتذہ اب کہاں گئے، جن کے نام سے علم کی دنیا روشن تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں ایمرسن کالج ملتان میں پڑھتا تھا جو ہمارے استاد سعادت علی شاہ جب انگریزی ادب پڑھاتے تھے تو ہماری کلاس میں بے شمار وہ

لوگ بھی ان کا لیکچر سننے کے لئے آتے تھے جو طالب علم نہیں تھے۔ ان لوگوں میں کئی مجسٹریٹ اور وکیل ہوتے تھے۔

مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ آج کے بہت سے استاد ہمیں مایوس کرتے ہیں مگر میں اس کے لئے صرف انہیں ہی ذمہ دار نہیں گردانتا۔ وہ بہرحال اس انحطاط کے شکار معاشرے کا حصہ ہیں۔ ان کی کئی سطحوں پر حوصلہ شکنی بھی ہوئی ہے۔ ایک زمانے میں معاشرے کی اقدار اور تھیں۔ استاد اپنے پیشے کے ساتھ معاشی بدحالی کے باوجود چمٹے ہوئے تھے معاشرہ ان کا احترام کرتا تھا۔ مگر جب سے طلباء کے رویے میں مدافعت کے ساتھ ساتھ مقابلے کا رجحان پیدا ہوا ہے استاد کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے۔ وہ اپنے شاگردوں سے احترام چاہتا ہے۔ مالی طور پر پہلے ہی اسے دوسری ملازمتوں کے مقابلے میں پیچھے رکھا گیا تھا، احترام کے جاتے رہنے سے وہ بالکل ہی دل برداشتہ ہو گیا ہے۔ اس حوصلہ شکنی نے استاد اور شاگرد دونوں ہی کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہیں سے بات بنیادی اقدار کی طرف چلی جاتی ہے۔ تعلیم کے تین بنیادی ادارے ہیں۔ اول گھر، دوم درس گاہ، سوم معاشرہ۔ بچہ معاشرے میں رہتا اور زندگی گزارتا ہے۔ درس گاہ میں سچ کی علمی حیثیت سے متعارف ہوتا ہے۔ تناسب کے لحاظ سے یہ تینوں ادارے اپنی اپنی جگہ اہم ہیں اور ان تینوں میں ایک اہم آہنگی ہونا چاہیئے مگر صورت یہ ہے کہ معاشرتی سچائی اور ہے اور علمی سچائی، یعنی درس گاہ میں استاد جو سچائی سکھاتا ہے اور جسے بچہ سیکھتا ہے وہ خارجی سچائی سے قطعی مختلف نکلتی ہے۔ یعنی تجربہ اور نظریہ دونوں متضاد سمتوں میں لے جاتے ہیں۔ یوں استاد اور شاگرد دونوں ہی خود کو خلاء میں محسوس کرتے ہیں یہیں سے بنیادی المیہ جنم لیتا ہے۔

س۔ اس المیہ اور انحطاط میں کیا استاد کی علمی کمزوری کو بھی کو دخل ہے؟

ج۔ یقیناً ہے، استادوں کی ایک بڑی تعداد اپنے علم میں اضافہ نہیں کرتی۔ دیکھا گیا ہے کہ استاد نے جس سن میں ایم۔ اے کیا ہے اور جو آخری کتاب پڑھی

ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے مضمون میں ہونے والی پیش رفت سے واقف نہیں۔ یہ چیز استاد کے علم کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ اپنے مضمون میں مہارت اور اس کا اپ ٹو ڈیٹ مطالعہ اس کی تدریس میں اثر پیدا کرتا ہے۔ ہمارے کئی استاد، ساری عمر نوٹس کی ایک ہی کاپی پر گزارا کرتے ہیں اور تدریس کا سارا عرصہ اسی کاپی کے سہارے گزار دیتے ہیں۔ آج کا طالب علم تنوع چاہتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کے توسط سے جن میں ٹی وی۔ ریڈیو اخبارات اور کتابیں شامل ہیں۔ وہ بہت سی ایسی باتیں جانتا ہے جو نصابی کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں سے آگے کی ہیں، اس لئے انہیں وہی استاد متاثر کر سکتا ہے جس کا اپنا علم زمانے کے مطابق ہے۔

س : ایسی صورت میں کیا یہ ضروری نہیں کہ جس طرح سائنسی مضامین کے لئے ریفریشر کورسز ہیں، آرٹس کے مضامین میں بھی یہ سلسلہ شروع کیا جائے۔

ج : بنیادی طور پر تو یہ درست ہے مگر معاملہ ہمارے وسائل کا ہے۔ سائنس کے معاملہ میں اس کی ایک JUSTIFICATION یہ ہے کہ اس میں تکنیک اور تصورات بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے اساتذہ کو نئے تصورات سے روشناس کرانے کے لئے ایسے کورسز بہت ضروری ہیں۔ آرٹس کے مضامین میں یہ صورت نہیں۔ یہاں بنیادی تصورات تبدیل نہیں ہوتے۔ اس لئے ہم ان اساتذہ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے طور پر اپنے آپ کو اپنے اپنے مضامین میں عصری تقاضوں اور نئے حوالوں سے روشناس کراتے رہیں۔ اگر استاد خود بھی مطالعہ کی عادت اپنالے تو اس کا علم کبھی پرانا اور زنگ آلود نہیں ہوگا۔

س : آپ خود بھی استاد رہے ہیں اور اب انتظامیہ کے ایک اہم رکن ہیں۔ آپ کی رائے میں اچھے لوگ اس شعبہ میں کیوں نہیں آتے؟

ج ہمارے اساتذہ میں مرد و خواتین دونوں ہی شامل ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ خواتین کا معیار مردوں کے مقابلے میں بہت اچھا ہے۔ میں اس کی وجہ بیان

کرتا ہوں۔ صورت یہ ہے کہ ہمارے معاشرتی رویوں کی وجہ سے خواتین عام محکموں میں جانا پسند نہیں کرتیں۔ ان کے نزدیک دو پیشے بہت قابل عزت ہیں۔ ایک ڈاکٹر دوسرے معلم اس لئے تدریس کے شعبہ میں آنے والی خواتین، ذہانت، تعلیمی معیار اور دیگر صلاحیتوں میں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس مردوں کے لئے پیشوں کا چناؤ بہت مختلف ہے۔ انجینئر، ڈاکٹر، سول سروس، فوج اور دوسرے بے شمار شعبے، یہ سارے شعبے ملازمت کی شرائط کی وجہ سے تعلیم کے شعبہ سے کہیں اچھے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ تعلیم کے شعبہ میں وہی لوگ آتے ہیں۔ جو ان سب شعبوں میں جانے سے رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ آ بھی جائیں تو چند سالوں میں چھوڑ کر دوسری سروسز میں چلے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی معاشرتی رویہ ہے کہ ہمارا معاشرہ استاد کو وہ مقام نہیں دیتا جس کا وہ مستحق ہے۔ ایک آزاد ملک میں استاد مالی طور پر خوش حال ہوتا ہے مگر ہمارے ملک میں اس کی حالت بہت بری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارا سارا ڈھانچہ وہی ہے جو انگریز کا تھا۔ انگریز کو ایک عالم کی نہیں بلکہ تھانیدار کی ضرورت تھی اس نے اس کے نزدیک استاد کے مقابلے میں تھانیدار اور پٹواری کی زیادہ عزت تھی۔ افسوس یہ کہ ہمارا رویہ بھی یہی ہے۔ میں جب کیڈٹ کالج میں تھا تو ایک بار ایک تھانیدار مجھ سے ملنے آیا۔ میرے پاس کچھ لیکچرار بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے تھانیدار سے ان کا تعارف کروایا تو تھانیدار نے ان سے ہاتھ تک ملانے کی زحمت نہ کی۔

استاد کی عزت بنیادی چیز ہے اور یہ کام حکومت عوام، معاشرہ سبھی کا ہے کہ وہ استاد کو اس کا جائز احترام دے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ پنجاب میں لیکچراروں کی تعداد آٹھ ہزار سے زیادہ ہے مگر گریڈ بیس کی صرف تین پوسٹیں ہیں۔ سوچا جائے تو کالج کا پرنسپل کتنی اہم ذمہ داری نبھاتا ہے، مگر اس کا مقام کیا ہے؟ اگر ہم اساتذہ کو بھی دوسری سروسز کے مطابق سہولتیں دیں تو اچھے لوگ اس طرف آئیں۔ موجودہ صورت میں یہاں کیا کشش ہے؟ بات اتنی سی ہے کہ ہم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اس سارے معاملے کا از سر نو جائزہ لیں۔ استاد کا احترام، مقام اور تنخواہ یہ ہو جائے تو

میرا استاد سے باز پرس بھی ہو کہ وہ کس حد تک اپنے منصب کے تقدس کا خیال رکھتا ہے؟
میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس طرف توجہ دی جائے تو یقیناً وہ لوگ جو سروس کے لئے امتحانات
دیتے ہیں۔ سب سے پہلے اس طرف آئیں کہ بحیثیت استاد ایک شخص زیادہ بہتر طور پر
اپنے علم اور قابلیت کا اظہار کر سکتا ہے۔ استاد کا مرتبہ بہت عظیم ہے۔ سقراط نے کیوں
زہر پیا تھا صرف اس لئے کہ وہ ایک استاد تھا۔ کوئی عام آدمی زہر پینے کا تصور بھی
نہیں کر سکتا۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ تعلیم آدمی کو جرأت اور ذہانت عطا
کرتی ہے اور اس کے اندر چھپے ہوئے امکانات کو روشن کرتی ہے۔

س : جب آپ نے موجودہ کینٹ ادارے اپنی تحویل میں لئے تھے۔
تو آپ کے ذہن میں یقیناً کچھ خواب، خاکے اور منصوبے ہوں
گے وہ کس حد تک پورے ہوئے۔

[illegible] ت حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ موجودہ نظام میں پیمانہ نتائج
[illegible] ہیں، اس کے علاوہ انتظامی معاملات میں بھی پیش رفت ہوئی
[illegible] م و ضبط میں بھی بہت کامیابی ہوئی ہے۔ ہم اس سلسلہ میں
[illegible] اساتذہ کی ترقیاں، ملازمتوں کا تحفظ اور غیر ضروری
[illegible] سے گریز وغیرہ وہ معاملات ہیں۔ جنہوں نے مجموعی طور پر اچھے اثرات
[illegible] ساتھ ساتھ ہم نے کچھ محاسبہ بھی کیا۔ مثال کے طور پر اساتذہ کے
[illegible] کچھ کمی محسوس ہوتی تو زبانی طور پر یا تحریری طور پر اس کی
[illegible] کام نہیں لیا۔ ہاں جہاں خرابی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہاں
[illegible] مجھے خوشی بھی ہے کہ اساتذہ نے ہم سے تعاون کیا۔ نئے اساتذہ کے
[illegible] بہت توجہ سے کام لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک تعلیمی ادارے کو بہت
[illegible] اہم چیز اساتذہ کا معیار ہے اور یہ کوئی مبالغہ نہیں کہ ہمارے
[illegible] تعداد بہت بہتر لوگوں پر مشتمل ہے۔

س : کیا آپ کو اس سلسلہ میں کچھ مشکلات بھی پیش آئیں۔

ج : شروع میں کچھ مشکلات پیش آئیں۔ ہم ایک ذہنی انقلاب چاہتے تھے۔ اس کے لئے ہمیں خاصی محنت کرنا پڑی۔ وجہ یہ کہ لوگ ایک خاص طرز سے کام کرنے کے عادی تھے۔ بہت سے لوگ فرض شناسی کے احساس سے عاری بھی تھے۔ یوں سمجھیے کہ احساس زیاں نہ تھا۔ ہم نے اسے طرز کو تبدیل کیا اور کامیاب ہوئے۔ دوسری چیز مالیاتی مشکل تھی۔ خوش قسمتی سے وفاقی وزارتِ تعلیم نے اس سلسلے میں ہم سے بہت تعاون کیا۔ عمارتوں کی از سر نو درستی، فرنیچر، سامان وغیرہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی ترقیوں اور دیگر سہولتوں کے مسائل مالی معاملات سے متعلق تھے، بہر حال ہم نے بڑی حد تک ان معاملات پر قابو پانے کی کوشش کی ہے اور کر رہے ہیں۔

(محرکِ گفتگو : رشید امجد، سید فاروق علی)

م۔ ایچ۔ ھمدانی

ایم۔ ایچ۔ ھمدانی سے ایک گفتگو

کیا آپ موجودہ تعلیمی صورتِ حال سے مطمئن ہیں؟

مطمئن ہو جانا جمود کا دوسرا نام ہے۔ آگے بڑھنے اور چیزوں کو بہتر سے بہتر بنانے کا جذبہ بنیادی چیز ہے۔ موجودہ تعلیمی نظام بھی اپنی اچھائیوں اور برائیوں سمیت ہمارے سامنے آتا ہے۔ میں مسلسل جد و جہد پر اعتقاد رکھتا ہوں۔ اس لئے موجودہ تعلیمی نظام کے بارے میں بھی میری یہ کوشش ہے کہ اسے کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ میری اپنی سطح پر میری اور اس کالج کے اساتذہ کی ذاتی توجہ کوشش اور محنت سے اور ملکی سطح پر اجتماعی محنت اور توجہ سے۔ ہم مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔

ایک پرنسپل کی حیثیت سے آپ کے مسائل کیا ہیں؟

ایک پرنسپل کی ذمہ داریوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اسے پانچ چھ محاذوں پر توجہ رکھنا پڑتی ہے اور ہر شخص کو مطمئن کرنا ہوتا ہے۔ طلباء، والدین انتظامیہ، اساتذہ اور دوسرے لوگ یعنی عام لوگ اور اخبارات وغیرہ وہ محاذ ہیں

جہاں پرنسپل کو اپنی اور کالج کی نیک نامی کے لئے کام کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی مطمئن نہ ہو تو پرنسپل کے لئے کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ اتنی ساری ذمہ داریوں کے مقابلہ میں ایک پرنسپل کے اختیارات کیا ہیں؟ وہ مسلسل غیر حاضر رہنے والے ایک چپراسی کو بھی برطرف نہیں کر سکتا۔ ٹھیک کام نہ کرنے والے عملے کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ اس کی شکایت لکھ کر انتظامیہ کو بھیج دے۔ اب انتظامیہ کے اپنے مسائل اور حدود ہیں۔

پرنسپل کا عہدہ جہاں ایک اہم ذمہ داری ہے وہاں اپنے اندر بڑی نازک صورت حال کو بھی چھپائے ہوتے ہے۔ اساتذہ کی کارکردگی اور نتائج کی ذمہ داری بالآخر پرنسپل ہی کے سر ہے۔ پرنسپل کو نہ صرف کہ اپنے عملے سے کام لینا ہوتا ہے۔ بلکہ اسے مطمئن کرنا بھی ہوتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ ہر طبقہ اور فرد خود کو مظلوم سمجھتا ہے۔ اگر جائز بنیادوں پر بھی اس کا کوئی کام رد ہو جائے تو وہ اسے اپنے ساتھ ایک زیادتی تصور کرتا ہے اور فوراً حکام بالا تک غلط رپورٹ پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ یک طرفہ تصویر پرنسپل کے لئے بہت نازک صورت پیدا کر دیتی ہے۔

ہماری تعلیمی پالیسیاں کیا ہیں؟

تعلیمی پالیسیاں زیادہ تر ABSTRACT ہوتی ہیں۔ ان کی فکری سطح زیادہ ہے اور عملی کم۔ وہ صرف "خاکہ" فراہم کرتی ہیں۔ اصل معاملہ اس خاکہ میں OUT PUT پیدا کرنا ہے اور یہ کام ہمارا ہے۔

ہونا یہ چاہیئے کہ اداروں کے عملی مسائل کو سامنے رکھ کر پالیسیاں بنائی جائیں اور جو لوگ ان معاملات کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان سے مشورہ کیا جائے۔ محض کاغذی سطح پر بڑی بڑی باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جب تک ان کی عملی سطح سامنے نہ ہو۔ پچھلے دنوں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے بہت سے مسائل کو سامنے

رکھ کر ایک ورکنگ پیپر تیار کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس پر کس حد تک عمل ہو سکے گا

کیا آپ اپنے اساتذہ کے عمل اور معیار سے مطمئن ہیں ؟

جہاں تک میرے اساتذہ کا تعلق ہے۔ میں ان کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ لیکن مجموعی صورتِ حال میں چند گذارشات پیش کرتا ہوں۔

سب سے پہلے تو اساتذہ کا ملک سے باہر جانا ہے۔ باہر کی کشش۔ مالی فوائد وہ عوامل ہیں جن کی وجہ سے ہمارے کئی اچھے اساتذہ ہمیں چھوڑ گئے ہیں۔ یہ رجحان قومی سطح پر اچھے اساتذہ کی کمی کا سبب بن رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہمارے درخت اکھیڑے جا رہے ہیں۔ ان کی کمی فوراً پوری نہیں ہو سکتی۔ اب جہاں تک متبادل کا مسئلہ ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس کی شکایت نہیں ہے کہ ہمارے آرمی ڈائریکٹوریٹ والے اس معاملہ میں بہت جلد عمل کرتے ہیں اور ہمیں فوراً ہی متبادل اساتذہ مل جاتے ہیں۔ مگر اکثر حالتوں میں یہ متبادل اساتذہ اتنے بہتر نہیں ہوتے کہ جانے والوں کی پوری کمی دور کر سکیں۔ اسی بات کے تسلسل میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مجموعی طور پر اساتذہ کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی معیار اور تعداد بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ B.A. اور B.Sc. میں داخلے بتدریج کم ہو رہے ہیں۔ لوگ دوسرے فنی شعبوں کی طرف جا رہے ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ مستقبل میں اچھے استادوں کا حصول ایک مشکل مرحلہ ہو جائے گا۔

آج کی خارجی حقیقتوں کے پس منظر میں حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ اساتذہ کو ان کا جائز مقام حاصل نہیں۔ مالی اعتبار سے بھی وہ دوسرے طبقوں اور ملازمتوں سے پیچھے ہیں۔ دوسرے محکموں میں رہائشی سہولتیں، طبی سہولتیں، ترقی اور دیگر سہولتوں کی شکل میں ایسے چھپے ہوئے فوائد ہیں جو بہت سے اچھے لوگوں کو محکمۂ تعلیم کی طرف نہیں آنے دیتے۔ اگر کام کرنے والا مطمئن ہوگا تو جی لگا کر کام کرے گا۔ لیکن یہاں یہ چیز بھی مد نظر رکھنا چاہیے کہ صرف اچھے پیسے دینے سے ہی اچھا استاد نہیں مل سکتا۔ اصل بات استاد کا احترام ہے

اور استاد کے اندر یہ جذبہ پیدا کرنا ہے کہ وہ اپنے استاد ہونے پر فخر کرے۔ یہ نہ سوچے کہ وہ استاد کی بجائے پٹواری ہوتا تو بہتر تھا۔ مگر استاد کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ عزت اور احترام کمایا جاتا ہے۔ صرف استاد کی حیثیت سے تقرر بنیادی بات نہیں۔ اصل چیز استاد بن کر اپنے آپ کو اچھا استاد ثابت کرنا ہے۔

اساتذہ کے بارے میں ایک عام شکایت یہ ہے کہ وہ اپنے علم کو اپ ٹو ڈیٹ نہیں رکھتے۔ انہوں نے خود کو نصاب تک محدود کر دیا ہے۔ ان کی اکثریت تعلیم کے مختلف پہلوؤں سے نابلد ہے۔ شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ استاد کے لئے پڑھنے اور خود کو عصری شعور سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کوئی تحریک نہیں ہے۔ ترقی بغیر کوشش کے محض سینیارٹی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ میری تجویز ہے کہ اساتذہ کی ترقی اور سالانہ ترقی کے لئے امتحانات یا ریسرچ پیپر کا طریقہ رائج کیا جانا چاہیئے۔ اے، بی، سی تین گریڈ ہونا چاہیئے۔ استاد کو اپنے موضوع کے علاوہ دیگر چیزوں کا امتحان بھی پاس کرنا چاہیئے۔ مثلاً طلبا کی نفسیات، کچھ انتظامی مسائل سے شناسائی جنرل نالج وغیرہ۔ اس کے علاوہ اساتذہ کو سالانہ کتاب الاؤنس دیا جانا چاہیئے تاکہ وہ کتابیں اور رسالے خرید سکیں۔

میری رائے ہے کہ اساتذہ کے مسائل کا وسیع تر قومی مفاد میں از سر نو جائزہ لے کر جرأت مندانہ فیصلے کئے جانے چاہئیں تاکہ قومی ترقی کی بنیاد کو بہتر طریقوں پر استوار کیا جا سکے۔

جہاں تک طلباؔ اور تعلیمی اداروں کے دیگر مسائل کا تعلق ہے۔ اس کے لئے بھی بعض بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اصل خرابی اسکولوں کی سطح پر ہو رہی ہے۔ ہمارے یہاں پرائمری تعلیم پر کم اور ہائر ایجوکیشن پر زیادہ خرچ ہو رہا ہے۔ یعنی ۲۰ فیصد نیچے اور ۸۰ فیصد اوپر کی سطح پر۔ حالانکہ نیچے کی سطح پر زیادہ خرچ ہونا چاہیئے تاکہ نچلی سطح پر طلبا کی ایک بہت اچھی کھیپ اوپر آئے۔ اوپر کی سطح پر مسائل بھی کم پیدا ہونگے اور طلباء کا بنیادی معیار بھی اچھا ہو گا۔

میری رائے میں میٹرک تک جنرل ایجوکیشن ہونا چاہیئے۔ انٹر کی سطح پر رجحانات
رسیدہ کا تعین ہونا چاہیئے۔ داخلہ کے لئے واضح طور پر سب کالجوں میں ایک ہی معیار
مقرر کیا جائے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ بعض کالجوں کا معیار بہت عمدہ ہے، بعض کا کم۔ نتیجہ
یہ کہ بعض ایسے طلباء بھی داخلہ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جو سنجیدگی سے تعلیم جاری
رکھنے کی بجائے سیاسی اور ہنگامی شور شرابے کو پسند کرتے ہیں۔ طلباء کی یونین
پر تازہ ترین پابندی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تعلیمی اداروں کی تباہی کا بنیادی سبب
سیاست ہے۔ یہ سیاست باہر سے آتی ہے۔ یونین کے نہ ہونے سے اس سال کورس
بھی صحیح وقت پر ختم ہو رہے ہیں اور سماجی تقریبات بھی ہو گئی ہیں۔ یونین کے
زمانے میں یہ سب کچھ ممکن نہیں۔ یونین کی بجائے اگر طلباء کی کونسل بنا دی جائے تو
بہتر ہے۔ یہ کونسل مختلف سوسائٹیوں کے منتخب عہدیداروں پر مشتمل ہو۔ ادبی سوسائٹی
کا صدر اس کا چیئرمین ہو۔ اس طرح تعلیمی سکون مہیا ہو سکے گا۔ یونین ہنگامے کروانے
کے سوا اور کوئی مثبت کام نہیں کرتی۔ یونین مجھے آکاش بیل کی طرح لگتی ہے جو طلباء
کی ساری سوسائٹیوں کو کھا جاتی ہے۔ یونین اپنے زمانے میں کوئی تقریب نہیں ہونے
دیتی۔ بہت عرصے سے ڈرامہ، موسیقی اور ادبی پروگرام صرف یونین کی بالادستی کی وجہ
سے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

میں بنیادی طور پر اس بات پر اعتقاد رکھتا ہوں کہ طلباء کو تعلیم کے ساتھ
ساتھ سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہیئے تاکہ طلباء شیشے توڑ کر موسیقی سننے کی
بجائے موسیقی کے باقاعدہ پروگرام کے ذریعے یہ ذوق پیدا کر سکیں۔

اب رہی اداروں کی انتظامی اور مالی صورت حال تو اداروں پر مشکل
وقت آرہا ہے۔ ہمارے وسائل محدود ہیں اور اخراجات لامحدود، ہماری فیسوں
اور دیگر فنڈز کی شرح پندرہ سال پرانی ہے۔ اخراجات کا پہلو اس کے مقابلے میں
کہیں زیادہ ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر لائبریری کے لئے کتابوں کی قیمت میں اضافہ
کھیلوں کے سامان کی بڑھتی ہوئی قیمت، تقریبات کے اخراجات وغیرہ فنڈ کے

شرح کے مقابلے میں اب کہیں زیادہ ہیں۔ اس طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یا تو طلبا سے وصول کئے جانے والے فنڈز کی شرح بڑھائی جائے یا پھر کسی اور ذریعے سے تعلیمی اداروں کی مالی معاونت کی صورت پیدا کی جائے۔ موجودہ صورت میں یہ معاملہ خاصا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

محرکِ گفتگو: رشید امجد

اپنے کالج کے اساتذہ کے معیار سے تو بہت مطمئن ہوں اگر کہیں اساتذہ کا معیار اطمینان بخش نہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اصل وجہ طلبا کی تعداد میں زیادتی اور اساتذہ کی تعداد میں کمی ہے۔ اساتذہ کے فقدان کے باعث معیار میں کمی ہوتی ہو تو ہو ورنہ ان کا معیار تسلی بخش ہے۔ یہ کہنا اتنا درست نہیں کہ نتیجہ کسی طالب علم کی قابلیت کی صحیح نمائندگی نہیں کرتا۔ بہت کم ایسا ہوتا ہوگا اس کا رزلٹ اتنا ہی معیاری ہوگا ہاں اگر امتحانوں کے نزدیک کسی وجہ سے ایک طالبعلم اپنی پڑھائی کو زیادہ توجہ نہیں دے سکا تو ہو سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ اس کی قابلیت کے عین مطابق نہ ہو۔ اسی طرح ایک نالائق طالب علم بھی کسی ناجائز ذریعہ سے پاس مارکس لے سکتا ہے۔ تعلیمی انحطاط کی ذمہ داری میں ہرگز طلبا پہ نہیں ڈالتا۔ جب ہمارے پاس کوئی طالب علم آتا ہے تو وہ آوارہ نہیں ہوتا۔ وہ کسی سیاسی پارٹی سے منسلک نہیں ہوتا۔ اب وہ یہ سب کچھ اسی ماحول ہی سے اخذ کرے گا۔ جولے کالج میں آکر ملے گا۔ اور کوئی طالبعلم شروع ہی سے ایسا ہے تو یقیناً یہ اس کے گھر کے ماحول اور تربیت کا اثر ہے تو میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس چیز کا ذمہ دار پورا معاشرہ ہے۔ اس میں والدین بھی شامل ہوتے ہیں اور سیاست دان بھی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تعلیمی اداروں کو سیاست سے پاک رکھنے کے لئے حکومت کو تمام سیاست دانوں سے مل بیٹھ کر اس مسئلے پہ غور کرنا چاہیئے اور سیاست دانوں سے اپیل کرنی چاہیئے کہ وہ طلبا میں اپنی سیاست چمکا کر ان کا نقصان ہرگز نہ کریں۔ اس طرح نہ صرف طلبا کا مستقبل خراب ہوتا ہے بلکہ پورے ادارے کا ماحول بُری طرح متاثر ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ اس طرح

نوجوانوں میں جمہوریت کا شعور پیدا ہوتا ہے تو اس کے لئے اچھا بھلا طریقہ پہلے سے رائج ہے یعنی سٹوڈنٹس یونین کا۔ طلبا بصد شوق انتخابات میں کھڑے ہوں۔ اس

طرح کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ مگر کالج کے اندر رہ کے اور جہاں تک ملکی سیاست کا تعلق ہے تو وہ ہر شہری کا بنیادی حق ہے کہ کسی بھی سیاسی جماعت سے اپنی ہمدردی قائم رکھے۔ لہذا اگر طلبا کو ایسی پارٹیوں کے لئے خدمات انجام دینا چاہتے ہیں اور یہ خدمت وہ اداروں سے باہر کریں۔

نظام امتحانات سے میں مطمئن ہوں۔ اگر چند نقائص کے باعث رائج الوقت نظام امتحانات سے اطمینان کا اظہار نہیں کیا جاتا تو ہمیں چاہیئے کہ بجائے کسی نئے نظام کی خامیوں کو دور کر کے اسے مزید بہتر بنایا جائے۔ ہمارے ہاں ایک بیماری ہے کہ اگر کوئی پالیسی کامیاب ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی تو اسے ہم ختم کرنے کا سوچتے ہیں۔ اس کو درست کرنے کا ہرگز نہیں۔ ویسے بھی دفتروں میں بیٹھ کر پالیسیاں بنانا تو ہمارے ہاں کا پرانا رواج ہے۔ ان سے ہرگز مشورہ نہیں لیا جاتا جو فیلڈ میں موجود ہوں اور جو صحیح معنوں میں مسائل و مشکلات کا سامنا کرتے ہوں۔

ڈاکٹر محمد ریاض

اس سلسلے میں بعض اساتذہ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے سب کو نہیں مجموعی طور پر میں اس کا ذمہ دار اساتذہ کو نہیں سمجھتا۔ دراصل طلبا اور اساتذہ کا رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔ دونوں فکری اعتبار سے سیاست میں قدم رکھ چکے ہیں جس کی وجہ سے یک جہتی میں کمی آ گئی ہے۔

دوسری بات اساتذہ کا بعض وجوہ کی بنا پر طلبا پر کنٹرول نہیں رہا۔ طلبا کو بھی اتھارٹی کو چیلنج کرنے کا موقع مل گیا ہے جس کی وجہ سے اساتذہ بے بس ہیں اور بعض اساتذہ معیار پر نہیں اترتے۔ طلبا میں تن آسانی کا رجحان بڑھ گیا ہے

کالجوں کا تعلق ملازمت پر مبنی ہوتا ہے۔ قابلیت جس کی وجہ سے پڑھی نہیں

ما ہیتی۔ خواہ پاس ہونے والا کچھ بھی نہ جانتا ہوں۔ بلکہ فیل ہونے والا بہت کچھ جانتا ہو۔ کسی مجبوری کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے۔ غرض تجسس کا مادہ ختم ہوگیا ہے

نظام تعلیم پر محنت نہیں ہوتی۔ اسلام آباد میں جو سلیبس لکھا جاتا ہے۔ وہ لاہور کے سلیبس کے ذریعہ لکھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے مضمون کے قابل اساتذہ سو فیصدی ترتیب میں نہیں آتے نصاب تعلیم مرتب ہوتے ہوتے عرصہ لگ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے نظریات پرانے ہو جاتے ہیں۔ تعلیمی انحطاط کی ذمہ داری سب پر یکساں آتی ہے۔

اساتذہ کی کمی کی وجہ نشستوں کی قلت ہے۔ اساتذہ کی کمی نہیں صرف پرسٹوں کی کمی ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کی فراوانی ہے۔ اساتذہ جس معیار سے پڑھا رہے ہیں درست ہے۔ آہستہ آہستہ سب درست ہو جائے گا۔ میں اس بات کا قائل نہیں کم از کم میرے پاس کوئی شکایت نہیں آئی۔

موجودہ حکومت کے دو کارنامے ہیں۔ ایک اسلامی نظام اور دوسرا اردو کو صحیح مقام دلوانا۔ یہ ایسے اقدام ہیں کہ ہم لوگ تعریف نہ کریں گے تو آنے والی نسلیں اس کی اس کی تعریف کریں گی۔ اگر انگریزی کو کالجوں اور دفتروں میں ختم کر دیا جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ انگریزی پاکستان میں ختم کر دی جائے کاروباری نقطۂ نگاہ سے سیکھنی چاہیے۔ کالجوں میں کم از کم دفتری امور اردو میں کرنے چاہئیں۔

نظام امتحان بیانیہ اور معروضی دونوں قسم کے مطمئن نہیں کر سکتے۔ کئی طلبا قابلیت کا اظہار نہیں کر سکتے۔ سمسٹر سسٹم ہونا چاہیے۔ دوسری بات زبانی عنصر کے امتحانات بھی ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔ اچھے امتحانات کے سلسلے میں اساتذہ پر اعتماد بہت ضروری ہے۔

زندگی کے ہر شعبے میں خدا ترقی ہو تو امتحان سے بدعنوانی بھی ختم ہو سکتی ہے معاشرہ سے ہم اپنے آپ کو بری نہیں کر سکتے۔ معاشرہ کو بہترین بنانے کا طریقہ حکومت کے پاس ہے اور وہ ہے سختی اور سزائیں۔

تعلیمی پالیسی طلبا کے مسائل حل کر سکتی ہے۔ مگر شرط ہے کہ طلبا دین کے جذبے سے سرشار ہوں۔ تعلیمی پالیسی میں ابتدائی تعلیمی مسئلے کو بڑی اچھی طرح سلجھایا گیا ہے مسجدوں سے استفادہ کرنا انتہائی سود مند ہوگا۔ مسجدوں کے تقدس اور احترام کا درس سکھایا جائے تو نئی عمارات کی ضرورت نہیں۔ تعلیمی پالیسی میں خوبی یہی ہے کہ پیشہ ورانہ ہنر کو سکھانے کے بہترین انتظامات ہیں۔

ڈاکٹر ظفر احمد خان

آج کے اس دور میں تعلیمی انحطاط کا ذکر بے معنی ہوگا۔ کیونکہ اس دور میں ہمارے ہاں کوئی تعلیمی انحطاط نہیں ہے۔ طلبا اساتذہ سے بہتر ہیں اور اساتذہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے طلبا پہ بہتان تراشی کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے تعلیمی انحطاط کا ذکر چل نکلا ہے۔ زمانۂ سابق میں جبکہ پاکستان عالمِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ طلبا کے لئے تعلیم کے مواقع کم تھے۔ داخلے مشکل سے ملتے تھے۔ جس کی وجہ سے صرف طلبا جو کہ حقیقی طلبا ہوتے تھے داخل ہو سکتے تھے اس لئے رزلٹ بھی بہتر آتا تھا۔ آج کل صورت حال اس سے الٹ ہے اور اس کا اندازہ — ملک میں موجود ڈاکٹروں، انجینئروں اور وکلاء کی تعداد سے کیا جا سکتا ہے ادھر ہم نے ورلڈ ٹاپ ایجوکیشن میں بے حد ترقی کی ہے۔ موجودہ نظام تعلیم اصولی لحاظ سے مکمل اور جامع ہے۔ مگر عملاً اس پہ عمل کرنا شائد مشکل سا نظر آتا ہے۔ کیونکہ پالیسی مرتب کرنے والے باہر کے لوگ ہیں۔ جن کا براہ راست رابطہ تعلیمی ماحول سے نہیں ہے۔ یعنی وہ لوگ اصل مسائل سے آگاہ نہیں ہیں۔ چند ہاتھوں میں ایجوکیشن مرتکز ہو کر رہ گئی ہے۔

معیاری قومی زبان اردو ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان کی بنیادی زبان کو ابھی تک اس ملک میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی یہ متقاضی تھی اس کی وجہ

یہ ہے کہ تعلیمی میدان سے تعلق رکھنے والے معاشرے کا اثر قبول کئے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ اردو کو اپنا مقام اولی نہیں خیال کر پاتے اور اس سے اردو کو روز افزوں ترقی نہیں مل سکتی۔ اس طرح انگریزی میڈیم اسکولوں کا قیام بھی اس سلسلہ میں ایک رکاوٹ بن گئی ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی مرتب کرتے وقت بہت سی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس پر عمل پیرا ہونا مشکل ہے۔ کیونکہ طلبا اور اساتذہ کی ایک کثیر تعداد کا آپس میں رابطہ نہیں ہے۔ کالج میں دوسری غیر نصابی سرگرمیاں کم کر دی گئی ہیں۔ طلبا۔ اور اساتذہ صرف کالج آنے اور چلے جانے کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں۔ ان کا حل صرف طلبا اور اساتذہ میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ اساتذہ کا معیار کسی حد تک غیر مطمئن ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ استاد کو صرف استاد خیال کر کے انکی تعلیم و تربیت کو محدود کر دیا گیا ہے۔ وہ اسلوب و آہنگ سے روشناس نہیں اور اپنی پرانی تعلیم سے طلبا کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس سے بڑی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اساتذہ ذہنی صلاحیتوں کو جلا دے کر طلباء کو مطمئن کر سکتے ہیں

کسی معاشرے کی تشکیل میں طلبا ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک قابل قبول قیادت کے تحت وہ اپنے مسائل کو احسن طریقے سے حل کر سکتے ہیں اور اس لئے طلبا کے لئے یونین کی تشکیل ایک اہم تقاضا ہے۔ جس کو پورا کرنا انتہائی ضروری ہے۔

اب تو نہ وہ پہلے والے استاد رہے ہیں اور نہ ہی وہ طالب علم در اصل سٹوڈنٹس میں پہلے والی لگن نہ رہنے کی وجہ میرے نزدیک اردگرد کی غیر نصابی

سرگرمیاں ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال ٹی۔ وی ہے۔ جس کے باعث طلبا اپنا
بہت سا قیمتی وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ اساتذہ کا معیار گرنے کی وجہ یہ ہے کہ
سرکاری اداروں میں صرف تین نتائج ہی کو پرکھا جاتا ہے۔ یعنی اگر کسی استاد کی
کارکردگی کا جائزہ لینا ہو تو پچھلے تین سال کا حساب کتاب لیا جاتا ہے۔ جب کہ
پرائیویٹ اداروں میں یہ بات نہ تھی۔ پرائیویٹ اداروں میں اساتذہ تنظیم اعلیٰ
کے سامنے جواب دہ ہوتے تھے۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ جب سے پرائیویٹ تعلیمی
اداروں کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور اداروں کی اکثریت سرکاری تحویل میں لئے جانے
سے تمام اساتذہ نے سرکاری ملازمین کی حیثیت اختیار کرنے سے جو سیکیورٹی پائی
ہے۔ اس وجہ سے اساتذہ دل لگا کے محنت نہیں کرتے۔ تعلیمی انحطاط کا مکمل طور
پر اساتذہ کو ذمہ دار اس لئے نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ کیونکہ ان کے سامنے طلبا کی تعداد
سینکڑوں کے حساب سے ہوتی ہے۔ کچھ اس وجہ سے بھی نتائج اتنے معیاری نہیں
ہوتے۔ اگر اساتذہ کی کمی کو دور کیا جائے یا سٹوڈنٹس کی تعداد کم کی جائے تو پھر
نتائج معیاری برآمد نہ ہونے کی صورت میں ہم تعلیمی انحطاط کی ذمہ داری اساتذہ
پر ڈال سکتے ہیں۔ قابلیت کی کمی اس وجہ سے ہے کہ ہر ایک کو پیسہ کمانے کی پڑی
ہوئی ہے۔ لہٰذا اس مادیت نے قابلیت پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ لہٰذا لوگ تعلیم
محض ڈگری حاصل کرنے کے لئے لیتے ہیں۔ قابلیت پر اس لئے توجہ نہیں دیتے کیونکہ
اس سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو کہ خالص ڈگری کے لیبل سے یعنی اچھی
ملازمت ملنا اور پھر پیسہ کمانا۔ نظام امتحانات سے تو میں مطمئن ہوں۔ کالج ہی میں چھوٹے
موٹے ٹیسٹ ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے طالبات دو سالوں بعد امتحان دینے کی اچھی

خاصی پریکٹس کر چکی ہوتی ہیں۔ اردو ذریعہ تعلیم اس لئے موزوں نہیں کیونکہ اعلیٰ تعلیم
کے حصول کی خاطر لوگوں کو بہر صورت باہر جانا ہوتا ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں
کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم غیر ملکی زبان میں مہارت حاصل کریں

جہاں تک اپنے کالج کا تعلق ہے تو میں اساتذہ کے معیار سے مطمئن ہوں۔ باقی
اداروں کے اساتذہ کے متعلق رائے دینا ضروری نہیں سمجھتی۔ یہ کہنا درست نہیں۔
کہ نتیجہ کوئی معیار نہیں۔ بلکہ اصل چیز قابلیت ہے۔ بہت کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ نتیجے اور
قابلیت میں فرق پایا جائے تو اس کی وجہ محض اتفاق ہے۔ ہوسکتا ہے ایک لائق طالبعلم
امتحانوں کے قریب بیمار ہو جائے یا کمرۂ امتحان میں گھبرا جائے تو یہ بہت حد تک ممکن
ہے کہ اس کا نتیجہ اس کی قابلیت کے معیار پر پورا نہ اترے۔ بعض اوقات حالات کا
اس سے برعکس ہونا بھی ممکن ہے۔ سارا سال پڑھائی نہ کی۔ مگر اتفاق سے نقل وغیرہ
لگا کر اچھا پیپر دیا جا سکتا ہے۔ ویسے قابلیت کے بارے میں یہ کہوں گی کہ ہمارے
ہاں قابلیت بہت ہے۔ مگر بدقسمتی سے قابل لوگوں کو اپنی قابلیت کے اظہار کے لئے
مواقع فراہم نہیں ہوتے مثلاً کوئی باہر سے سائنس میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے آئے۔
تو اسے یہاں مزید تحقیق کے لئے منصوبے سے متعلق کوئی تجربہ گاہ یا تحقیقاتی مرکز میسر
نہیں۔ ورنہ ہمارے ہاں قابل لوگوں کی کمی نہیں۔ قابلیت ظاہر نہ ہونے کی دوسری بڑی
وجہ معاشی الجھن بھی ہے۔ جس کو دیکھو پیسے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے
کی کوشش میں ہے۔ میرے نزدیک انحطاط کی ذمہ داری اساتذہ، والدین اور سٹوڈنٹس
پر نہیں ہے۔ بلکہ سارے معاشرے پر ہے۔ دریا کے دھارے کے ساتھ سب کچھ بہتا
ہے۔ اگر بہاؤ انحطاط کی جانب ہے تو ہر شعبہ ایک ہی جانب بہتا چلا جائے گا اساتذہ
کی کمی کے بارے میں یہ کہوں گی۔ کم از کم خواتین میں یہ کمی محسوس نہیں کی جاتی۔ ویسے بھی
مرد حضرات میں بھی میرے خیال کے مطابق کوئی کمی نہیں اگر کمی محسوس کی بھی جاتی تو وہ
پبلک سروس کمیشن کی کاہلی کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ ورنہ اب تو پہلے سے حالات بہت

سدھر گئے ہیں۔ اساتذہ کو بہت اچھا گریڈ مل چکا ہے۔ معاشرے میں ان کا اچھا خاصا مقام ہے۔ بس یہ ہے کہ اور شعبوں میں رشوت چل سکتی ہے مگر یہاں نہیں۔ اُردو ذریعۂ تعلیم سے تو میں متفق ہوں۔ یعنی آپ بچوں کو غیر ملکی زبان میں پڑھائیں گے تو وہ گونگے ہو جائیں گے۔ ٹھیک ہے انگریزی پڑھائی جائے مگر صرف فنکشنل انگلش پر زور دیا جائے اور جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو وہ لازمی نہیں ہونا چاہیئے۔ جنہیں شوق ہے وہ پڑھیں۔ جہاں تک نظامِ امتحانات کا تعلق ہے تو میں تو موجودہ امتحانات سے مطمئن ہوں۔ سمسٹر سسٹم کے بارے میں پبلک سروس کمیشن کی طرف سے رپورٹ ملی ہے کہ سمسٹر سسٹم کے تحت گریڈ اے لینے والا طالب علم ایک لفظ بھی نہیں جانتا۔ ناجائز ذرائع سے سمسٹر سسٹم میں پاس ہونا کوئی مشکل بات نہیں۔ خواتین کی الگ یونیورسٹی محض ایک سٹنٹ ہے۔ خرچہ بڑھانے والی بات ہے۔

---------- تجربہ گاہیں اور لائبریریاں بھی کافی اخراجات بڑھانے والی ضرورتیں ہیں اور اگر خواتین یونیورسٹی کا الگ انتظام اتنا ہی ضروری ہے تو خواتین کالجز کے ساتھ ایم اے کی کلاسز جاری کی جا سکتی ہیں جس طرح لاہور کالج اور اسلامیہ کالج میں چند ایم اے کی کلاسز کی سہولت ہے۔ اسی طرح دو دو تین تین ایم اے ہر وومین کالج کے ساتھ ملا سکتے ہیں تو اس مشکل پر کافی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔

محرکِ گفتگو: شکیل اختر

مضمون اردو

اس حقیقت سے کسی ذی شعور شخص کو انکار نہیں ہے کہ ماضی کے مقابلے میں آج
کل تعلیمی معیار انحطاط پذیر ہے۔ اس انحطاط کی ذمہ داری کسی ایک فریق اور فرد پر
نہیں ڈالی جا سکتی۔ اس میں پرائمری سے لے کر کالج تک کا ماحول، اساتذہ، طلباً
پالیسی مرتب کرنے والے اور معاشرہ سب کا ہاتھ ہے۔ لیکن سب سے بڑی
ذمہ داری والدین پر آتی ہے جو کہ معاشرے میں بے یقینی کی وجہ سے اس کے ذمہ دار
بن گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اساتذہ کا معیار بھی موجودہ تقاضوں سے ہم آہنگ
نہیں ہے۔ وہ استاد جو کہ آج کل کے تعلیمی اداروں میں پڑھتے ہیں۔ قابلیت کے
لحاظ سے دوسروں سے کسی حد تک کم ہیں۔ وہ طلبا کو مطمئن کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں
اس کے علاوہ اساتذہ اپنے پیشے سے مطمئن نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کو چند بنیادی
سہولتیں بھی حاصل نہیں۔ ان کے عدم اطمینان کا اثر طلباء پر پڑتا ہے۔ وہ استاد
کی نفسیاتی کیفیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبا میں بھی کسی حد تک قابلیت
کی کمی ہے وہ صرف پاس ہونے اور اچھے نمبروں کے خواہش مند نظر آتے ہیں اور چند
سوالوں کے جواب یاد کر کے وہ خود کو قابل سمجھنے لگتے ہیں۔ دراصل وہ قابلیت
کی اصل منزل سے بے خبر ہیں۔

موجودہ نظامِ امتحانات جدید تعلیمی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس سے
قابلیت کے امتحان کی بجائے صرف قوتِ حافظہ کو جانچا جا سکتا ہے۔ لڑکے اچھے
نمبروں کو حاصل کرنے کے لئے صرف چند اہم سوالات رٹ کر پاس ہو جاتے ہیں۔
ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت نہیں ہوتی۔ اساتذہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ طلباً
کو قابلیت کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً جانچتے رہیں اور اس کے لئے ان کا وقفوں
سے امتحان لینا اس مقصد کو پورا کر سکتا ہے۔

موجودہ تعلیمی پالیسی میں اساتذہ اور طلباء کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کوشش کی گئی ہے لیکن یہ کوشش شاید صرف کاغذوں تک ہی محدود رہے گی اور اس پر عمل کرنا بے حد مشکل ہوگا جب تک عمل نہ ہو بے معنی ہے۔ دوسرے مسائل کے علاوہ طلبا اور اساتذہ کے درمیان روحانی رشتے کو بھی حقیقی روپ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو کو قومی زبان کا درجہ دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے

کالجوں اور تعلیمی اداروں میں یونین کا قیام کس حد تک مسائل پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے اور مسائل کو حل کرنے کے لئے کسی قسم کے اقدامات کا ذکر نہیں آتا۔ طلباً اپنے ذہنوں کو چند لوگوں کے مفادات کے لئے وقف کر دیتے ہیں اور اس قسم کے ردعمل سے بے شمار مسائل جنم لیتے ہیں۔ بعض طلبا صرف وقت گذارنے کے لئے کالج آتے ہیں اور کالج کی رنگینیوں میں جہاں خود کھو جاتے ہیں۔ وہاں کئی دوسرے طلبا بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کا واحد اور مثبت حل صرف اور صرف کالج یونین کے قیام پر پابندی لگانا ہے۔

جعفر حسین زیدی

موجودہ دور میں پاکستان میں تعلیمی انحطاط موجود ہے۔ جس کی وجہ وہ پالیسی گائڈ لائن ہے۔ جو کہ اس میدان سے تعلق رکھنے والوں نے دی ہے۔ نظریات اور عمل میں تضاد ہے اور نظریات کو عملی شکل دینا ممکن نہیں رہا۔ پھر ایسے لوگ جو کہ پالیسی مرتب کرتے ہیں وہ باہر کے نظام سے متاثر ہیں اور اس کا اطلاق قلیل مدت میں اس ملک میں بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس وسائل کی کمی ہے۔ لہذا تعلیمی انحطاط کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کو مرکزیت دی جائے۔ اساتذہ

قابلیت سے زیادہ اہم ان کی توجہ اور انہماک ہے۔ اس طرح آپ کا نظام
نا قابل اطمینان نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بہتر ۱۹۴۹ء کا نظام تعلیم تھا جو آج کے
ضوں کو پورا کرسکتا ہے۔ اگر موجودہ نظام کو تسلی بخش بنانا ہے تو تعلیمی اداروں
باقاعدگی پیدا کرنا ہوگی۔ اردو کو ہمارے معاشرے میں اصل مقام نہیں دیا گیا۔
ی کئی ٹیکنیکل وجوہات ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ پاکستان کی نظریاتی اساس
راموش کر دیا ہے۔ ایک مسلم معاشرے کو تشکیل دینے کا مقصد ہم نے بھلا دیا ہے
رخوب سے خوب تر کی تلاش ہمارے پیش نظر نہیں رہی۔ موجودہ تعلیمی پالیسی
ے نزدیک بہت سی پالیسیوں کا مغلوبہ ہے مکمل پالیسی نہیں ہے۔ اس کے
اصول کو پورا کرنے کے لئے اساتذہ کی تربیت ضروری ہے۔

محمد اکرم

اساتذہ اپنے فرض کی بجا آوری کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں اور انشاءاللہ
ہیں گے۔ چنانچہ یہ سمجھنا کہ تعلیمی انحطاط اساتذہ کی وجہ سے ہے تو یہ ایک ناانصافی
گی۔ مسئلہ زندگی کو طرز پہ چلانے کا ہوتا ہے۔ انگریزی کے لفظ "LIVE" کی
ترتیب کو الٹ دیا جائے تو "EVIL" بن جاتا ہے۔ طالب علم کا فرض ہے کہ وہ
معنی تعلیم حاصل کرے۔ عام طور پر طالب علموں کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے۔ لیکن
ارے تعلیمی اداروں میں ہر سال کچھ ایسے طالب علم موجود رہتے ہیں جن کے محرکات
یاسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ غالب یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایسے طالب علم کی تعداد
ہوٹے کالجوں میں ۵ اور دس کے درمیان اور بڑے کالجوں میں ۳۰ اور ۵۰

کے درمیان ہوتی ہے۔ ان کا رجحان پیشہ ورانہ ہوتا ہے۔ عمر میں بھی ۔کیونکہ عام طلبا سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں اچھالتے رہتے ہیں ۔

ایسے لڑکے ہڑتال کرواتے رہتے ہیں۔ تعلیمی ماحول کو خراب کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کا حل یہ ہے کہ طلبا کی یونین کو کم از کم دو سال کے لئے BENED کر دینا چاہیئے۔ تاکہ اس قسم کے طلباء کالج سے نکل جائیں اور اس دوران میں وہ اپنے جونیئر طالب علموں کے خیالات کو بھی پراگندہ

نہیں کر سکیں گے یا کم از کم اس کا امکان کم تر ہو جائے گا ۔

اس کے علاوہ طلباء یونین کے انتخابات کے قواعد و ضوابط یکساں ہونے چاہئیں۔ اور جن لڑکوں کے پچھلے امتحان میں کم از کم سیکنڈ ڈویژن ہو اور سال میں ان کی حاضری کا تناسب ۸۰ فیصد ہو۔ صرف ان ہی کو انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت ہونی چاہیئے ۔

تعلیمی انحطاط کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ ہے مارکیٹ میں خلاصوں کی بھرمار ۔ ان کو فوری طور پر ختم کرنا چاہیئے ۔ یہ کہنا کہ اساتذہ بھی خلاصے استعمال کرتے ہیں ایک پروپیگنڈا ہے ۔

ہمارے پاس تقریباً طلبا تین سے ۵ گھنٹے رہتے ہیں۔ باقی وقت وہ گھر پر گذارتے ہیں۔ تعلیم دراصل ایک ذہنی رجحان کا نام ہے ۔ جب ذہنی تربیت نہ ہو جب تک ذہن مثبت اصولوں سے واقف نہ ہو تو تعلیم حاصل ہی نہیں کی جا سکتی۔ میں کہتا ہوں کہ طلباء خود دلچسپی نہیں لیتے۔ ورنہ اگر الگ مطالعہ ہو تو قابلیت بحال ہو سکتی ہے ۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ گھر میں بچوں کی ذہنی تربیت کریں تاکہ وہ کالجوں میں جائیں اور با معنی تعلیم حاصل کریں۔ تعلیم ایک سچائی کا نام ہے اکثر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ گھر میں مختلف مراحل پر والدین بچوں کو جھوٹ بولنے پر

۱

آمادہ کرتے ہیں۔ یقیناً وہ جب جھوٹ کے عادی ہوں گے تو تعلیم کیا خاک حاصل کریں گے۔

سوسائٹی اساتذہ کو عزت نہیں دیتی۔ جب بھی مادیت کسی سوسائٹی میں آتی ہے تو لوگ کسی کی ذات کی عزت نہیں کرتے بلکہ لیبل کی عزت کرتے ہیں۔ مثلاً کچھ عرصہ پہلے میں ایک پروفیسر تھا مگر اتنی عزت نہیں تھی جتنی اب ہے۔ اساتذہ کی کمی دور کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ عارضی تقرر ڈائریکٹوریٹ یا ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے نہیں ہونی چاہئیے بلکہ اس کا اختیار پرنسپل کو حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے کالج کے ماحول کے مطابق اساتذہ کا انتخاب کرے۔

جی ہاں یہ کس حد تک درست ہے کیونکہ ہمارے معاشرے میں اساتذہ کو صحیح مقام حاصل نہیں وہ بے چارہ غم روزگار میں الجھا رہتا ہے اور طلبا پر مکمل توجہ نہیں دے سکتا۔ اگر اساتذہ کے مسائل حل کر دیئے جائیں تو یہ شکایت دور ہو سکتی ہے۔

ناقص بالکل ناقص۔ امتحانوں کے کچھ نمبر اساتذہ کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں جس طرح سابق صدر ایوب خان کے زمانے میں ہوا تھا نیز امتحانات میں معروضی اور بیانیہ دونوں کا امتزاج ہونا چاہیئے۔ اور کلاس ٹیچر کے پاس کچھ نمبر ہونے چاہئیں اور بورڈ اور یونیورسٹی والے نتیجہ نکالتے وقت اس کا اندراج کریں۔ یہاں یہ اعتراض اٹھتا ہے کہ اساتذہ اپنی مرضی سے نمبر لگا دیں گے۔ اس کا حل یہ ہے کہ جب استاد کوئی ٹیسٹ لے تو پرچے جانچنے کے بعد طالب علموں کو دے دے اس طرح شک کی گنجائش نہ ہوگی۔

بالکل ناقص نظام تعلیم اس میں تھوڑی ترقی کی ضرورت ہے۔ سلیبس حد درجہ ناقص ہے۔ ہم بات کرتے ہیں ایک پاکستانی ہونے کی۔ ایک تہذیب و تمدن کی۔ لیکن ہمارے سلیبس اس سلسلہ میں کوئی مددگار ثابت نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر جب انگریزی پڑھائی جاتی تو کتابوں میں پاکستانی تہذیب و تمدن

کے بارے میں انتخاب ہونے چاہئیں۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو مجھے حکم دیں۔ ہمدانی صاحب کو حکم دیں ہم لکھیں گے۔ مگر افسوس اسطرف توجہ نہیں دی جاتی چنانچہ جو انگریزی شہروں میں پڑھائی جاتی ہے۔ وہ دیہاتوں میں نہ پڑھائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ طلبا اردو پڑھنا چاہتے ہیں اور خواہ مخواہ انگریزی سے گھبراتے ہیں۔ مگر میرے خیال میں اردو ہونی چاہیئے۔ کیونکہ یہ ہماری ثقافت ہے۔

دیہاتوں میں اگر انگریزی پڑھائی جائے تو اس میں بجائے فضول مضامین کے کھاد۔ فصل اور بیج بونے کے مختلف طریقے درج ہونے چاہیئں تاکہ اس سے کچھ معلومات میں اضافہ ہو۔

سید انوار احمد

ایک والد کی حیثیت سے کیا آپ موجود تعلیمی نظام سے پوری
طرح مطمئن ہیں ؟

پوری طرح تو نہیں مگر بڑی حد تک مطمئن ہوں۔ کیونکہ ہمارے
علیمی نظام سے وہ نتائج پوری طرح برآمد نہیں ہو رہے ہیں ۔ جن کی ہمیں ضرورت
ہے اور ہم سب توقع رکھتے ہیں۔ اس نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کی گنجائش تو ہر
دور میں رہے گی ۔ موجودہ نظام تعلیم اس نظام سے تو بدرجہ بہتر ہے جو غیر ملکی
قاؤں نے اپنے استعماری مقاصد کے حصول کے لئے رائج کیا تھا۔ گذشتہ
۳۲ برسوں میں ہم نے اس میں بڑی بنیادی تبدیلی کی ہے ۔ قیام پاکستان کے فوراً
بعد پہلی تعلیمی کانفرنس نومبر ۱۹۴۷ء میں منعقد ہوئی تھی ۔ اس موقع پر قائداعظم
نے کانفرنس کے نام اپنے پیغام میں واضح طور پر فرمایا تھا کہ ہمارا تعلیمی نظام
ہمارے قومی اور ملی مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہونا چاہیئے ۔

چنانچہ پہلے، دوسرے، تیسرے اور پانچویں پنجسالہ منصوبے نیز متعدد تعلیمی
پالیسیوں میں تعلیمی مقاصد کا از سر نو تعین کیا گیا اور انہی کے مطابق نظام تعلیم
کو نظریۂ پاکستان سے ہم آہنگ کیا گیا ۔ مجھے خاص طور پر اس بات سے بڑا اطمینان ہے
کہ تعلیمی نظام میں دینی اور فنی تعلیم کو فروغ دیا جا رہا ہے ۔

تعلیمی نظام میں والدین بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ کیا
آپ یہ کردار ادا کر رہے ہیں اور آپ کس حد تک اپنے بچوں
کی تعلیم میں دلچسپی لیتے ہیں ؟

یہ صحیح ہے کہ تعلیمی نظام میں والدین بھی اہم کردار ادا کرتے

ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں اپنے بچوں کی تعلیم میں پوری طرح دلچسپی لیتا ہوں
ان کی سرگرمیوں، دلچسپیوں اور مصروفیات پر برابر نظر رکھتا ہوں۔ جب کبھی موقع
ملتا ہے۔ ان سے نصاب کے متعلق پوچھتا ہوں۔ پڑھائی کے سلسلہ میں ان کی مدد کرتا
ہوں اور امتحانات کے موقع پہ ان کی رہنمائی کرتا ہوں۔

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیمی انحطاط کی ذمہ داری اساتذہ پر
عائد ہوتی ہے۔ جبکہ اساتذہ یہ الزام والدین پر عائد کرتے ہیں
آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے ؟

میں سمجھتا ہوں کہ تعلیمی انحطاط کے ذمہ دار والدین اور اساتذہ
دونوں ہی ہیں لیکن میرے خیال میں ذمہ داری کا بیشتر حصہ اساتذہ پر عائد ہوتا ہے
یہ صحیح ہے کہ طلبا اور طالبات کا زیادہ وقت والدین کے ساتھ گزرتا ہے لیکن وہ
بڑی حد تک اپنے اساتذہ کی سیرت سے بھی کافی متاثر ہوتے ہیں۔ اگر اساتذہ ایمانداری
خلوص اور لگن سے اپنی اس عظیم ذمہ داری کو پورا کریں تو تعلیم میں انحطاط واقع
نہیں ہو سکتا۔ والدین کی ذمہ داری زیادہ تر بچوں کی تربیت ہے۔ لیکن اساتذہ کی
دوہری ذمہ داری ہے یعنی تعلیم و تربیت دونوں۔ اساتذہ اور والدین ایک
دوسرے کو مورد الزام ٹھہرا کر اپنی اپنی ذمہ داریوں سے بچ نہیں سکتے۔ دونوں
کو اپنے فرائض پوری طرح سے انجام دینے چاہئیں۔ تاکہ تعلیمی انحطاط کے اسباب دور
ہوں۔

آپ ایک تعلیمی سال میں کتنی بار اپنے بچوں کے اساتذہ سے مل کر
بچوں کے تعلیمی معیار، حاضری وغیرہ کے بارے میں معلومات
حاصل کرتے ہیں ؟

میں اپنے سرکاری فرائض کی انجام دہی میں اتنا مصروف رہتا
ہوں کہ مجھے اساتذہ سے ملنے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن جب کبھی موقع ملتا ہے اساتذہ

سے ملتا ہوں اور ان سے بچوں کے متعلق معلومات حاصل کر لیتا ہوں۔ مجھے اساتذہ سے زیادہ ملنے کی یوں بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ میں اپنے بچوں کی تعلیمی مصروفیات سے مکمل طور پر باخبر رہتا ہوں۔ دفتر سے گھر واپس آ کر لازمی طور پر بچوں سے مل کر ان کی پڑھائی اور دیگر مشغولیات کے متعلق معلومات حاصل کرتا ہوں۔ ان کی پروگرس رپورٹ برابر دیکھتا ہوں اور اگر کسی مضمون میں کمی نظر آتی ہے تو اس کی طرف خاص توجہ دیتا ہوں۔

موجودہ تعلیمی رویہ، ماحول اور پالیسی کے بارے میں اگر آپ
مزید فرمانا چاہتے ہیں تو ہمارے صفحات حاضر ہیں؟

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے تعلیم کے زمانے کی نسبت موجودہ دور بہت بہتر ہے۔ طلبا اور طالبات کو بے شمار سہولتیں میسر ہیں جو ہمارے زمانہ میں نہیں تھیں۔ لیکن مجھے کسی حد تک یہ محسوس ہوتا ہے کہ طلبا میں اساتذہ کا ادب و لحاظ اس حد تک نہیں ہے۔ جتنا ہمارے زمانے میں تھا۔ ممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو کہ اساتذہ پوری تندہی اور دلچسپی سے اپنے فرائض انجام نہیں دیتے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اساتذہ کا شاگردوں کے ساتھ برتاؤ مشفقانہ نہیں۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ والدین اپنے بچوں کی تربیت سے کسی حد تک غفلت بھی برتتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کا ماحول بعض اوقات ناقابل برداشت حد تک پراگندہ ہو جاتا ہے۔ جہاں تک تعلیمی پالیسی کا تعلق ہے۔ اس میں میری نظر میں کوئی خرابی نہیں۔ اگر طلبا، اساتذہ اور والدین کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے اور وہ اپنے فرائض بحسن خوبی انجام دینے لگیں تو تعلیمی رویہ اور ماحول میں خوشگوار تبدیلی ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حنیف

والد کی حیثیت سے کیا آپ موجودہ تعلیمی نظام سے پوری طرح مطمئن ہیں؟

تعلیمی نظام بذات خود ایک نہایت وسیع عنوان ہے اور اس کے مختلف النوع پہلو ہیں۔ اس موضوع پر تو کوئی ماہر تعلیم ہی مفید یا بامقصد تبصرہ کر سکتا ہے۔ اپنے انداز فکر کی بناء پر مجھے موجودہ تعلیمی نظام میں کوئی سقم نظر نہیں آتا۔

تعلیمی نظام میں والدین اہم کردار کرتے ہیں۔ کیا آپ یہ کردار ادا کر رہے ہیں۔ آپ کس حد تک اپنے بچوں کی تعلیم میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

ہمارے ملک میں تعلیمی سہولتیں گو ہر گوشے اور سطح پہ نہیں پہنچ سکیں۔ لیکن تعلیم کی اہمیت کا احساس ہر خاص و عام اور مقابلتاً پسماندہ علاقوں میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ چنانچہ جو بچے بھی تعلیمی حصول میں کوشاں ہیں ان کے والدین بالعموم ان کی تعلیم میں بھرپور دلچسپی لیتے ہیں اور بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اکثر والدین کو اپنی اس دلچسپی کے صحیح اظہار اور اس کو متوازن طور پر بروئے کار لانے کا مکمل شعور نہ ہو۔ میں بھی حتیٰ المقدور اپنے بچوں کی تعلیم اور تربیت میں دلچسپی لیتا ہوں اور اس ضمن میں کسی کاوش اور کوشش سے گریز نہیں کرتا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اس حیثیت میں کوئی امتیازی پہلو نہیں ہے۔

عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیمی انحطاط کی ذمہ داری اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ جبکہ اساتذہ یہ الزام والدین پر عائد کرتے ہیں۔ اس بارے

میں آپ کی رائے کیا ہے ؟

میری دانست میں والدین اور اساتذہ کی ذمہ داریاں اپنے
اپنے دائرے میں محدود ہوتی ہیں اور لازم و ملزوم کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں
والدین اور اساتذہ دونوں کا فرض ہے کہ بچے کی زندگی کو صحیح خطوط پر استوار
کریں۔ اس ذمہ داری کو جزوی تصور کرنا۔ بالخصوص اساتذہ کے لئے مناسب
نہیں مگر کلیتاً نہیں لیکن مفروضے کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ والدین کی ذمہ داری
تربیت تک محدود ہے۔ جبکہ اساتذہ کی ذمہ داری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔
اور اس میں تعلیم اور تربیت دونوں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ہر بچے کو مثالی
والدین نصیب نہیں ہوتے۔ اس کی کمی کو پورا کرنا اساتذہ کا اخلاقی۔ روحانی
اور تعلیمی فرض ہے اور وہ اس کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ والدین کی طرف سے کمی
کا جواز ہو سکتا ہے۔ جو چند صورتوں میں جائز ہو۔ وسائل کی کمی۔ مقامی یا علاقائی
معاشرہ اور چند شدید حالات میں ہر قسم کی لاچاری اور محرومی۔ اگر ایسی حالت
میں اساتذہ اپنی ذمہ داری کو جزوی تصور کر کے اپنے مقدس فرض سے پہلوتہی
کرنے کو حق بجانب تصور کر لیں تو اکثر و بیشتر بچوں کے مستقبل کی تاریکی ایک
مسلمہ اور اٹل حقیقت کی حیثیت اختیار کرے گی۔

آپ ایک تعلیمی سال میں کتنی مرتبہ اپنے بچے کے تعلیمی معیار
اور حاضری کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔

میں کوشش کرتا ہوں کہ ہر ماہ اساتذہ سے مل کر اپنے بچے کی
ذہنی اخلاقی اور تعلیمی نشوونما کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہوں۔

ایک زمانہ تھا۔ جب کالجوں کی بزم ادب نے اقبال۔ فیض تاثیر اور پطرس جیسے بڑے فن کار پیدا کئے تھے۔ لیکن آج ان انجمنوں سے لمبے بالوں اور لمبی قلموں والے لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔ جو سڑکوں پر سائلنسر اتار کر موٹر سائیکلیں چلاتے اور زندگی کی ہر شئے کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ رکھتے ہیں۔

آپ کی نظر میں

الف۔ اس کی وجوہات کیا ہیں

ب۔ کیا کسی مخصوص طبقہ یا گروہ کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

آپ نے نہایت دلچسپ سوال اٹھایا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ "نیلام گھر" کے طارق عزیز کی طرح آپ نے بھی اپنے سوال میں ایک مخفی "گھنڈی" رکھ کر جواب فراہم کرنے والے کو غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ کیسے۔

آپ نے کہا ہے کہ ایک زمانے میں کالجوں کی بزم ادب سے اقبال تاثیر اور پطرس ایسے بڑے فنکار پیدا ہوتے تھے۔ لیکن اب لمبے بالوں اور لمبی قلموں والے لڑکے پیدا ہوتے ہیں وغیرہ اور پھر پوچھا ہے کہ اس کی وجوہ کیا ہیں؟ صاحب! آپ نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ اب کالجوں کی بزم ادب میں صرف لمبی قلموں والے ہی پیدا ہوتے ہیں اور بڑے فن کاروں کی آمد کا سلسلہ رک گیا ہے؟ مگر آپ تو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ ویسے عجیب بات یہ ہے کہ ہر زمانے میں معاصرین میں سے کوئی بڑا فنکار شاذ ہی نظر آتا ہے۔ قریب سے تو اپنا چہرہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ بڑے فن کاروں کے خدوخال صاف دکھائی دینے لگتے ہیں۔ کئی بار یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض فن کار جب پبلسٹی، مجلس آرائی یا منصوبہ بندی کے باعث

اپنے زمانے میں بے مثال شہرت حاصل کر چکے ہیں تو آنے والا زمانہ انہیں مسترد کر دیتا ہے۔ مثلاً تاثیر اور پطرس ہی کو لیجیے۔ ان میں سے تاثیر تو یقینی طور پر مسترد ہو چکا ہے اس کی ایک آدھ نظم کا شاذ کبھی ذکر ہو جائے تو ہو جائے ورنہ اس کے کسی مضمون کا اب شاذ ہی کبھی ذکر ہوتا ہے۔ رہے پطرس تو انہوں نے بے شک خالص مزاح کے بعض نہایت عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ لیکن کیا آپ کو پطرس کے ہاں وہ ارتقا دکھائی دیتا ہے جو بڑے فن کاروں کے ہاں عام طور سے نظر آتا ہے؟ مثلاً مزاح ہی کو لیجیے۔ پطرس کے ہاں نہ تو شاعرانہ مزاح پیدا ہو سکا نہ اس کے مزاح نے اتنی بڑی کائنات میں انسان کی مضحکہ خیز بے چارگی کا ادراک کیا۔ رہ گئے علامہ اقبال تو اقبال کا وجود کسی بزم ادب کا مرہون منت نہیں۔ اقبال ایسا عظیم فن کار تو کہیں صدیوں کے بعد جنم لیتا ہے اور اپنی آمد کے لئے پہلے سے کسی کالج کی "بزم ادب" کو وجود میں لانے کا اہتمام نہیں کرتا۔ لہٰذا آپ نے اپنے سوال کو جس مفروضہ پر قائم کیا ہے۔ وہی سرتا سر غلط ہے۔ آپ ان لمبے چوڑے لمبی قلموں والے سانولے منسر زادہ لڑکوں کی مثال نہ دیجیے۔ اس "جنس" کا تو پہلے کبھی ادب اور فن سے کوئی تعلق تھا نہ آئندہ کبھی ہوگا۔

ہر زمانے میں کالج کے لڑکوں پر یہی الزامات لگائے جاتے ہیں کہ وہ مروجہ اقدار کے پابند نہیں ہوتے۔ اگر کوئی طالب علم لمبے بال رکھتا ہے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ طالب علم کا ذہن صحیح سمت میں کام کر رہا ہو۔ چھوٹے یا لمبے بال ذہن پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

باقی رہا کالجوں کی بزم ادب کا کردار تو اقبال، فیض اور پطرس کبھی کبھار

پیدا ہوتے ہیں۔ عظیم ادیب اپنے ماحول زمانے اور معاشرے کی پیداوار ہوتا ہے۔
جہاں تک ہمارے معاشرے کا تعلق ہے۔ ہمارے طالب علم اس وقت برق رفتاری [illegible] کا شکار ہو رہے ہیں۔ ایسا زمانہ تاریخ میں شاید ہی گزرا ہو۔ تبدیلی تو تاریخ کا ایک لازمی جزو ہے۔ لیکن تبدیلی کی موجودہ رفتار پچھلے برسوں سے کہیں تیز ہے اگر ہمارا طالب علم آشفتہ سر اور آشفتہ تو ہے تو میں اسے موردِ الزام قرار نہیں دیتا۔

ہر زمانے میں اساتذہ اور والدین طلبا کو یہی طعنہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے میں بڑے نیک اور پارسا تھے۔ ہمیں ہمارے آباء و اجداد نے یہی کہا اور ہم اپنے طالب علموں کو یہی طعنہ دیتے ہیں۔ تبدیلی اور تیز رفتار زمانے کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ ۲۰ برسوں کی تبدیلی پچھلے کئی برسوں سے تیزی سے واقع ہوئی ہے۔ جب تک ہم اس بنیادی حقیقت کو نہیں سمجھتے ہم کسی بھی سماجی یا معاشرتی مسئلے کو حل نہیں کر سکتے۔

جب زمانہ تبدیل ہو رہا ہو تو ہر طبقہ یا گروہ جو معاشرہ کو ترقی کرنے سے روکے وہی دراصل سماجی الجھنیں پیدا کرتا ہے۔ مثلاً ہمارے ملک میں جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ۔ یہ لوگ زمانے کے بدلتے ہوئے تیور کو نہیں سمجھ رہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خلفشار پیدا کرنے سے شاید ٹال جائے۔ جو ان کے مقدر میں لکھی ہوئی ہے۔

جمیل ملک

آپ کا سوال دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ دراصل ہر دور کے اپنے اپنے تقاضے اور معیار ہوتے ہیں۔ معیار پسندی ہر دور کی مشترک روایت رہی ہے۔ لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں۔ ہر عہد کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس عہد کے معیار بھی بدل جاتے ہیں۔ معیار پسندی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آنے والے زمانے کے معیار

گزشتہ زمانے سے کمتر ہو جائیں۔ بلکہ ارتقائے انسانی کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر آنے والا زمانہ اپنے ساتھ بہتر معیار لے کر آئے۔ اگر آج تعلیمی اداروں میں اقبال پطرس تاثیر اور فیض پیدا نہیں ہو رہے تو مایوس ہونے کی بجائے اسے بھی اس تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے سیاست دانوں کے پیش نظر ہی نہیں، برصغیر کے مفکروں دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کے سامنے بھی ایک منزل تھی۔ جس کے خطوط سر سید سے اقبال اور اقبال سے ادب کی ترقی پسند تحریک اور جدید ادب کی تحریک تک واضح سے واضح تر ہوتے چلے گئے تھے۔ طریقہ ہائے کار میں جزوی اختلافات کے باوجود مشترکہ مقاصد اور حصول منزل کے لئے زندگی اور معاشرے کے تمام شعبے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے اور کبھی شعوری اور کبھی لاشعوری طور پر اپنی عملی جد و جہد میں ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ حصول منزل کے بعد یہ صورت حال غیر متوقع طور پر مختلف ہوتی چلی گئی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ سالہا سال کی جد و جہد کے بعد پاکستان کی صورت میں جس نئی منزل تک ہم پہنچ گئے تھے، وہاں دم لینے کی بجائے اپنا سفر جاری رکھتے اور پہلے سے زیادہ ذوق و شوق کے ساتھ مملکت پاکستان کے خدوخال سنوارنے میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے۔ لیکن ہوا یہ کہ ہم جیسے حصول منزل کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور کبھی حرکت میں آئے تو اپنی منفعت اور نفع اندوزی کے وسیلے تلاش کرنے لگے۔ اس رویے سے اگر ایک طرف اجتماعی مفادات کی قیمت پر ذاتی ترجیحات کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا تو دوسری طرف اس غالب رجحان کی دیکھا دیکھی ادیبوں اور شاعروں نے بھی دیدۂ بینائے قوم ہونے کی بجائے بڑی حد تک آہستہ آہستہ ذاتی منفعت و ترقی اور مصالحت و منافقت کا رویہ اختیار کر لیا۔ اس طریقۂ کار سے وہ ادب کی صحت مند تحریکوں کو آگے تو کیا بڑھاتے اقبال اور فیض کی فکر کو مہمیز تو کیا لگاتے ادیبوں اور شاعروں کی نئی نسلوں کو راستہ تو کیا دکھلاتے خود بھی راستے سے بھٹکتے چلے گئے۔

ظاہر ہے کہ جب پرانی نسلیں نئی نسلوں کو اپنا صحت مند ورثہ منتقل کرنے میں یوں ناکام رہیں کہ وہ نئی نسلوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے کے عمل سے روگردانی کرکے یا تو انہیں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کی دھن میں لگ گئیں۔ یا اپنی کلغی پر کوئی نہ کوئی طرہ سجا کر بیٹھ گئیں تو نئی نسلوں نے بھی ردعمل کے طور پر غیر متوازن انداز کا مظاہرہ کیا اور ایک طرف تو پرانی نسلوں کو ماننے سے صاف انکار کر دیا اور انہیں ریٹائر ہونے کا مشورہ دیا اور دوسری طرف علم و عمل کے ہر میدان میں بڑے غصیلے انداز میں لمبے بال اور داڑھیاں رکھ کر کھلے ساؤنڈ سروں کے ساتھ ساتھ اپنے بلند آہنگ لب و لہجہ کو بھی بروئے کار لا کر پرانی نسلوں سے بڑے جارحانہ انداز میں انتقام لینے کا مظاہرہ کیا۔ دراصل یہ مثبت اور رواں دواں انداز فکر سے کٹ جانے کا قدرتی ردعمل تھا اور شکست و ریخت کے اس عمل میں پرانی اور نئی ساری ہی نسلیں ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس ریزگی کا موجب کسی ایک فرد کو یا کسی ایک شعبۂ زندگی کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ سب کچھ ایک مخصوص نظام اقتدار کی حکمرانی کے سبب ہوا۔ جس کی بنیادوں کو صدیوں سے عوام کے استحصال اور ذاتی نفع اندوزی پر استوار کیا جاتا رہا ہے۔ مگر پچھلے چند سالوں سے صورت حال خاصی حوصلہ افزا ہے۔ اس عرصہ میں ملکی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر عوامی تحریکوں نے شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اس حیات افروز تجربے سے اب ہمارے ہاں علمی درسگاہوں میں بھی ادب و فن کے دبستانوں میں بھی اور زندگی کی دوسری جولانگاہوں میں بھی اپنی ریزہ ریزہ ذات کو اجتماعی تشخص میں سمیٹنے کا عمل جاری ہے اور نئی اور پرانی نسلوں کے درمیان افہام و تفہیم کی بنیادوں پر فاصلے مسلسل کم ہوتے جا رہے ہیں۔ جو ایک متوازن حال و مستقبل کے لئے خوش آئند علامت بن سکتے ہیں اور اس روایت کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ جو اقبال اور فیض تک آکر بڑی تیزی سے آگے نہیں بڑھ سکی

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

میں یہ محسوس ہوگا کہ یہ مسئلہ ہے STRESS اور اہمیت کا کہ کتنا زور کس نے کس چیز پر دیا۔ آج کل صرف طالب علموں کے ہی بال لمبے نہیں۔ بلکہ ان کے والدین اور اساتذہ کے بال بھی لمبے ہیں۔ اس لحاظ سے تو ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ والدین مادیت کے جنون میں مبتلا، ڈبل شفٹ میں معروف ہیں۔ استاد کے پاس کالج میں (۴۰) منٹ سے زیادہ طلباء کے لئے وقت نہیں۔ مجموعی طور پر طالب علم کا کالج میں درس و تدریس کا دورانیہ تین ساڑھے تین گھنٹے سے زیادہ نہیں تو ظاہر ہے کہ اس پر ماحول کا اثر زیادہ ہوگا۔ جہاں وہ باقی بیس۲۰ یا اکیس۲۱ گھنٹے گزارتا ہے۔

لیکن کالج کے ماحول کو طالب علم کے لئے پرکشش بنایا جا سکتا ہے اور ایسا چند برس پہلے تھا کہ کالجوں کا ماحول با معنی، نتیجہ خیز اور دلکشی کا حامل تھا۔ اسی وجہ سے یہ تعلیمی درس گاہیں لڑکوں کی شخصیت تبدیل کر سکتی تھیں۔ اس تبدیلی کو پیدا کرنے کے بہت سے وسائل موجود تھے۔ ہر مضمون کی SOCIETIES موجود تھیں۔ ٹیوٹوریل گروپ کا نظام موجود تھا۔ جہاں طلباء کو اپنی دلچسپیوں اور مشغلوں کے اظہار کا موقع ملتا۔ یونین کا انتخاب لڑنے والے ہر امیدوار کے لئے تقریری قابلیت لازمی ہوتی تھی۔ صرف وہی طلباء انتخابات میں حصہ لے سکتے تھے۔ جو تعلیمی میدان میں بھی کامیاب ہوں۔

اب کالجوں میں مشاعروں کا انعقاد، ادبی نشستوں کا اہتمام حتیٰ کہ ڈرامہ کا ہونا بھی خال خال رہ گیا ہے۔ ایسے میں طالب علم کی تہذیب یا فنی کا عمل رک جاتا ہے اور سیاسی سطح پر اس کی خریداری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں انانیت اور لڑائی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں وہ سیکھے گا بھی کیا؟

والدین کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے کہ ان کو فرصت نہیں کہ وہ پوچھ سکیں کہ برخوردار نور چشم آپ اسکول / کالج گیا بھی تھا بھی یا نہیں؟ سود ہیری ختم، تربیت مفقود، ور ماحول کی حرا [illegible]

کہ اس دور میں مغرب کی تہذیبی یلغار ریڈیو سے سینما اور ٹیلی ویژن کی سکرین پر دکھائی جانے والی فلموں میں موجود ہے ایسے میں ظاہر ہے نوجوان نے جنسی جرائم اور سکینڈل ہی کرانا ہے جو اس عمر کا فطری تقاضا ہے کہ ہر چھوٹی بات اور دھماکہ خیز حرکت ذہن کو متاثر کرتی ہے لیکن اگر طلباء میں بنیادی رہبری موجود ہو تو وہ خود ہی بہتر چیز چن سکتے ہیں ۔

آپ کے سوال کا اگر لغوی معنوں میں لیا جائے تو اقبال جیسی شخصیت کسی ایک محدود زمانے کی پیداوار نہیں ہوتی۔ اقبال جیسے لوگ روز روز کہاں؟ ہر عہد کی یہ تقدیر نہیں کہ اسے اقبال نصیب ہو۔

فیض، بخاری اور تاثیر کا جو معاملہ ہے تو ان کا مقابلہ پاکستان کے زمانے میں پیدا ہونے والی پود سے کرنا زیادتی ہے۔ جس نے ابھی صرف پون صدی دیکھی۔ جبکہ فیض و تاثیر کے فن کی عمر آج کے طالب علم کی عمر سے زیادہ ہے۔ انہیں وہاں پہنچنے میں وقت لگے گا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ایسی شخصیات نہیں پیدا ہو سکیں گی ۔

طنز و مزاح کی میں بات نہیں کرتا لیکن افسانہ اور خاص طور پر غزل میں آج کا نوجوان جس باریک بینی، تجزیاتی مطالعہ اور ماحول کے قریبی مشاہدے سے کام لے رہا ہے اس نے اسے نئی زبان دی ہے۔ یہ زبان آنے والے امکانات کے کشود کی دلیل بھی ہے۔ آج کی حیات کی علامت بھی؟

مگر یہ میں سوچتا ہوں کہ ادب بلاشبہ معاشرہ کی دانشورانہ حیات کی پہچان ہوتا ہے۔ مگر اہم مسئلہ یہ ہے کہ معاشرتی ارتقاء کا عمل شخص اور ذات کے عمل سے قدم ملا کر نہیں چل رہا۔ فرد اپنی ذات سے باہر کی ذمہ داریوں سے منکر ہے۔ یہ حال نوجوانوں کا بھی ہے اور یہی اخلاقیات کا دُہرا معیار نوجوان کے اندر ہیجان پیدا کرتا ہے۔ مگر آخر نوجوان کی اپنی بھی کوئی اخلاقیات ہیں۔ پھر اس کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں۔ یہ تجزیہ کہ کیا آج پاکستان کے طفیل ہم اپنے بزرگوں کی تمام اداس اور رنجیدہ نسلوں سے زیادہ آسودہ نہیں۔ اس بارے میں عمل کی بہت سی راہیں ہموار کر سکتا ہے۔

جواز

مسو سیدین کی اس خصوصی اشاعت میں اسلامی دور کی تعلیمی روایات کا سراغ پانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ ابتدائی اسلامی دور سے موجودہ عہد تک کا علمی تسلسل تلاش کیا جاسکے' لیکن مالی مجبوریاں ضخامت کے ضمن میں جگہ جگہ حائل ہوتی رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے بہت سے مرحلوں پر چھلانگ لگا کر اگلے مرحلہ پر آنا پڑا' تاہم کوشش کی گئی ہے کہ مرکزی تسلسل کو جھٹکا نہ لگے۔ تعلیم کے عصری مطالعہ کا پہلو بھی ذہن میں تھا' مگر دہی مجبوریوں کے بندھن' سو ادھورے خاکے پیش کرنے کی بجائے یہی مناسب خیال کیا گیا کہ اس اشاعت کو ایک ہی پہلو تک محدود رکھا جائے۔ حقیقتاً یہ ایک بڑا منصوبہ ہے جسے یونیورسٹی سطح پر مکمل ہونا چاہئے تھا۔ کالج کی سطح پر یہ ہمارے وسائل اور حوصلوں سے زیادہ بڑا کام ہے' بہرحال جو کچھ بھی ہو سکا وہ اپنی غلطیوں کے اعتراف کے ساتھ حاضر ہے۔

تشکر

سرسید نمبر کی اس خصوصی اشاعت کے سلسلہ میں ہم خصوصی طور پر ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن جناب بریگیڈیئر سید نصیر الدین اور ڈپٹی ڈائریکٹر جناب کرنل ایم۔ اے سلیمی کے ممنون ہیں کہ انہوں نے غیر معمولی مہربانی کے ساتھ اس اشاعت کے لئے مالی معاونت کی۔

ہم جناب میاں مسعود احمد (فضل ویجی ٹیبل انڈسٹریز، سابق صدر راولپنڈی چیمبرز آف کامرس) کے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے حسب روایت اس نمبر کی اشاعت میں ہماری بھرپور معاونت کی۔

سرسید نمبر کی اس خصوصی اشاعت کے کام کا آغاز ہوا تو اس مجلہ کے مدیر عرفان احمد عرفی تھے، انہوں نے اس شمارے کے لئے جو انتھک محنت کی اس کے لئے ادارہ ان کا شکر گزار ہے۔

(ادارہ)